ترغیباتِ جنسی

جس میں تاریخی، علمی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کے
میلانِ شہوانی پر ایک بسیط نظر ڈالی گئی ہے

از

نیاز فتحپوری

(جسے)

مینیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نے

شائع کیا

بارِ دوم ۱۰۰۰

مطبوعہ یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ سنہ ۱۳ء قیمت چار [illegible]

فہرست

تمہید

اس امر میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ انسان کا مطالعہ خود اپنی ذات سے شروع ہو کر دوسری چیزوں پر ختم ہونا چاہیے، یا دیگر اشیا سے شروع ہو کر اپنی ذات تک پہنچنا چاہیے۔ لیکن اس پر یقیناً سب متفق ہوں گے کہ انسان کے فرائض علمی میں ایک بڑا اہم فرض "مطالعہ ذات" بھی ہے۔ یہاں "ذات" سے فلسفہ یا تصوف کی "ذات خداوندی" مراد نہیں، بلکہ "ذات انسانی" مقصود ہے جس میں اس کے صفات، خواہشات یا "وظائف و کوائف" سب شامل ہیں۔

جہاں تک صرف زندگی یا سانس لینے کا تعلق ہے انسان اور حیوان مطلق میں کوئی فرق نہیں، لیکن جب وقت ہم انسان کے تمام کاروبار حیات پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی کیفیت اور بھی ایسی پائی جاتی ہے جو تمام حیوانات سے اس کو ممیز کرنے والی ہے اور یہی کیفیت

وہ ہے جس کا نام اہل علم نے "تعقل" رکھا ہے اور جس کو دوسرے الفاظ میں "غور و فکر" بھی کہہ سکتے ہیں۔

اگر کارگاہ حیات پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ عالم کی تمام رونق، دنیا کا سارا ہنگامہ منحصر ہے صرف انسانی خواہشات پہ جن کی تکمیل کے لیے وہ اپنی تمام جسمانی و دماغی قوتیں صرف کر دیتا ہے۔ وہ بھوکا ہوتا ہے تو حصول غذا کے لیے کوشش کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا، وہ سردی گرمی محسوس کرتا ہے تو اس کے دور کرنے کے لیے شب و روز محنت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور جب اسے پیاس معلوم ہوتی ہے تو پانی کے لیے وہ دیوانہ وار دوڑتا پھرتا ہے۔ منجملہ انھیں فطری خواہشات کے ایک خواہش وہ بھی ہے جو تعلق جنسی یا جذبۂ شہوانی سے وابستہ ہے اور اس کے لیے بھی تگ و دو کرنا اس کی عادت ہے۔ لیکن جس طرح فراہمی غذا کے سلسلہ میں انسان سد رمق یا نان جویں سے بڑھ کر قزعفر و بریانی پر بھی بس نہیں کرتا، حفاظت کے لیے کھدر سے گزر کر حریر و پرنیاں تک پہنچ جاتا ہے، تشنگی رفع کرنے کے سلسلہ میں سادہ پانی سے شراب انگور تک بڑھ جاتا ہے، اسی طرح وہ خواہش جنسی پورا کرنے میں ایک جائز حد سے گزر کر ان بدعتوں تک پہنچ جاتا ہے جو بڑی حد تک غیر فطری، غیر انسانی اور غیر تمدنی ہیں۔

انھیں بدعنوانیوں و بےاعتدالیوں کو روکنا "تعقل" کا کام ہے اور

اسی کا استعمال انسان کو دوسرے حیوانات سے ممیز کرتا ہے۔

پھر جس طرح انسان نے اپنی اور تمام خواہشات میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے تعقل کے ذریعہ سے متعدد علوم و فنون کی بنیاد ڈالی اسی طرح اس نے اپنی خواہش جنسی کو جائز حدود میں رکھنے کے لیے جنسیات (Sexology) کو پیدا کیا اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس علم کی اہمیت اور تمام علوم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے کیونکہ تمدن کا بڑا ہنگامہ اسی خواہش پر منحصر ہے اور اس کا تعلق اسی جنس سے ہے جو انسان کا بہترین نصف حصہ کہلاتی ہے اور دنیا کی تقریباً آدھی آبادی ہے۔

مغربی زبانوں میں اس فن پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ گزشتہ ربع صدی میں تو نہایت زیادہ انہماک کے ساتھ اس پر توجہ کی گئی اور غیر معمولی طور پر بہت زیادہ لٹریچر اس موضوع پر شائع ہوا لیکن مشرقی زبانوں اور خاص کر اردو میں کوئی قابل ذکر کتاب اس مسئلہ پر نہیں لکھی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ بعض کتابیں کوک شاستر کے اصول پر

ضرور مرتب کی گئیں لیکن ان کا مقصود بجائے اصلاح کے اور زیادہ ہیجان پیدا کرنا ہے اور ان سے صرف وہی ادنیٰ ذہنیت اور معمولی ذوق کے آدمی لطف اٹھا سکتے ہیں جو اس فن کے علمی پہلو کی جگہ محض عملی پہلو کو دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ عرصہ سے میرا خیال تھا کہ ایک بسیط تالیف اس موضوع پر پیش کروں اور لوگوں کو بتاؤں کہ اس مسئلہ کے کون کون سے پہلو غور کرنے کے قابل ہیں اور تاریخ و علم کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرنے سے کیا فائدے ہم کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

نیاز

فحاشی کی تعریف

قبل اس کے کہ اس موضوع پر گفتگو شروع کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فحاشی کا وہ مفہوم متعین کر دیا جائے جس کو سامنے رکھ کر آئندہ بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے موضوع کے لحاظ سے "فحاشی" نام ہے ہر اس طریق عمل کا جو قانون قدرت یا سوسائٹی کے مقرر کردہ اصول کے خلاف خواہش نفسانی پورا کرنے کے لیے اختیار کیا جائے اور اس میں وہ صورت بھی شامل ہو جس کا تعلق صرف کسب زر سے ہے اور جس کو عصمت فروشی کہہ سکتے ہیں۔

اہل مغرب نے فحاشی و عصمت فروشی کا مفہوم متعین کرنے میں بہت کاوش کی ہے اور مختلف لوگوں نے مختلف خیالات ظاہر کئے ہیں۔

رومی البیون (Roman Alpheon) اس کو صرف اس فرد نازک کے لیے مخصوص کرتا ہے جس کا مدعا محض کسب زر ہو۔ گیوت (Guyot) اس میں دونوں جنسوں کو شامل کرتا ہے لیکن کسب زر کی خواہش کو ضروری شرط قرار دیتا ہے۔

بونگر (Bonger) کسب زر کی خواہش کو ضروری قرار نہیں دیتا

صرف خواہشات نفسانی پورا کرنے کو اصل چیز قرار دیتا ہے۔ رچارڈ بھی وہی کہتا ہے جو گیوت کا نظریہ ہے اور لفظ عصمت فروشی میں دونوں جنسوں کو شامل کرتا ہے۔

ڈاکٹر بلاخ (Bloch) کہتے ہیں کہ ہر وہ مرد یا عورت "فحاش" کہلائے گی جو متعدد ہستیوں کو اپنے آپ سے لذت نفس حاصل کرنے کی اجازت دے، خواہ باہمد گر دلبستگی پائی جائے یا نہ پائی جائے۔ اس تعریف میں وہ اُجرت لینے کی شرط کو بھی ضروری نہیں سمجھتا۔

الغرض اہل مغرب نے فحاشی و عصمت فروشی کے حدود متعین کرنے میں عجیب و غریب نظریوں سے کام لیا ہے اور اس وقت تک وہ کوئی جامع و مانع تعریف اس کی نہیں بیان کر سکے لیکن ہم نے ابتدائی سطور میں ان تمام نظریوں سے ہٹ کر ایک علیحدہ نظریہ قائم کیا ہے اور اس تعریف کی بنا پر ہر قسم کی فحاشی اس میں داخل ہو جاتی ہے۔

فحاشی کی ابتدا اور اس کے اسباب جن لوگوں نے مسائل جنسی کی علمی تحقیق کی ہے، ان میں اس مسئلہ پر اختلاف پایا گیا ہے کہ آیا فحاشی (یعنی بغیر نکاح کے خواہش جنسی کو پورا کرنا) عہد وحشت کی یادگار ہے یا نہیں؟ بعض کا خیال ہے کہ عہد قدیم میں فحاشی کوئی عیب نہ سمجھی جاتی تھی اور بعض کہتے ہیں کہ عہد وحشت کا انسان فحاشی کی طرف مائل ہی نہ تھا اور جنسی تعلقات

صرف رشتۂ ازدواج کے ذریعہ سے پیدا کئے جاتے تھے۔

اس تحقیق کے سلسلہ میں جب دودھ پلانے والے جانوروں کی حالت پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر چند نر و مادہ ایک دوسرے کے پابند ہوتے ہیں لیکن یہ پابندی بہت تھوڑے زمانہ تک قائم رہتی ہے۔ بعض جانور ایسے ہیں جن کے نروں کو اپنے بچوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر مادہ ان کو الگ کر کے نکال دے تو وہ بچوں کو کھا جائیں۔ اس لیے اگر جانوروں کے حال پر قیاس کر کے عہد قدیم کے انسان پر حکم لگایا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ممکن ہے اس وقت مرد عورت میں کوئی خاص صورت تعلق جنسی کی ہوتی ہو، لیکن اس میں استحکام تو کسی طرح نہ ہوتا ہوگا اور ایک ہی فرد پر قانع رہنا مرد کا شعار نہ رہا ہوگا۔

وسٹر مارک کا خیال یہ ہے کہ قدیم انسان میں نکاح کا رواج عام طور سے پایا جاتا تھا، لیکن اس کی تین صورتیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک یہ کہ مرد کئی کئی بیویاں رکھتا تھا، دوسری یہ کہ عورت کئی کئی شوہر رکھتی تھی اور تیسری یہ کہ ایک عورت ایک ہی مرد کے لیے مخصوص ہوتی تھی مگر مجموعہ دنیا کے لیے۔

بہر حال اگر مرد عورت کے تعلق جنسی میں کوئی شائبہ اہلی زندگی یا خواہش اولاد کا پایا جا سکتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ نکاح یا بالفاظ دیگر پابندی کا خیال بھی اسی وقت انسان میں پیدا ہوا ہوگا جب اسے اہلی زندگی کی ضرورت محسوس ہوئی

ہو گی مگر اب اس کی تعیین دشوار ہے کہ یہ احساس انسان میں کب اور کن صورتوں میں پیدا ہوا۔ مسٹر واٹرمی ([illegible]) کا خیال ہے کہ جب تک انسان کو حصول غذا میں دشواریوں کا سامنا رہا اس کی خواہشات جنسی بھی دبی رہیں، لیکن جب سامان خورد و نوش کافی فراہم ہونے لگا تو اس کی بدمستیاں بھی بڑھ گئیں، چنانچہ آپ جنگلی جانوروں کو دیکھیے جب تک وہ جنگل میں رہتے ہیں اور غذا کی فکر سے آزاد نہیں ہوتے، صرف مخصوص زمانہ میں ان کے بچے پیدا ہوتے ہیں لیکن جب انھیں پال لیا جاتا ہے اور وہ فکر غذا سے آزاد ہو جاتے ہیں تو وہ بے فصل بھی ایک دوسرے سے ملتفت ہوتے نظر آتے ہیں۔ بہر حال تعلق جنسی کی طرف شدت میلان خواہ فارغ البالی کی وجہ سے ہوا ہو یا کسی اور سبب سے، دیکھنا یہ ہے کہ عہد قدیم میں رشتۂ ازدواج کی بنیاد کیونکر قائم ہوئی اور مختلف قوموں میں اس نے کیا مختلف صورتیں اختیار کیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہم کو شادی یا ازدواج کی تاریخ پر غور کرنا ہے۔

شادی | تمدن کے ارتقا پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ عہد قدیم میں انسان بالکل جنگلی جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا اور غذا کی تلاش میں ہر وقت اُسے سرگرداں رہنا پڑتا تھا، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ حلال و حرام کی کوئی تمیز قائم نہ ہوئی تھی، سوسائٹی کا کوئی ایسا اصول مرتب نہیں ہو سکتا تھا جسے نکاح سے موسوم کیا جائے اور یقیناً جانوروں ہی کی

طرح وہ ہیجانِ نفس کو بھی پورا کرتا ہو گا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب "اشتراک فی النسواں" کی بنیاد دنیا میں قائم ہوئی اور ایک عورت ہر اُس مرد کی ملکیت قرار پائی جس کو اس پر دسترس حاصل ہو جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے انسان کو اس وقت غور کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہو گی جب اس نے یہ دیکھا ہو گا کہ تعلق جنسی کا ایک نتیجہ اولاد کا پیدا ہونا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اول اول بچہ کی پرورش کا کام صرف عورت ہی کے سپرد ہوا ہو گا اور مرد کو مطلق اس طرف توجہ نہ ہوئی ہو گی اور غالباً یہی وہ چیز تھی جس نے آگے چل کر "نظامِ امہاتی" کی بنیاد ڈالی۔

نظامِ امہاتی "نظامِ امہاتی" سے مراد معاشرت کا وہ نظام ہے جس میں قوم کی ماؤں کو زیادہ اہمیت حاصل تھی بعض محققین کا خیال ہے کہ اوّل اوّل یہی نظام قائم تھا، چنانچہ اس کے ثبوت میں ڈاکٹر باجوفن (Bachofen) ایشیائے کوچک کی قوم لائسی ر (Lycians) کو پیش کرتے ہیں جس میں نظامِ امہاتی کا رواج پایا جاتا تھا اور اس کی تصدیق ہیروڈوٹس کے بیان سے بھی ہوتی ہے جس نے لکھا ہے کہ اس قوم میں بچہ کا نام ماں کے نام پر رکھا جاتا تھا اور سوسائٹی میں جو قدر و منزلت ماں کی ہوتی تھی وہی بچہ کی ہوا کرتی تھی۔

جزیرہ سماترا میں اب بھی یہی نظام رائج ہے یعنی شادی کے بعد شوہر اپنی بیوی کے گھر جا کر رہنے لگتا ہے اور اس کے تمام مصارف [illegible]

کرتے ہیں۔ اس قسم کی شادی کو یہاں امبیل ناک (Ambil Anak) کہتے ہیں۔ ہندوستان میں "گھر داماد" کا رواج بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔

مطالعہ بائیبل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یعقوبؑ نے اپنی بیوی کے خاطر اپنے خسر لابن کے پاس رہ کر ۱۴ سال تک مویشی چرانے کی خدمت انجام دی اور اسی طرح موسیٰؑ اپنی بیوی صفورہ کی وجہ سے اپنی سسرال میں رہے۔ اگر یہ خدمت عورت کی قیمت نہ تصور کی جائے تو اس کو بھی نظام امہاتی کی چیز ماننا پڑے گا۔ لیکن اگر نظام امہاتی کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے تو اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کا قیام بہت کم رہا اور سوائے چند مخصوص قوموں کے کہیں اور رائج نہ ہو سکا۔ البتہ نظام بطریقی (Patriarchate) نے بہت زیادہ وسعت حاصل کی اور آج تک اسی کے اثرات تمام دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

نظام بطریقی | چونکہ انسان قدیم صرف گلہ بانی کرتا تھا اس لیے جس قبیلہ میں مویشیوں کی کثرت ہوتی تھی اُسے متمول خیال کیا جاتا تھا پھر چونکہ کثیر التعداد مویشیوں کے لیے وسیع سبزہ زاروں اور چراگاہوں کی ضرورت ہوتی تھی، اس لیے رفتہ رفتہ قبائل میں باہمد گر اس پر جھگڑا ہوتا تھا اور یہ نزاع مسلسل جنگ کی صورت اختیار کر لیا کرتی تھی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ فریق غالب مغلوب قبیلہ کی بستیوں پر تاخت کرتا، مال و مویشی اور عورتیں بچے سب پر قبضہ کر کے اپنے ساتھ لے جاتا اور

یہی ابتدا نظام بطریقی کی تھی۔

جو عورتیں بحیثیت اسیران جنگ، فاتحین کے حصہ میں آتی تھیں وہ مردوں کا "مال" متصور ہوتی تھیں اور ذلیل سمجھی جاتی تھیں۔ پھر اس کے بعد جو جو زمانہ گزرتا گیا، گھر کی بیویاں اور بیٹیاں بھی "مال" سمجھی جانے لگیں اور اس طرح عورت کی حکومت یا مالکانہ حیثیت غائب ہو کر مردوں کی حکومت و ملکیت قائم ہو گئی۔ علاوہ ازیں چونکہ میدان جنگ اور مال و متاع کی حفاظت کے لیے مردوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لیے اولاد نرینہ کو فوقیت دی گئی اور لڑکیاں ذلیل سمجھی جانے لگیں۔ ترکہ سے محروم کی گئیں اور بعض بعض قوموں میں ان کو قتل کر دینے کا رواج قائم ہو گیا۔

گرفتاری عروس دختر کشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل میں عورتوں کی کمی ہونے لگی۔ لیکن چونکہ سرداران قبائل کا فرض تھا کہ وہ اپنی نسل کو نہ صرف باقی رکھیں بلکہ ترقی دیں، لہذا وہ کسی ہمسایہ قبیلہ کو جو نسبتاً کمزور ہوتا تاک لیتے بعد ازاں ایک مہم مرتب کر کے بے خبری میں اُس کمزور قبیلہ پر جا پڑتے، انکی جوان بہو بیٹیاں چھین لاتے اور اپنے قبیلہ کے نوجوانوں سے ان کی شادیاں کر دیتے۔ یہ شادی گویا بذریعہ گرفتاری ہوتی تھی۔ اس قسم کا رواج ترکستان کے ازبکوں، ترکمانوں، قرغیزوں اور قلماقوں میں اب تک موجود ہے۔ اگرچہ اب جنگ تو نہیں ہوتی لیکن برات کی صورت بالکل جنگی مہم جیسی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بھی گوجر

قوم کی برات جب "چڑھتی" ہے تو تمام براتی گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ آگے آگے ایک شخص گھوڑے پر سوار نقارہ پر چوب مارتا چلتا ہے۔ تمام برات اسی وضع سے دلہن کے گھر پہنچتی ہے اور اسے بیاہ لاتی ہے۔ اس رواج میں بھی "عسکریت" موجود ہے۔ بعض قوموں میں دولہا اپنی گود میں دولہن کو اٹھا کر محافہ میں سوار کراتا ہے۔ گویا وہ اپنی دلہن کو "بقوت بازو" چھین لایا ہے۔ بعض اقوام میں جب برات دلہن کے گھر پہنچتی ہے تو دلہن کے طرفدار برات کو روکتے ہیں یہ گویا "مزاحمت" ہے اور اسی زمانہ کی یادگار چلی آتی ہے جب دلہن کو بذریعہ تاخت گرفتار کرکے لایا جاتا تھا۔ بنی اسرائیل میں بھی یہ رواج موجود تھا ملاحظہ ہو صحیفہ قاضیون باب ۲۱ آیتہ ۱۰ لغایتہ ۲۲ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"تب انھوں نے بارہ ہزار بہادر مرد روانہ کیے اور انھیں حکم دیا کہ یبیس جلعاد کے باشندوں کو جا کر قتل کریں، تمام ان عورتوں کو جو مردوں سے ہمبستر ہو چکی ہوں ہلاک کریں پس انھوں نے یبیس جلعاد میں چار سو کنواری عورتیں پائیں جو مرد سے ناواقف تھیں اور وہ انھیں سرزمین کنعان میں سیلا کے بیچ لشکر میں لے آئے پھر انھوں نے بنی بنیامین کو طلب کیا اور ان عورتوں کی ان سے شادیاں کر دیں لیکن وہ ان کو کافی نہ ہوئیں تب جماعت کے لوگ بولے کہ جو مرد بیچ رہے ہیں ان کے لیے بھی بیویوں کی فکر کی جائے

تاکہ بنی اسرائیل کا ایک فرقہ نابود نہ ہو جائے مگر لوگوں نے کہا کہ ہم نے قسم کھائی ہے کہ بنی بنیامین کو اپنی بیٹیاں ہرگز نہ دیں گے تب انھوں نے یہ مشورہ کیا کہ سیلا میں اس جگہ جو جانب شمال بیت ایل کی سڑک پر واقع ہے وہاں کے لوگ ہر سال خداوند کی عید مناتے ہیں۔ پس بنی بنیامین جائیں اور تاکستانوں میں چھپ کر گھات میں رہیں۔ جب سیلا کی بیٹیاں رقص و چنگ لیکر ناچتی ہوئی نکلیں تو کمین گاہوں سے نکل کر ہر شخص اپنے لیے ایک لڑکی گرفتار کر لے اور اپنے ملک کو چلا جائے۔ الغرض بنی بنیامین نے ایسا ہی کیا اور اپنے لیے ایک ایک بیوی پکڑ لے گئے۔"

یہی کارروائی زمانۂ قدیم میں رومیوں نے کی تھی جب انھیں بیویوں کی ضرورت پڑی تھی۔ رومیولس نے صابین (Salinae) لوگوں اور قرب جوار کے شہروں اور قصبوں کے باشندوں کو عام تماشہ دیکھنے کے لیے مدعو کیا اور جب اطراف و جوانب کے مرد و زن جمع ہوئے تو رومیوں نے چھاپہ مارا اور جس قدر عورتیں شادی کے قابل ان کے ہاتھ لگیں پکڑ لے گئے (ملاحظہ ہو تاریخ روم مصنفہ لڈل صاحب صفحہ ۲۰ (P. 20) (Liddell's History of Rome)

بعض وحشی قوموں میں بیوی کا لانا اور بھی زیادہ سخت کام ہے۔ دولہا جھپٹ کر خسر کے گھر میں گھس جاتا ہے اور دولھن کے سر میں ایک ایسی سخت ضرب لگاتا ہے

کہ بیچاری بیہوش ہو کر گر جاتی ہے۔ بعد ازاں وہ لڑکی کو اسی طرح بعالم بیہوشی اٹھا کر کندھے پر لاد کر بھاگ جاتا ہے۔ سسرال والے اس کا تعاقب کرتے اور اینٹ پتھر مارتے ہیں اور اگر پکڑا جاتا ہے تو ڈنڈوں سے بھی خبر لیتے ہیں۔ الغرض دولھا کو لیے لازم ہے کہ وہ جس قدر طاقتور اور جس قدر چست چالاک ہو اُسی قدر تیزی کے ساتھ دلھن کو لیکر فرار ہو جائے۔ یہ گویا رسم شادی ہے اور اس زمانہ کی یادگار ہے جب سچ مچ جنگ کر کے بیویاں حاصل کی جاتی تھیں۔

خریداری عروس

جب ارتقائے تہذیب تمدن کے ساتھ انسان کی چوپانی اور خانہ بدوشی، زراعت و عمرانیت میں تبدیل ہوئی تو اسی کے ساتھ ساتھ عسکریت بھی ضعیف ہونے لگی اور بعد کو مستقل بستیاں بس گئیں، حکومتیں قائم ہوئیں سماج کے تحفظ کے لیے آئین و قوانین وضع ہونے لگے اور دوسروں کی لڑکیاں چھین لانے کا دستور بند ہو گیا۔ اب شادی کی دو صورتیں رہ گئی تھیں یا تو دلھن کو بہ رضامندی اس کے والدین سے حاصل کیا جائے یا اسے دولت کے عوض خریدا جائے۔ دولتمندوں میں تو بغیر معاوضہ کے باہمدگر رشتہ ازدواج آسان تھا لیکن عوام میں طریق ازدواج نے یہ صورت اختیار کر لی کہ لڑکی اس کے والدین سے مال دے کر خرید لے جاتی، یا لڑکا والا داماد سے مدت معینہ تک کوئی خدمت لیتا رہتا۔ ہندوستان میں اب بھی روپیہ لے کر ماں باپ کا اپنی نوعمر لڑکیوں کو ضعیف آدمیوں سے بیاہ دینا دیکھا جاتا ہے۔ افریقہ میں بیویاں مویشیوں کے عوض خریدی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے جاٹوں میں بعض مقامات

میں لکھا گیا ہے کہ جو عورت کھیت میں جا کر اپنے ہاتھ سے دو من چارہ کاٹ کر سر پر لاد لائے اور پھر چارہ کاٹ کر بھینسوں کو کھلا دے اس کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہوتی ہے۔ خواہ وہ خوبصورت ہو یا بدصورت۔

بیان کیا جاتا ہے کہ افغانستان میں بھی لڑکی کے عوض روپیہ لیا جاتا ہے جسے وہ اپنی اصطلاح میں "حق شیر مادر" کہتے ہیں۔ لیکن بنگالیوں میں یہ دستور اُلٹا ہے۔ یہاں لڑکا اپنے خسر سے اپنی قابلیت اور حیثیت کے لحاظ سے روپیہ وصول کرتا ہے۔ اسی مذموم رواج کا نتیجہ ہے کہ بہت سی بنگالی لڑکیاں جن کے والدین مفلس ہوتے ہیں مایوس ہو کر خودکشی کر لیتی ہیں۔ کوہستان شملہ میں اب بھی اس قسم کی زن فروشی کا میلہ ہر سال منعقد ہوتا ہے۔

بعض وحشی اقوام میں عورتیں اس لیے خریدی جاتی ہیں کہ وہ اپنے آقا کی خدمت کریں۔ فرائض زوجیت بالکل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن لوگوں میں تعدد ازدواج کا دستور ہے ان کی نسبت یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کی کنیزیں ان کی بیویاں ہیں۔ نہ یہ کہ ان کی بیویاں ان کی کنیزیں ہیں۔ کیونکہ وہ لونڈیوں کی طرح خریدی جاتی ہیں اور لونڈیوں کی طرح کام کرتی ہیں۔

کناڈا میں نئی دلھن کے حجرہ میں ایک دیگچی، ایک تسمہ اور گٹھا لکڑیوں کا رکھ دیا جاتا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ آئندہ سے دلھن کا فرض یہ ہوگا کہ کھانا پکائے بوجھ اٹھائے اور شوہر کیلئے جنگل سے لکڑیاں لائے۔

ممالک چونکس میں عورتیں ہی زمین میں کھاد ڈالتی ہیں اور ملک چین کے بعض حصص میں عورتیں ہل بھی چلاتی ہیں۔ ہندوستان میں عورتیں کھیتی باڑی کا کام کرتی ہیں۔ مراکش اور شمالی افریقہ کے اکثر حصص میں بیوی ہی زمین کھودتی، بیج بوتی اور فصل کاٹتی ہے۔ عرب کی عورتیں اپنے شوہروں کے گھوڑوں کی خدمت کرتی ہیں، سواری کے وقت اس پر ساز لگاتی ہیں اور گھر کا تمام کام کرتی ہیں۔

کلیسا نے بھی عورت کو مرد کا غلام رکھا، چنانچہ انگریزی قانون میں بیوی اپنے شوہر کا مال متصور ہوتی تھی اور نکاح کے بعد اس کو اپنے اوپر کوئی اختیار حاصل نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ اس کی ذاتی جائداد بھی شوہر کی ملکیت ہو جاتی تھی۔

نکاح دھرم شاستر میں | ہندوؤں میں دھرم شاستر کی رو سے بیاہ کی آٹھ قسمیں ہیں:۔ (۱) برہم بواہ (۲) دیو بواہ (۳) ارشا بواہ (۴) پرجاپتی بواہ (۵) اسر بواہ (۶) گندھرب بواہ (۷) راکشس بواہ (۸) پیشاچ بواہ۔

منوسمرتی میں لکھا ہے کہ نکاح کے یہ آٹھوں طریقے جائز ہیں۔ لیکن اول چار قسمیں برہمنوں کے لیے ہیں اور چھ قسمیں چھتریوں کے لیے مناسب ہیں۔ راجہ اگر چاہے تو راکشس بواہ بھی کر سکتا ہے۔ اسر بواہ صرف ویش اور شودر اقوام کے لیے ٹھیک ہے۔

ان آٹھ قسموں میں تقریباً ہر قسم کی شادی آ جاتی ہے، ذیل میں ان کی

اجمالی کیفیت درج کی جاتی ہے۔

(۱) برہم بواہ :- وہ طریقۂ ازدواج ہے جو ہندوؤں میں عام طور پر رائج ہے یعنی لڑکی والے اپنی بیٹی کے لیے مناسب بر تلاش کر لیتے ہیں اور تمام باتیں طے ہونے کے بعد دھوم دھام سے شادی کر دیتے ہیں۔

(۲) دیو بواہ :- اس میں لڑکی کی شادی کسی دیوتا سے کر دی جاتی ہے اور وہ لڑکی اسی دیوتا کے مندر میں زندگی کے دن گذارتی ہے۔ ایسی لڑکیوں کو دیو داسیاں یا مرلیاں کہتے ہیں۔ یورپ میں بھی کلیسا کی کنواریاں (Nuns) ہوتی ہیں جو فرضی طور پر یسوع کی بیویاں متصور ہوتی ہیں اور تمام عمر پاکدامنی کے ساتھ بسر کر دیتی ہیں۔

(۳) ارشا بواہ :- یہ در حقیقت رشیوں کا طریقۂ ازدواج ہے۔ ان مرتاض اور تارک الدنیا لوگوں کے پاس لینے دینے کو کچھ ہوتا نہیں۔ لوگ ان کو مقدس بزرگ سمجھ کر لڑکی حوالہ کر دیتے ہیں۔ اسی اصطلاح میں "کینیا دان" کہتے ہیں۔

(۴) پرجاپتی بواہ :- اس میں لڑکا اور لڑکی خاص اہتمام کے ساتھ شادی کرتے ہیں، ذات برادری کا کافی خیال رکھا جاتا ہے۔ لڑکی والے برادری کو کھانا کھلا کر اور لڑکی کو حتی الامکان معقول جہیز دے کر رخصت کر دیتے ہیں۔

(۵) اسر بواہ :- ادنیٰ درجہ کا بیاہ ہے۔ کیونکہ اس میں کسی قدر خرید و فروخت کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اسی لیے اسی ذلیل سمجھا گیا ہے۔

(۶) گندھرب بواہ:۔ مرد و عورت اگر بالغ اور آزاد ہوں اور بطیب خاطر دونوں ایک دوسرے کو قبول کر لیں خواہ کوئی گواہ موجود ہو یا نہ ہو تو اسے گندھرب بواہ کہتے ہیں۔ کالی داس کی مشہور و معروف ناٹک میں شکنتلا اور راجہ وسینت کی شادی جنگل میں اسی طرح ہوئی تھی۔

(۷) راکشش بواہ:۔ اگر کسی شخص کی لڑکی کو جبراً بھگا لیا جائے اور پھر اس سے شادی کی جائے تو اسے راکشش بواہ کہتے ہیں۔ اس قسم کی شادیوں کا نتیجہ عموماً خراب نکلتا ہے اور فریقین میں کشت و خون تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس قسم کی شادیوں نے اکثر سلطنتوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے مثلاً راجہ پرتھوی راج والی دہلی و اجمیر نے راجہ جے چند والی قنوج کی لڑکی کو عین "سوامبر" سے بھگایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں سلطنتیں غارت ہو گئیں۔ حسب روایت رامائن راون نے بھی سیتا جی کو لیجا کر اپنی سلطنت کو برباد کر دیا اسی طرح بائبل کی وہ روایت ہے جس میں امیر حوی حمور کے لڑکے سکم نے یعقوب کی بیٹی دینہ کو بھگایا اور اسکے باعث اسکی تمام قوم قتل ہوئی۔

(۸) پشاچ بواہ:۔ یعنی کسی لڑکی کو شراب پلا کر، یا دوا دے کے بیہوشی دے کر یا بحالت خواب اس سے اختلاط کیا جائے۔ اس تعلق کو دھرم شاستر میں نہایت ذلیل خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں عورت مردہ کی طرح بے حس ہوتی ہے۔ اس قسم کا تعلق زناشوئی ہر ملک و قوم کی سوسائٹی میں مذموم

خیال کیا جاتا ہے اور قانوناً جرم ہے۔ بائبل میں بھی اس قسم کے قصے موجود ہیں۔

شادی کی اور صورتیں

ارتقائے تمدن کے ساتھ جب انسان نے عورت کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا تو لڑکیوں کو ایک حد تک انتخاب شوہر کی آزادی بھی دی جانے لگی۔

ہندوستان کے راجاؤں میں یہ دستور تھا کہ جب ان کی بیٹی جوان ہو جاتی تھی تو وہ کسی خاص شوہر کی تلاش نہیں کرتے تھے بلکہ برہمنوں اور پنڈتوں سے مہورت لے کر شادی کے لیے ایک خاص دن مقرر کر دیتے تھے، کچھ زمانہ قبل اس تاریخ کی اطلاع ملک کے تمام راجاؤں اور راجکماروں کو دیدی جاتی تھی۔ تاریخ مقررہ پر جب تمام مہمان جمع ہو جاتے تھے تو ایک جلسہ کیا جاتا تھا، جہاں کوئی شرط پیش کی جاتی تھی اور جو شریف النسب شخص اس شرط کو پورا کر دیتا تھا، اسی کے گلے میں وہ لڑکی اپنی رضامندی کا ہار ڈال دیتی تھی اس تقریب کو "سوامبر" یعنی (جلسۂ انتخاب شوہر) کہتے تھے۔

ہندوستان میں سوامبر کے تین واقعات خاص تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۱) مہابھارت کا سوامبر جو راجہ درو پد نے اپنی بیٹی دروپدی کے لیے منعقد کیا تھا اور جس میں تیر اندازی کی نہایت مشکل شرط رکھی گئی تھی۔ اس شرط کو حاضرین جلسہ میں سے کوئی پورا نہ کر سکا لیکن ارجن نے جو اس وقت فقیروں کے بھیس میں تھا اس شرط کو پورا کر کے دلھن کو جیت لیا تھا۔

(۲) راماین کا سوامبر جس میں راجہ جنک نے اپنی بیٹی جانکی عرف

سیتاجی کی شادی کے لیے ہمعصر راجاؤں اور شہزادوں کو مدعو کیا تھا اس میں شرط یہ رکھی گئی تھی کہ جو شخص شب جی کی دھنش (کمان) کو زہ کر دیگا وہی لڑکی کا شوہر منتخب ہوگا، دیگر امراء ادا نے شرط سے قاصر رہے لیکن رامچندر جی نے اپنی قوت بازو سے اس کمان کو نہ صرف زہ کیا بلکہ توڑ دیا اور جانکی جی کو جیت لائے۔

(۳) تیسرا تاریخی سوامبر راجہ جے چند والی قنوج کی بیٹی کا ہے جسمیں لڑکی کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جلسہ میں شریک ہونے والے امراء میں سے جس کو چاہے منتخب کر کے اس کے گلے میں ہار ڈال دے۔ اس جلسہ میں والی قنوج نے اپنے حریف راجہ پرتھوی راج والی دہلی و اجمیر کو مدعو نہیں کیا تھا جو منتخب جانباز راجپوتوں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ پوشیدہ طور پر جلسہ میں پہنچا اور لڑکی کو اٹھا لایا۔

اسی قسم کا رواج ایران قدیم میں بھی تھا۔ بڑے بڑے گھرانوں میں جب لڑکیاں جوان ہو جاتی تھیں تو ہم کفو نوجوانوں کو مدعو کر کے لڑکی کو انتخاب شوہر کا موقع دیا جاتا تھا۔ اس طریق کار کو اصطلاح میں "جشن شوہر گیراں" کہتے تھے ان واقعات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج صرف ان اقوام میں پایا جاتا تھا۔ جنھیں یورپ کی اصطلاح میں انڈوایرانین (Indo Iranian) یعنی "ہندی ایرانی آریا" کہتے ہیں۔

بعض اقوام میں عارضی شادی کا بھی رواج ہے یعنی زن و مرد ایک مدت کے لیے عہد و پیمان کر لیتے ہیں۔ اگر اس دوران میں عورت موافق مزاج کے

ثابت ہوئی تو مستقل نکاح کر لیا جاتا ہے ورنہ فریقین میں مفارقت ہو جاتی ہے۔

داشتہ عورتیں جزائر غرب الہند کے جزیرہ ہائٹی (Hanti) میں دو قسم کی بیویاں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کا نکاح باضابطہ قوانین کلیسا کے ماتحت ہوتا ہے اور دوسری وہ جو بغیر رشتۂ ازدواج محض رضامندی کے اصول پہ گھروں میں ڈال لی جاتی ہیں۔ ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر کا نکاح مقررہ طریقہ پہ ہوتا ہے لیکن موخر الذکر کے لیے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں ہے نکاح تو صرف عدالت ہی میں منسوخ ہو سکتا ہے لیکن دوسری قسم کا تعلق صرف ۲۴ گھنٹے کی نوٹس پر ختم ہو سکتا ہے۔

وہاں یہ دونوں تعلقات احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں بلکہ دوسرے طریقہ کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے اور اس طرح جو اولاد پیدا ہوتی ہے اس کے وہی حقوق ہیں جو منکوحہ کی اولاد کے ہوتے ہیں۔

یورپ میں بھی یہ رواج بکثرت پایا جاتا تھا۔ قدیم ویلز اور قدیم جرمنیا ایسی عورت کو ذلیل نہیں سمجھا جاتا تھا اور منکوحہ بیوی بھی اس کو گوارا کر لیتی تھی۔ ڈیوفورڈ (Deuforal) نے لکھا ہے کہ شہنشاہ شارلمین کے زمانہ میں لفظ (Concubine) (داشتہ یا حرم) معزز لفظ خیال کیا جاتا تھا اور ایسی عورتوں کا درجہ بیویوں کے برابر سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ اگر وہ کبھی فحش کی مرتکب ہوتیں تو انھیں وہی سزائیں دی جاتیں جو منکوحہ عورتوں کیلیے مقرر تھیں۔

ممالک مشرق میں حرموں اور کنیزوں کی طرف جس قدر توجہ کی گئی اس سے تاریخ کے صفحات لبریز ہیں۔

شادی کی انگوٹھی اگرچہ قدیم اہل روم میں عورتوں کی کافی عزت و تعظیم کی جاتی تھی، لیکن قدیم جرمنوں نے جو فطرتاً نہایت جنگجو واقع ہوئے تھے بیوی کو کبھی گھر کی لونڈی سے زیادہ نہ سمجھا اور "خریداری عروس" ہی کے طریقہ کو وسعت دی اور اس طرح سارے یورپ میں "عروس فروشی" کا رواج عام طور پر پھیل گیا پہلے تو بطور بیعانہ کچھ نقد رقم وصول کر لی جاتی تھی لیکن جب سوسائٹی اس بات کو معیوب خیال کرنے لگی تو بجائے رقم بیعانہ کے دلھن کو ایک بیش قیمت انگوٹھی پیش کی جانے لگی۔ اس کو جرمن اصطلاح میں "ارھا" (Arrha) کہتے تھے جس کے معنی ہیں "شادی کا بیعانہ"۔

قرون وسطیٰ میں اس رسم کے ساتھ اور رسمیں شامل کر کے دلھن کو بالکل کنیز کی حیثیت دے دی گئی۔

مثلاً انگلستان میں دستور تھا کہ جب دولھا دلھن کے سامنے انگوٹھی پیش کرے تو وہ بہن کر شوہر کے قدموں میں گر جائے۔ روس میں بھی دلھن اپنے شوہر کے پاؤں چوما کرتی تھی۔ پھر بعد کو اس رسم میں کچھ تبدیلی کر دی گئی یعنی منگنی کے وقت دلھن، قصداً انگوٹھی کو ہاتھ سے نکال کر شوہر کے قدموں پر گرا دیتی اور اس کو اٹھانے کے بہانے سے شوہر کے پاؤں چھو لیتی۔

مشرقی اقوام کی عورتیں جس قدر زیور پہنتی ہیں وہ سب ان کے غلام ہونے کی نشانیاں ہیں۔ مثلاً ہاتھوں کے زیور (کڑے چوڑیاں وغیرہ) بجائے ہتکڑیوں کے ہیں اور پاؤں کے زیور بیڑیاں۔ گلے کے زیور میں ایک طوق بھی ہوتا ہے جو اپنا مفہوم خود ظاہر کر رہا ہے۔ ناک کی نتھ (اونٹ کی نکیل کی طرح) قابو میں رکھنے کی علامت ہے اور کان کے زیور حلقہ بگوشی کو ظاہر کرتے ہیں۔

آزمائشی شادیاں یورپ میں بغیر نکاح کے جو تعلقات جنسی قائم ہو جاتے ہیں انھیں آزمائشی شادیاں (Trial marriages) کہتے ہیں۔ ان تعلقات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نکاح سے قبل ہی آئندہ ازدواجی زندگی کے خوش گوار ہونے کا یقین کر لیا جائے۔

اس قسم کی آزمائشی شادیاں کورٹ شپ (Court Ship) کا عمومی نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ اول اول باہم تعارف ہوتا ہے۔ پھر شناسائی ہوتی ہے اور یہی شناسائی رفتہ رفتہ یکجائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ طریقہ قلطی (Celtic) اور طوطانی (Teutonic) ممالک میں عام طور پر رائج ہے اور مختلف علاقوں میں اس کے لیے مختلف اصطلاحیں رائج ہیں۔ مثلاً "Fensterln" - "Prsbenachte" - "Bundling" "Sittingup" - "Hand fosting" - "Hill" - "gang" "Courting on the bed" وغیرہ وغیرہ۔

ویلز میں کسی وقت یہ رواج عام تھا، انگلستان کے اکثر اضلاع میں جیسے چیشائر (Cheshire) وغیرہ میں اب بھی موجود ہے۔ اٹھارویں صدی میں آئرلینڈ کے اندر بھی یہ رواج موجود تھا نیو انگلینڈ میں اسے (Starrying) ٹھہرنا کہتے ہیں۔ ہالینڈ (Holland) میں اس کے لیے اصطلاح QuesTong (تلاش کرنا) موجود ہے۔ اور ملک ناروے میں اسے (Night Turning) کہتے ہیں۔

اگر فریقین کے درمیان یہ آزمائشی شادی کامیاب ثابت ہوتی ہے تو باقاعدہ نکاح کر لیا جاتا ہے۔ ورنہ اس آزمائش کے لیے دوسرا میدان تلاش کر لیا جاتا ہے۔

اگر اس قسم کے تعلقات کے دوران میں کوئی بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو سوسائٹی میں اس عورت کو ذلیل نہیں سمجھا جاتا۔ انگلستان کے علاقہ اسٹیفورڈ شائر (Stafford shire) میں تو یہ رواج بہت عام ہے اور وہاں مشہور ہے کہ "ایسی عورتیں نہایت اچھی بیوی، صدرجہ جفاکش بیویاں اور بااعتماد ثابت ہوتی ہیں"۔

پورٹلینڈ (Portland) میں جہاں کا سیمنٹ مشہور ہے اب تک یہ رواج چلا آتا ہے کہ عورت بغیر نکاح کے مرد کے ساتھ رہنا شروع کر دیتی ہے اور جب استقرار حمل ہو جاتا ہے تو دونوں نکاح کر لیتے ہیں ورنہ فریقین کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

آزمائشی شادیوں کا رواج صرف دیہاتی علاقوں تک محدود نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے شہروں میں بھی پایا جاتا ہے مثلاً ڈیپیرے (Dioperes) نے اپنی کتاب پیرس کی فحاشی (La Prootitntina Paris) میں صفحہ ۲۳۷ میں لکھا ہے کہ پیرس میں نوے فیصدی شادیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں فریقین کے مابین قبل از نکاح تعلقات پیدا ہو چکتے ہیں ممکن ہے ان اعداد میں کچھ مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ پیرس میں پچاس فی صدی شادیاں ضرور اسی طرح ہوتی ہیں۔

طوطانی (Yautonic) ممالک میں قبل از نکاح تعلق کا پیدا ہو جانا بہت قدیم چیز ہے مثلاً سویڈن کے متعلق ایلن کی (Ellen Key) نے اپنی کتاب (Liebe und Ehe) میں صفحہ ۱۲۳ پر لکھا ہے کہ اس ملک کی غالب آبادی اسی آزمائشی طریقہ نکاح کو پسند کرتی ہے اسی طرح روبین دولسٹر گارڈ (Ruben & Waster gaurd) نے ڈنمارک کی نسبت لکھا ہے کہ زن و مرد کے تعلقات قانونی صورت اختیار کرنے بھی نہیں پاتے کہ استقرار حمل ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] قدیم مصریوں میں رشتہ ازدواج بہت ڈھیلا ڈھالا ہوتا تھا، چنانچہ وہ اس بات کی آزمائش کے لیے کہ عورت بانجھ یا مرد بیکار تو نہیں چند روزہ ازدواجی تعلق پیدا کر لیا کرتے تھے لیکن اس وقت جو اقرار نامہ لکھا جاتا تھا اس میں پیدا ہونے والی اولاد کے لیے پورے حقوق کا خیال رکھا جاتا تھا

برلن میں اگرچہ ایسے بچوں کی تعداد ۱۷ فی صدی ہے لیکن دیگر شہروں اور اضلاع میں ان کی تعداد اس سے بھی بہت زیادہ ہے۔

چند سال گزرے جرمنی کے دیہاتی علاقوں میں اخلاق عامہ کی تحقیقات کرنے کے لیے پادریوں کی ایک کمیٹی قائم ہوئی تھی جس نے اپنی رپورٹ دو ضخیم جلدوں میں شائع کی اور جرمنی کے "اخلاق جنسیہ" کے متعلق نہایت مفصل معلومات بہم پہنچائیں۔ اس رپورٹ میں لکھا ہے کہ ہنوور میں عام رواج یہ ہے کہ عورت مرد میں قبل از نکاح تعلقات قائم ہو جاتے ہیں کیونکہ وہاں کے لوگوں کا قول یہ ہے کہ جس طرح بغیر دیکھے بھال کے مال نہیں خریدا جا سکتا اسی طرح بغیر جانچ کیے ہوئے عورت سے نکاح بھی نہ کرنا چاہیے۔

یہی حال علاقہ سیکسنی (Sexony) کا ہے۔

اسٹیٹن (Stetin) کے بارہ اضلاع میں شادی سے قبل تعلق پیدا کر لینا عام رواج ہے باقی اضلاع میں بھی سوسائٹی اس کو برا نہیں سمجھتی اور ڈینزگ (Danzing) کے علاقوں میں نصف سے زیادہ نکاح ایسے ہی ہوتے ہیں۔

روس میں جس قدر جنسی آزادی حاصل ہے وہ سب کو بخوبی معلوم ہے مگر اطالیہ میں لڑکیوں کو ایسی آزادی حاصل نہیں ہے۔ نوجوان لڑکیاں تنہا باہر جا سکتی ہیں نہ کوئی مرد ان سے تنہائی میں مل سکتا ہے۔

آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کی نسبت آج سے تیس سال قبل یہ مشہور تھا کہ وہاں جو شخص نیا نیا جاکر آباد ہوتا ہے تو قدیم باشندوں کی بیحیائی اور بداخلاقی دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے لیکن اب اس جلبسی آزادی میں اور بھی ترقی ہو گئی ہے۔ چنانچہ پادری ایچ نارتھکوٹ (H. Narthcota) نے جو عرصہ تک جنوبی دنیا میں رہ چکے ہیں اپنی کتاب "مسیحیت اور مسائل جنسیہ" (ehrisTianity & Sex Problem) میں تحریر فرماتے ہیں کہ آسٹریلیا کے مختلف حصص میں "بے نکاحی بیویوں" کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر کوغلان (Coghalan) جو آسٹریلیا کے متعلق سب سے بڑے مستند و معتبر محقق ہیں اپنی کتاب "نیو ساؤتھ ویلز" میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"آسٹریلیا کے علاقہ نیو ساوتھ ویلز میں چھ سال کے اندر انچاس ہزار چھ سو اکتالیس شادیاں درج رجسٹر ہوئیں جن میں تیرہ ہزار تین سو چھیاسٹھ دلہنیں ایسی تھیں جو حقیقتاً پہلے ہی شادی کے حکم میں داخل ہو چکی تھیں۔

جزیرہ جامیکا (Jamzica) میں اور بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ باقاعدہ رشتۂ ازدواج سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے اس کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ وہاں کی عورتوں کا تجربہ یہ ہے کہ بے نکاح کا شوہر بمقابلہ جائز اور قانونی شوہر کے زیادہ وفادار ثابت ہوتا ہے۔

پی۔ لونگسٹن (P. Livingstone) نے اپنی دلچسپ کتاب "سیاہ جامیکا" (Black Jamaica) میں لکھا ہے کہ یہاں کے باشندے یہ کہتے ہیں کہ محبت، وفاداری اور اتفاق کے ساتھ رہنا ہی شادی ہے گو اُس پر کلیسہ کی مہر ثبت نہ ہو۔"

یہی حال وینی زولا (Venezuela) کا ہے لیکن آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی نسبت کر (Curr) نے لکھا ہے کہ:۔

"یورپین اقوام کے آنے سے پہلے آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں سولہ برس عمر کی ایک بھی لڑکی ایسی نہ ہوتی تھی جس کا باقاعدہ شوہر موجود نہ ہو لیکن اب شادیاں زیادہ عمر میں کی جاتی ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ تقاضائے فطرت پورا کرنے کے لیے ناجائز طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔

وحشی اقوام میں نکاح کی صورتیں اس میں شک نہیں کہ وحشی اقوام میں صرف ایک شادی کا رواج کبھی نہیں پایا گیا۔ ان کے یہاں اشتراکیت کی دونوں صورتیں پائی جاتی تھیں یعنی جس طرح ایک عورت مختلف مردوں کی بیوی بن سکتی تھی اسی طرح ایک مرد مختلف عورتوں کا شوہر ہو سکتا تھا۔

چنانچہ شمالی ہند کے بعض کوہستانی علاقوں میں اب بھی یہ رواج پایا جاتا ہے کہ اگر کسی گھر میں کئی بھائی ہوتے ہیں تو شادی صرف بڑے بھائی کی ہوتی ہے لیکن عملاً تمام بھائی اس عورت سے متمتع ہوتے ہیں پہلی اولاد بڑے

بھائی کی، دوسری دوسرے بھائی کی اور تیسری تیسرے بھائی کی شمار ہوتی ہے ان میں نہ باہم کوئی جھگڑا ہوتا ہے نہ جذبۂ رقابت۔

بھوٹان اور تبت کے بعض علاقوں میں بھی یہی دستور ہے کہ ایک عورت کئی کئی شوہر رکھتی ہے اور سب کی اطاعت کرتی ہے۔ مرد جو کچھ کما کر لاتے ہیں عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور اولاد پر بھی عورت ہی کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

دارجلنگ سے اوپر کوہستانی علاقوں میں بھی یہی رواج اب تک پایا جاتا ہے اور قدیم یورپ کی تاریخ میں اسی طریق عمل کی متعدد مثالیں ملتی ہیں بلکہ جرمنی میں تو ایک دستور بہت زیادہ عجیب غریب یہ بھی تھا کہ اگر شوہر کسی سبب سے افزائش نسل کا اہل نہیں رہتا تھا تو بیوی اس کمی کو دوسرے طریقہ سے بھی پورا کر سکتی تھی۔

طلاق و خلع شادی اسی وقت صحیح معنی میں شادی رہتی ہے جب تک میاں بیوی دونوں میں اتفاق قائم رہے اور جب نااتفاقی پیدا ہو تو دونوں کو علیحدہ ہو جانا چاہیے اور اس علیحدگی کو طلاق کہتے ہیں۔ اگر شوہر بیوی سے ناخوش ہو اور موافقت کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو مرد بیوی کو علیحدہ کر دیتا ہے۔ یہ طلاق ہے۔ اگر مرد آوارہ ہو اور اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہو اور بیوی مجبور ہو کر مفارقت اختیار کرے تو اسے اصطلاح میں خلع کہتے ہیں۔

ہندو دھرم شاستر میں اس قسم کا کوئی قاعدہ نہیں رکھا گیا۔ میاں بیوی کے تعلقات تا زیست قائم رہتے ہیں، پہلے مسیحی اقوام میں بھی طلاق و

خلع کا کوئی قاعدہ نہ تھا۔ میاں بیوی کے تعلقات تا زیست ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ طلاق کا قاعدہ بنایا گیا۔ مگر یہ قاعدہ صرف اس قدر اثر رکھتا تھا کہ میاں اور بیوی دونوں میں مفارقت کرا دے۔ لیکن دونوں میں سے کوئی تا حین حیات دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اور چونکہ اس کے نتائج اور بھی زیادہ خراب نکلے اس لیے رفتہ رفتہ اب تقریباً عام اقوام و ممالک میں طلاق و خلع دونوں کا قانون بن گیا ہے۔

طلاق قدیم | قدیم روم میں دو قسم کی شادیاں ہوا کرتی تھیں عارضی اور مستقل، عارضی شادی کی مدت صرف ایک سال ہوتی تھی جسے اصطلاح میں (Marriage By Usus) کہتے تھے۔ اس میں مرد و عورت بغیر کسی تقریب یا رسم کے تعلقات پیدا کر لیتے تھے۔ اور یہ تعلقات سال بھر تک رہتے تھے۔ اگر اس دوران میں مرد و عورت کی زندگی لطف و محبت سے ساتھ بسر ہوتی تو وہ بعد انقضائے میعاد مستقل شادی کر لیتے تھے۔ ورنہ بغیر کسی عدالت یا پنچایت کی مداخلت کے فریقین میں خود بخود علیحدگی ہو جاتی تھی۔

قدیم ویلز میں | قدیم ویلز کی عورتوں کو شادی سے قبل و بعد بہت زیادہ آزادی حاصل ہوتی تھی۔ رہائس دو برائمور جونس (Rhys & Brynmor Jones) نے لکھا ہے کہ "یہاں یہ دستور عام ہے کہ جب کبھی مرد یا عورت فسخ تعلقات کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود بخود فریقین کی رضامندی سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔"

یہی حال آئرلینڈ میں تھا اور تعلقات نکاح کا منقطع کر دینا بہت آسان تھا جب عورت اپنی درخواست پر خلع حاصل کر لیتی تھی تو وہ اپنا تمام مال خواہ میکہ سے لائی ہو یا شوہر نے دیا ہو سب اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔

قدیم چین میں چین میں طریقہ طلاق قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ اگر میاں بیوی کے مزاج میں موافقت نہیں ہوتی اور دونوں علیحدہ ہونا چاہتے ہیں تو باہمی رضامندی سے تعلقات منقطع کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہاں طلاق و خلع کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ اگر بیوی غیر وفادار ثابت ہو یا فریقین میں سے کوئی کسی کو ضرر شدید پہنچائے تو طلاق لازمی ہو جاتی ہے۔

جاپان میں جاپان میں جدید قانون دیوانی کے مطابق شادی کی اطلاع رجسٹرار کو دیدی جاتی ہے لیکن شادی ہمیشہ فریقین کی رضامندی اور والدین یا بزرگوں کی اجازت سے ہوتی ہے۔ شادی کے سلسلہ میں احباب اعزہ کو بھی دعوت دی جاتی ہے لیکن قانون اس پر مجبور نہیں کرتا۔ ایسا کرنا یا نہ کرنا فریقین کی خوشی پر منحصر ہے۔

طلاق کا قاعدہ بھی وہی ہے جو شادی کا ہے یعنی رجسٹرار کو نوٹس دیدیا جاتا ہے کہ نکاح فسخ کر دیا جائے لیکن اس کے لیے یہ شرط ہے کہ شوہر اور بیوی کی عمر پچیس سال سے زیادہ ہو۔ اگر فریقین کی عمر اس سے کم ہے یا کہ فسخ نکاح کے لیے باہمی رضامندی حاصل نہیں ہو سکتی ہے

تو اس کے لیے قانونی علیٰحدگی (Judicial Divorcy) کا قاعدہ موجود ہے۔ قانونی طلاق مختلف اسباب کی بنا پر حاصل کی جا سکتی ہے۔

اسکیمو قوم میں علاقہ قطب شمالی کی اسکیمو (Eskimo) قوم میں معاشرتی و تمدنی لحاظ سے مرد و زن دونوں برابر ہیں۔ شادی بیاہ میں قطعی آزادی ہے اور اسی طرح فریقین میں کبھی بدمزگی پیدا نہیں ہونے پاتی۔

فرانس میں فرانس میں جب قانونی طلاق ہوتی ہے تو عورت کو درجۂ مساوات دیا جاتا ہے سخت تکلیف کی صورت میں طلاق بآسانی حاصل ہو جاتی ہے (لیکن ناموافقت کا عذر بہت کم سنا جاتا ہے) علاوہ ازیں جج کو اختیار ہے کہ فریقین کو علیٰحدگی میں لے جا کر سمجھائے اور اگر فریقین رضامند نہ ہوں تو عدالت میں کھلم کھلا سماعت مقدمہ کیے بغیر طلاق کی ڈگری دیدے لیکن اب فرانس میں زیادہ تر رجحان یہ ہو رہا ہے کہ باہمی رضامندی سے طلاق ہو جایا کرے اور عدالت میں رسوائی نہ ہو۔

جرمنی میں ریاست پرشیا میں سنہ ۱۹۰۰ء سے پیشتر طلاق کے متعلق یہ قاعدہ جاری تھا کہ فریقین خود خاموشی سے قطع تعلق کر لیا کرتے تھے لیکن سنہ ۱۹۰۰ء میں جدید قانون جاری ہوا۔ اس کی رو

سے اگر شوہر یا بیوی ایک دوسرے کو چھوڑ کر بھاگ جائے یا فریقین میں سے کوئی پاگل ہو جائے تو طلاق بآسانی مل جاتی ہے لیکن دوسری صورتوں میں بہت مشکلات پیدا کر دی گئی ہیں۔

روس میں ۱۹۰۷ء سے پہلے روس میں طلاق کا حاصل کرنا سخت دشوار تھا لیکن بعد ازاں فریقین کے لیے یہ سہولت کر دی گئی کہ اگر نباہ نہ ہو سکے تو دونوں باہمی رضامندی سے علیحدہ ہو جائیں۔ اگر سال بھر علیحدہ رہ کر وہ پھر رضامند ہو جائیں تو دوبارہ نکاح کر لیں۔ لیکن جب سے روس میں بالشویکیت قائم ہوئی ہے شادی اور علیحدگی دونوں بہت آسان ہو گئی ہیں۔

انگلستان میں ازدواج و طلاق کے مسئلہ میں انگلستان کا قانون فرانس اور امریکہ سے بہت گرا ہوا ہے ۱۸۵۷ء میں ایک قانون پاس ہوا تھا جس میں زن و مرد کو برابر کا درجہ نہیں دیا گیا تھا۔ یعنی عورت اگر غیر وفادار ثابت ہو تو شوہر طلاق حاصل کر سکتا تھا لیکن اگر شوہر اسی جرم کا مرتکب ہو تو بیوی طلاق حاصل نہ کر سکتی تھی۔ عورت اسی صورت میں طلاق حاصل کر سکتی تھی کہ شوہر اس پر ظلم و ستم کرے یا اسے چھوڑ کر بھاگ جائے۔ ابتدا میں لفظ "ظلم و ستم" کا مفہوم محض ضرر جسمانی تک محدود تھا لیکن بعد میں اسے وسعت دیدی گئی یعنی اب اس میں ایسی

باتیں بھی شامل ہیں جن سے بیوی کی طبیعت کو رنج یا صدمہ پہنچے، علاوہ
ازیں شوہر کی سرد مہری اور غفلت بھی "ظلم" میں داخل سمجھی جاتی ہے۔

امریکہ میں امریکہ میں خواہ مدعی خاوند ہو یا بیوی، بدسلوکی کا عذر فسخ
نکاح کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ جن باتوں کو "بدسلوکی
یا خلاف انسانیت" کہا جاتا ہے وہ نہایت ہی معمولی باتیں ہوتی ہیں مثلاً
اگر بیوی شوہر کے کوٹ یا کسی اور کپڑے میں بٹن نہ ٹانکے تو یہ بھی بدسلوکی
سمجھی جائے گی یا میاں اگر اپنے پاؤں کے ناخن نہ تراشے تو اس عذر کو
بھی کافی سمجھا جائے گا اور طلاق ہو جائے گی۔ ایک بار کسی عورت نے
دعویٰ کیا کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے اس وقت سے اب تک میرا
شوہر کبھی گاڑی میں بٹھا کر سیر کو نہیں لے گیا چنانچہ اس کا یہ فعل خلاف انسانیت
قرار دیا گیا اور طلاق کی ڈگری دے دی گئی۔

دیگر ممالک سوئٹزرلینڈ میں اگر میاں بیوی کے درمیان ناموافقت
ہو جائے تو دو سال کے لیے طلاق حاصل کی جا سکتی ہے۔ ناروے میں
بھی قانون طلاق بہت آسان ہے۔ رومانیہ میں بھی باہمی رضامندی کے
ساتھ علیحدگی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ماں باپ اپنے مال کا نصف حصہ
بچوں کو دے دیں۔

مذہبی فحاشیاں

ہیروڈوٹس کے چند بیانات بہ ظاہر یہ عنوان نہایت عجیب و غریب معلوم ہوگا کیونکہ "مذہب" جس کا مقصود ہی یہ ہے کہ دنیا سے "فحاشی" کو فنا کر دے وہ کیونکر اس کا معاون ہو سکتا ہے، لیکن اگر آپ مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے اکثر مذاہب نے نہ صرف فحاشی کو گوارا کیا بلکہ اس کے رواج و اشاعت میں سبب اولین ثابت ہوئے چنانچہ اس سلسلے میں پہلے چند بیانات ہیروڈوٹس (مشہور مورخ) کے سن لیجیے۔

جب ہیروڈوٹس لیڈیا (Lydia) کی سیاحت کرنے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں شاہ الیاتیس (Alyates) کا شاندار مقبرہ شہر سارڈیس (Sardes) کے مختلف سوداگروں اور پیشہ ور لوگوں کے چندہ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ مورخ مذکور لکھتا ہے کہ:-

"اس شاہی مقبرہ کی چوٹی پر پانچ سنگی مینار میرے زمانہ (یعنی پانچویں صدی قبل مسیح) تک قائم تھے اور ان میناروں پر جو عبارتیں کندہ تھیں ان سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مختلف طبقہ کے لوگوں نے اس کی تعمیر میں

کس قدر روپیہ ادا کیا۔ چنانچہ اس تعمیر میں سب سے بڑا حصہ پیشہ ور عورتوں نے لیا تھا۔ لیڈیا میں عام لوگوں کی لڑکیاں سب کی سب پیشہ ور ہیں اور اپنے جہیز کے لیے روپیہ اسی طرح جمع کرتی ہیں۔"

عہد قدیم میں فحاشی کے خیال کو معیوب سمجھا جانا کیونکر رفتہ رفتہ کم ہوا؟ اس کے متعلق ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ:-

"اول اول مصریوں میں اس کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا کہ وہ مقدس مقامات میں عورتوں سے بات چیت کریں۔ چنانچہ عورت سے بات کرنے کے بعد جب تک وہ غسل نہ کر لیتے تھے اس وقت تک مندر میں ہرگز داخل نہ ہوتے تھے لیکن مصریوں اور یونانیوں کے علاوہ دنیا کی تقریباً تمام قومیں اس بارہ میں دوسرے نظریہ کی پابند تھیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جب مندروں اور دیگر مقدس مکانوں میں مختلف قسم کے جانور باہمدگر ملتفت ہوتے ہیں اور دیوتا اس کو گوارا کر لیتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ چڑیوں اور جانوروں کی طرح عورتوں اور مردوں کا اختلاط گوارا نہ ہو۔ چنانچہ یہ عمل رفتہ رفتہ مذہبی ادارہ میں داخل ہو گیا۔"

ہم اس جگہ مورخ ہیروڈوٹس کی ایک اور عبارت نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

"بابل والوں میں ایک نہایت ہی شرمناک رواج یہ ہے کہ ہر عورت جو اس ملک میں پیدا ہو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ آکر دیوتا

(Aphrodete) دیوی کے مندر میں جا کر بیٹھے اور آزادانہ مردوں سے ملے، چنانچہ اس مندر میں عورتوں کی بہت بڑی تعداد ایسی نظر آتی ہے جو اپنی چوٹیوں میں پھول گوندھے ہوئے بیٹھی رہتی ہیں۔ غیر مرد ان کو دیکھتے ہوئے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں اور جس پر نظر انتخاب پڑتی ہے ٹھہر جاتے ہیں۔ جو عورت ایک مرتبہ بیٹھ جاتی ہے پھر اسے اس وقت تک اٹھ کر جانے کی اجازت نہیں ملتی جب تک کوئی غیر محرم اس کی گود میں چاندی کا سکّہ نہ پھینک دے جب مرد چاندی کا سکّہ گود میں ڈال دیتا ہے تو وہ اپنے منھ سے یہ الفاظ کہتا ہے کہ "ملیتا (Mylitta) دیوی تیرا بھلا کرے۔" اور عورت اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ نقرئی سکّہ کتنا بڑا ہے لیکن جب وہ گود میں پھینک دیا جاتا ہے تو اس کے لینے سے انکار کرنا قانوناً جرم ہے کیونکہ وہ سکّہ متبرک سمجھا جاتا ہے جو عورتیں حسین ہوتی ہیں وہ تو بہت جلد مخلصی حاصل کر لیتی ہیں لیکن جو بدصورت ہوتی ہیں ان کو زیادہ زمانہ صرف کرنا پڑتا ہے اور تین تین چار چار دن تک پڑی رہتی ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی ایک رسم جزیرہ قبرص کے بعض مقامات میں بھی پائی جاتی ہے۔"

قدیم زمانہ کے دیوتاؤں میں کمتر ایسے ہیں جن کو خواہش نفسانی سے مبرّا کہا جا سکے۔ اسی لیے بہت سے مذہبی تہوار حد درجہ بدمستیوں کے ساتھ منائے

جاتے تھے چنانچہ یونانیوں کے دیوتا دیونسوس (Deonosus) اور اہل روم کے دیوتا باخوس (Bachos) اس باب میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔

بائبل کی بہت سی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک فلسطین کے غیر عبرانی باشندے مذہب کی آڑ میں کافی داد بدمستی دیا کرتے تھے اور یرمیاہ اور دیگر انبیاء بنی اسرائیل نے ان رسموں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور ہیروڈوٹس کے نزدیک بھی زن و مرد کے تعلقات ناپاک سمجھے جاتے تھے باایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم یونان میں "مذہبی فحاشی" بکثرت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ابتدائے اپریل و مئی میں فلوریلیا (Floralia) دیوی کے نام سے جو میلہ آٹھ روز تک ہوا کرتا تھا اس کا مقصد وہی عیش پرستی تھا اور اس موقع پر رومی کسبیاں سب کے سامنے برہنہ ہو کر نہایت ہیجان انگیز ناچ ناچا کرتی تھیں۔

مذہب میں رواج فحاشی کے اسباب انسان کی ارتقائی حالتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ عہد تمدن سے قبل انسان تین حالتوں سے گزر چکا ہے، سب سے پہلی وہ جب صرف شکار پر اس کی زندگی کا انحصار تھا، دوسری وہ جب اس نے چوپانی اختیار کی اور تیسری فلاحت و زراعت۔

اولین دور میں جب صرف شکار اس کا مشغلہ تھا، افزائش نسل کا مسئلہ اسکے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جس قدر کم شکاری ہونگے اسی قدر شکار زیادہ ملیگا اور اسی لیے تعلق جنسی کی کوئی اہمیت اسکے نزدیک تھی لیکن بعد کو

جب اس نے دیکھا کہ بعض اوقات کئی دن شکار نہیں ملتا تو اُس نے جانوروں کے بچے پکڑ کر پالنا شروع کیے اور اس طرح وہ بتدریج چوپانی حالت میں آ گیا، پھر چونکہ چوپانی حالت میں مویشیوں کی نگہداشت اور ان کو ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ تک لے جانے کی ضرورت پڑتی تھی اس لیے اُسے اپنا خاندان بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور سب سے پہلے تعلق جنسی کی اہمیت اس پر اس طرح واضح ہوئی جب انسان چوپانی حالت سے گزر کر زراعت کی طرف متوجہ ہوا تو اُسے اور زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑی اور اس نے محسوس کیا کہ جبتک خاندان میں بہت سے آدمی نہ ہوں اس وقت تک چوپانی اور کسانی کے کام اچھی طرح نہیں چل سکتے اس لیے انسان نے افزائش نسل کی طرف پوری توجہ کی اور اس کو ایک مذہبی فریضہ کی صورت دیدی کیونکہ دنیوی باتوں کے مقابلہ میں انسان پہ مذہبی باتوں کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور اس طرح بچے پیدا کرنا اور تعلقات جنسی کو وسیع کرنا گویا ہر مرد کا فرض قرار پایا اور اسی کے ساتھ تعدد ازدواج یا ایک ہی وقت میں متعدد بیویاں رکھنے کا رواج پیدا ہوا اس امر کا ثبوت کہ جبتک انسان شکاری حالت میں رہا اس کے مذہب میں سوائے پرستش ارواح کے اعضاء جنسی کی پرستش کا کوئی خیال پیدا نہ ہوا تھا۔ ان اقوام کے مطالعہ سے مل سکتا ہے جو ہنوز ابتدائی شکاری حالت میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً آسٹریلیا کی بعض قوموں، (ودداہ یا ہگان، اور تسمانی) کو دیکھیے کہ وہ ابھی تک

بالکل عہد عتیق کی شکاری حالت میں ہیں اور فحاشی کا کوئی شائبہ ان کے مراسم مذہبی میں نظر نہیں آتا کیونکہ ان کا مذہب صرف روح کی پرستش ہے۔

یہ لوگ تعلقات جنسی کے مسئلہ میں اس قدر ناواقف ہیں کہ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اولاد کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو عورت کے پیٹ میں کوئی روح داخل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب یورپین قومیں آسٹریلیا میں داخل ہوئیں اور انھوں نے ان لوگوں کو بچہ پیدا ہونے کا اصلی سبب بتایا تو یہ لوگ بہت حیران ہوئے۔

الغرض یہ امر تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ جبتک انسان اپنے ابتدائی "دور صید و شکار" میں رہا، تعلقات جنسی کی طرف سے وہ بہت بے پروا تھا، لیکن جب اس نے چوپانی اور فلاحی شروع کی تو سب سے پہلے اس نے جس چیز کی طرف توجہ کی وہ ارتباط زن و مرد تھا اور اس لیے اس دور کے تمام مذاہب میں آپ کو مذہبی فحاشی کثرت سے نظر آئے گی۔

افریقہ میں مذہبی فحاشی کے آثار

سر آر برٹن (Sir R. Burton) سرزمین داہومی (Dahomi) کی نسبت تحریر کرتے ہیں کہ:-

"دہا کنڈ اسے لیکر دارالحکومت تک کوئی راستہ ایسا نہیں ہے جہاں اعضائے جنسی کی علامات نظر نہ آئیں۔ یوں تو عام طور پر زیادہ تر صرف اعضائے جنسی ہی پتھروں کی صورت میں نظر آتے ہیں لیکن کبھی کبھی مشہور

دیوتا کے عریاں بت کے ساتھ بھی جنسی عضو کو دکھاتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا دیوتا لنگبا ہے جو جذباتِ شہوانی سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ جب کسی شخص کو احتلام ہوتا ہے تو وہ اسی دیوتا سے منسوب کرتا ہے اور صبح ہوتے ہی سب سے پہلے اسکی پوجا کرتا ہے اور نذر چڑھاتا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ رات کو خواب میں کسی کا بصورت مرد یا عورت دکھائی دینا گویا خود لنگبا دیوتا کا نظر آنا ہے۔ اس دیوتا کا بت سرخ مٹی کا اس طرح بنایا جاتا ہے گویا وہ اکڑوں بیٹھا ہوا اپنے آپ کو برہنہ دیکھ رہا ہے۔ اس قسم کے بت تقریباً ہر مکان کے سامنے ایک چھوٹے سے چھپر یا سائبان کے نیچے بنائے جاتے ہیں۔

بعض سوڈانی قبائل میں عشق و محبت کی دیوی بھی ہوتی ہے جو عموماً ایک حاملہ عورت کی طرح بنائی جاتی ہے اور اس کا سینہ بہت طویل اور عضو جنسی بہت بڑا بنایا جاتا ہے۔ الغرض ان ممالک میں اعضاءِ جنسی کی پرستش وسیع پیمانہ پر موجود ہے۔

ایک سوڈانی قوم ہے جس کا نام یوروبا ہے، ان کے یہاں اس دیوی کا بت اس طرح بنایا جاتا ہے گویا ایک عورت بیٹھی ہوئی اپنے بچہ کو گود میں لیے دودھ پلا رہی ہے۔ اس دیوی کے ساتھ ایک دیوتا بھی ہوتا ہے اور مندر کی دیواروں پر دونوں کے اعضاء جنسی بحالت

اتصال دکھائے جاتے ہیں۔ ان دیوتاؤں کا کام یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ زن و مرد دونوں کے دلوں میں عشق و محبت پیدا کرتے ہیں، بانجھ عورتوں کو بارآور کرتے ہیں اور وضع حمل کے وقت تکلیف نہیں ہونے دیتے۔ بعض مندروں میں، جہاں اس قسم کی پوجا ہوتی ہے، عورتیں بھی ہوتی ہیں، جو خاص تہواروں اور میلوں کے وقت بالکل آزاد ہوتی ہیں اور ان صورتوں میں جو اوباشیاں ہوتی ہیں انہیں مذہبی حیثیت دی جاتی ہے۔

مغربی افریقہ کے اس حصہ میں جسے (Slave Coast) یا ساحل غلاماں) کہتے ہیں افریقی لوگ مردانہ عضو جنسی کا نہایت شان و تجمل کے ساتھ بازاروں میں جلوس نکالتے ہیں۔ اور اگر اتفاق سے کوئی نوجوان لڑکی نظر آجاتی ہے تو اس کے جسم سے مس کر کے بہت بیہودہ مذاق کرتے ہیں۔"

سر ہینری جانسٹن نے وادی دریائے کانگو کے لوگوں کا حال بیان کیا ہے کہ:۔

"وہ اپنے لکڑی کے مندروں میں بہت سے زنانہ اور مردانہ بت ایسے رکھتے ہیں جن کے اعضاء جنسی بہت بڑے ہوتے ہیں۔ ان بتوں پر بھینٹ چڑھا کر ان کی پوجا کی جاتی ہے۔ بعض اوقات ان لوگوں کے گھروں میں بھی یہ نشان چھتوں میں لٹکتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔"

ایک اور یورپین سیاح نے وادی کانگو کی بانیری قوم کا حال لکھا ہے کہ:۔

" یہ لوگ مٹی سے اس قسم کے عضو بناتے ہیں اور ان کو چڑیوں کے پروں سے آراستہ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ زنانہ عضو بھی بناتے اور ان دونوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ان پر مرغوں کی بھینٹ بھی چڑھائی جاتی ہے کیونکہ مرغ بہت قوی خواہش کا جانور سمجھا جاتا ہے۔"

ایک فرانسیسی فوجی افسر نے حال بیان کیا ہے کہ :۔

" اس نے وادی کانگو میں ایک خاص تہوار دیکھا جس میں عضو جنسی کی خاص نمائش کی جاتی ہے ایک بڑا برہنہ بت بنایا جاتا ہے اور اس کے عضو کو کمانیوں کے ذریعہ سے حرکت دی جاتی ہے۔ بعض مندروں میں ایسے دیوتاؤں کے پجاری مخنث ہوتے ہیں۔"

نائجیریا کی قوم ایکوئی میں اکیجا نامی ایک دیوتا ہے جس کا تہوار بالکل لگیا کی طرح منایا جاتا ہے ان لوگوں کا عام عقیدہ ہے کہ اس قسم کی بدمستیوں سے دیوتا خوش ہوتے ہیں اور فصلیں بھی اچھی پیدا ہوتی ہیں کسی زمانہ میں یہ لوگ ہر سال ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی کی قربانی کیا کرتے تھے لیکن اب بجائے عورت کے مرغ کی قربانی ہونے لگی ہے۔

یورپ میں مذہبی فحاشی کے آثار | یورپ کے غاروں سے جو زمانہ قبل تاریخ کے بہت سے نقوش برآمد ہوئے ہیں ان میں ننگی تصویریں بھی ہیں جو سینگ یا ہڈی پر چقماق کی باریک نوک سے بنائی گئی ہیں۔ عورتوں کے

بھی چھوٹے چھوٹے مجسمے ہیں جو عموماً بحالت نشست بنائی گئی ہیں۔ ان کی وضع قطع افریقی ہے اور یہ تصاویر وادی کانگو کے بتوں سے ملتی جاتی ہیں۔ ان مردانہ تصاویر اور نسائی مجسموں کے اعضائے تولید بہت بڑے بنائے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم یورپ میں بھی اس قسم کی پرستش کا رواج پایا جاتا تھا۔

انسان اول اول تمام حوادث و مناظر قدرت کی تشریح و توجیہہ ارواح کے ذریعہ سے کرتا تھا۔ وہ چاند سورج، رعد و باراں وغیرہ سب کے لیے ایک ایک روح یا موکل مقرر کر دیتا تھا، لیکن کوئی روح بچہ پیدا کرنے والی عرصہ دراز تک اس کے ذہن میں نہ آئی تھی۔ جب کبھی کوئی بچہ پیدا ہوتا اور وہ اس واقعہ کی نسبت خیال آرائی کرتا تو سمجھتا کہ کسی انسان یا حیوان کی روح جسد خاکی سے علیحدہ ہو کر عورت کے اندر حلول کر گئی ہے جو از سر نو متشکل ہو کر مع جسم خاکی کے پیدا ہوئی ہے وہ بالکل ناواقف تھا کہ عورت سے بچہ پیدا ہونے میں مرد کا بھی کوئی حصّہ ہوتا ہے

علاوہ ازیں منازل ارتقا کی ان پست حالتوں میں انسان زراعت نہیں کرتا تھا نہ مویشی پالتا تھا۔ اس کی تمام ضرورتیں قدرت خود بخود پوری کر دیتی تھی اور سامان خورد و نوش کی کسی وحشی انسان کو قطعی فکر نہیں تھی، علاوہ اس کے ایک بات یہ بھی تھی کہ چونکہ دنیا کی تمام پست قومیں گرم ممالک میں پائی جاتی ہیں۔ جہاں موسموں کا تغیر و تبدل چنداں نمایاں نہیں ہوتا، لہذا اس کے لیے فصل بہار جب کہ تمام عالم میں نیا جوش پیدا ہوتا ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتی

تھی۔ تیسرے یہ کہ ارتقاء کی اس پست حالت میں نہ باہمی جنگ و جدال پایا جاتا تھا نہ کوئی قبائلی تنظیم تھی، اس لیے انسان اوّل عادتاً غیر جنگجو تھا اور اُسے زیادہ اولاد کی تمنا نہیں تھی۔

اس کے بعد جب انسان شکاری حالت سے گزر کر چوپانی یا کسانی حالت میں پہنچا تو اُسے زیادہ آدمیوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ تمنا پیدا ہوئی کہ بچے زیادہ ہوں۔ افزائش نسل کے دیوتاؤں کی پوجا اور ان کو خوش کرنے کے لیے مختلف قسم کی رسمیں ادا کرنا پڑیں کیونکہ قوم کا سر فرار تو جنگ کیلیے مر جاتا تھا اور مرد پیدا کرنے کے لیے عورتیں درکار تھیں اور یہیں سے اعضاء جنسی کی پوجا کا آغاز ہوتا ہے اور غالباً اسی وجہ سے دنیا میں مباشرت کو مذہبی حیثیت دیگئی۔

مباشرت کی مذہبی حیثیت پست اور جاہل اقوام کے نزدیک بہشت نام ہے کثرت ازدواج، کثرت اولاد، فراوانی کاشت کا، پھر جب پیٹ بھر جاتا ہے تو انسان دوسری طرف راغب ہوتا ہے اور دوسری طرف راغب ہونے کا نتیجہ اولاد ہے اور اولاد پیدا ہوتی ہے اعضاء جنسی کے اتصال باہمی سے، لیکن چونکہ بعض اوقات سالہا سال گزر جاتے تھے اور اولاد پیدا نہیں ہوتی تھی اس لیے ان دیوتاؤں کو خوش کرنے کی ضرورت پڑی جن کا تعلق افزائش نسل سے تھا اور اس طرح اعضاء جنسی کی پوجا شروع ہوئی۔

جن ممالک میں مغل نسل کی اقوام آباد ہیں وہاں تو اس قسم کی پرستش کا بیہ

نہیں ملتا، لیکن جاپان میں بیشک کسی زمانہ میں اس کا رواج تھا، چنانچہ انیسویں صدی میں جب جاپان کے دروازے دوسری اقوام کے لیے کھل گئے تو امریکن سیاح یہ بات دیکھ کر سخت حیران ہوئے کہ وہاں کھلم کھلا اعضائے جنسی کی نمائش و پرستش ہوتی ہے۔ بخصوصیت کے ساتھ مذہب شنتو کے پرانے مندروں میں تو دیوتاؤں کے بت ایسے بنائے جاتے تھے جن میں مردانہ اعضائے جنسی پوری آمادگی کی حالت میں دکھائے جاتے تھے۔

ہندوستان کے جنوب اور جنوب مشرق میں جو جزائر ہیں ان میں بھی یہ پوجا عام ہے۔ مثلاً مجمع الجزائر بار بار میں سورج کا انسانی بت مع عضو جنسی کے بنایا جاتا ہے اور جب اس کا میلہ ہوتا ہے تو پورے عیش و نشاط سے کام لیا جاتا ہے۔ ماورائے سماترا، جزائر نیاس کے باشندے اپنے مرے ہوئے اعزہ کی تصویریں اپنے مکانوں کی دیواروں پر کھینچتے ہیں جو بالکل برہنہ ہوتی ہیں اور تصویروں کی پوجا کر کے وہ افزائش نسل کی التجا کرتے ہیں۔

جزیرہ نیو گنی کی بعض قوموں میں یہ دستور ہے کہ تمام لڑکے اور بن بیاہے نوجوان، مخصوص مکانات میں سوتے ہیں جو اسی کام کیلیے علیحدہ کردیے جاتے ہیں اور جن کی دیواروں پر ننگی تصویریں مع مختلف آسنوں کے بحالت اتصال منقوش ہوتی ہیں۔ بظاہر یہ رواج بہت اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس طرح گویا انھیں تجرد کی زندگی کا درس دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس صورت

ہیں وہ غیر فطری ذرائع سے اپنی خواہشیں پوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔
جزیرہ سیلی بیز میں بھی اسی قسم کی پوجا بہت ہوتی تھی۔ یہاں عورتوں کے ایسے بُت بنائے جاتے تھے جن کے عضو جنسی کے ظاہر کرنے میں بہت مبالغہ سے کام لیا جاتا تھا، مندروں کی دیواروں پر جو پتھر کے مردانہ بت بنائے جاتے تھے وہ بالکل عُریاں ہوتے تھے۔ بعض مندروں میں مرد بحالت اتصال دکھائے جاتے تھے۔ اس جزیرہ کے جنوبی علاقہ میں ایک خاص دیوتا افزائش نسل کا کارینگ آود ہے جو بالکل عُریاں بنایا جاتا ہے اور اسکے مندر میں نوجوان عورتوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہتی ہے۔ بعض مندروں میں اس کے طلائی بُت بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی جزیرہ میں بعض قبائل ایسے بھی ہیں جو ایک خاص دیوتا کی پرستش کرتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں اس دیوتا کا بت سات فٹ بلند اور بالکل عُریاں بنایا جاتا تھا جس کی پوجا نہایت فخر کے ساتھ کی جاتی تھی۔ جب ولندیزیوں نے مداخلت کی تو یہ بت چھپا دیا گیا اور لوگ برسوں تک اس کی پوجا پوشیدہ طور پر کرتے رہے۔
جزیرہ جاوا میں اس قسم کی پوجا بکثرت ہوتی ہے۔ وہاں کے بعض حصوں میں یہ عام رواج ہے کہ جب دھان کے پودوں میں بالیاں نکلنے کو ہوتی ہیں تو کھیت کا مالک اور اس کی بیوی دونوں ننگے ہو کر کھیت کا طواف کرتے ہیں اور اسی کھیت میں ایک دوسرے سے ملتفت ہوتے ہیں۔ قدیم یورپ میں

بھی عمدہ فصل پیدا کرنے کے لیے اس طریق عمل پر کاربند ہونا پڑتا تھا۔ ایک سیاح نے اہل جاوا کی اس پرستش کا عجیب و غریب حال تحریر کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ:۔

"ایک مرتبہ ولندیزیوں کی ایک توپ جنگل میں رہ گئی۔ عوام میں یہ خیال پھیل گیا کہ یہ توپ یورپ کے کسی بت کا "عضو مخصوص" ہے اس خیال کے پھیلتے ہی مقامی پجاریوں نے عوام کو اس توپ کی پوجا کرنے کی ترغیب دی اور لوگ دور دور سے آکر اس پر چاول اور پھول چڑھانے لگے خصوصاً بانجھ عورتوں کا تو ہر وقت تانتا لگا رہتا تھا۔ یہ عورتیں زرق برق لباس پہن کر آتیں اور توپ پر گھوڑے کی طرح بیٹھ جاتیں بعض اوقات دو دو عورتیں ایک ہی وقت میں ایسا کرتیں بالآخر عیسائیوں نے حکومت کو مجبور کیا کہ اس "توپ دیوتا" کو وہاں سے اٹھالیا جاوے۔"

برہما کے بالائی حصّہ میں بھی رواج ہے کہ ہر سال فصل بہار کے وقت لوگ ایک بت کا جلوس نکالتے ہیں جس کا "عضو جنسی" بہت نمایاں ہوتا ہے اور جلوس والے بہت فحش قسم کا مذاق کرتے ہوئے اور گالیاں گاتے ہوئے ساتھ چلتے ہیں۔ مسٹر جوزف میک کیب جو ایک مشہور امریکن مصنف سیاح ہیں لکھتے ہیں کہ:۔

"یوکاتان کے شمالی حصّہ میں یوکیل کے مشہور کھنڈر واقع ہیں۔ چند ماہ گزرے میں ان خرابوں کی سیر کرنے گیا جس وقت جنگل سے نکل کر صاف جگہ میں

پہنچا تو وہاں ایک چھوٹا سا بلند ٹیلہ دیکھا جہاں کسی زمانہ میں مندر بنا ہوا تھا اس کے دامن میں جہاں خوبصورت اور عالیشان عمارتوں کا خرابہ ہے میں نے دو پتھر دیکھے جو چار پانچ فٹ لمبے تھے۔ یہ بلحاظ شکل و شباہت نہایت مکمل مردانہ عضو تھے کسی زمانہ میں یہ دونوں مندر کے دروازہ پر دونوں جانب نصب تھے اور یہ مندر ـــ ایک نہایت عظیم الشان اور متمدن شہر کے وسط میں واقع تھا گویا اس وقت یہاں بھی اس قسم کی پوجا ہوتی تھی۔"

امریکہ بھر میں جہاں جہاں اقوام مایا و پیرو کا تمدن پایا جاتا تھا وہاں کے مندروں کی خصوصیت الخصیہ اعضاء کی پرستش تھی جن کے نشانات کثرت سے پرانے کھنڈروں میں اب بھی ملتے ہیں۔

امریکہ کی "منداں" قوم میں ایک سالانہ تہوار ہوتا تھا جس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک مضحکہ انگیز بت کا جلوس نکالتے تھے جو بالکل عریاں ہوتا تھا اور ایک چوبی عضو رکھتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بت کی جگہ ایک مرد لے لیتا تھا اور عورتوں کے پیچھے دوڑتا تھا جب وہ اس کے ہاتھ نہیں آتی تھیں تو خوبصورت لڑکوں کی طرف راغب ہوتا تھا۔ جب وہ یہ حرکت کرتا تھا تو عورتیں اس کا پیچھا کرتی تھیں اور اس کا چوبین عضو ایک عورت توڑ لیتی تھی اور اسے ہاتھ میں لیکر ایک تقریر کرتی تھی اور کہتی تھی کہ "وہ آج کے بعد سے حقیقی زندگی کی مالک ہے۔"

قدیم مصر میں بھی یہ پوجا نہایت شدومد سے جاری تھی، چنانچہ وہاں کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "سیت" نے جو خداوند شر تھا اپنے بھائی "اوسیرز" خداوند خیر کو قتل کر کے اسکی لاش کے مختلف ٹکڑے مختلف مقامات میں علیحدہ علیحدہ دبا دیئے۔ "اوسیرز" کی بہن اور بیوی "آئسین" نے نہایت جانفشانی سے تلاش کر کے ٹکڑے نکال لیے لیکن عرصہ دراز تک باوجود تلاش بسیار عضو جنسی نہ ملا۔ مجبور ہو کر لکڑی کا ایک عضو بنا کر لاش کے ساتھ دفن کیا۔ اس کے بعد مصری عورتوں میں اس پوجا کا بیحد رواج ہو گیا اور رفتہ رفتہ تمام مصر اور افریقہ میں یہ رسم اس طرح پھیل گئی کہ مصر کے پجاریوں کو بھی یہ فحش رسم اپنے مذہب میں داخل کرنا پڑی۔ مشہور یونانی مورخ و سیاح ہیروڈوٹس نے لکھا ہے کہ:۔

"وہاں "اوسیرز" کا سالانہ تہوار نہایت دھوم دھام سے منایا جاتا تھا عورتیں باجے گاجے کے ساتھ اوسیرز کا بت لیکر نکلتی تھیں۔ بت کا قد دو فٹ کے قریب ہوتا تھا۔ اس کے عضو جنسی میں ڈورے بندھے ہوتے تھے جن کو کھینچنے سے اس میں عمودی جنبش پیدا ہوتی تھی۔ قدیم مصریوں میں اس پرستش کے عام ہونے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک عالی مرتبہ مصری خاتون کی حنوط شدہ لاش کے ساتھ ایک سانڈ بیل کا حنوط شدہ عضو بھی برآمد ہوا تھا۔"

مسٹر ہانے بیان کرتے ہیں کہ:۔

"جنوبی اطالیہ کے شہر پالسٹم میں جہاں یونانیوں کا اثر تھا آکسین کے مندر سے چار ہزار پتھر کے ٹکڑے مردانہ عضو کی شکل کے برآمد ہوئے تھے"

ہندوؤں میں پرستار ان شیوا اب بھی "لنگ پوجا" کے لیے خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں۔

مذہبی فحاشی کی عجیب غریب صورتیں اس سے غالباً یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ اعضاء جنسی کی پرستش کہاں کہاں اور کس کس طرح پائی جاتی تھی لیکن اسی کے ساتھ ایک پہلو بحث کا یہ رہ جاتا ہے کہ اس طریق پرستش کا اثر عام اخلاق انسانی پر کیا ہوا اور اس سلسلہ میں عبادت گاہوں کے اندر کس کس طرح داد عیش و کامرانی دی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ اوّل اوّل اکثر قبائل میں یہی دستور تھا کہ شادی بیاہ اپنے ہی عائلہ و قبیلہ کے افراد میں کرتے تھے۔ نہ کسی غیر قوم کی بیٹی لیتے تھے نہ اپنی بیٹی دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اولاد کمزور پیدا ہونے لگی، اسی اثناء میں لوگوں نے دیکھا کہ اگر لڑکی کی شادی کسی غیر خاندان والے سے ہو جاتی ہے تو اولاد جسمانی و دماغی لحاظ سے ترقی یافتہ پیدا ہوتی ہے پس بقاء قوم اور تقویت نسل کے خیال سے لوگوں کو غیر اقوام کے ساتھ وابستگی کا خیال پیدا ہوا لیکن چونکہ اسمیں ایک قسم کی سبکی اور اخلاقی برائی تھی، اس لیے قوم کے بزرگوں اور مقتدایان دین نے بین الاقوامی طریقہ ازدواج جاری کر کے جھگڑے پیدا کرنا تو مناسب نہ سمجھا لیکن ہر عورت

کے لیے مذہبی فرض قرار دے دیا کہ وہ عمر بھر میں کم از کم ایک مرتبہ کسی اجنبی کو ملتفت ہونے کا موقع دے، پھر چونکہ اس کا تعلق مذہب سے قرار دیا گیا تھا اس لیے عبادت گاہوں کو بھی اس کا مرکز قرار دیا گیا اور ان میں بھی خصوصیت کیساتھ کسی دیوی کا مندر تاکہ عورتیں جلد اس طرف مائل ہو سکیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سینجر نے لکھا ہے کہ:۔

"کلدانیہ میں کسی وقت ہر بابلی عورت کا قانونی فرض تھا کہ وہ عمر میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور مایلیتا دیوی کے مندر میں جا کر آزاد ہو جائے۔ ہیروڈوٹس نے دوران سیاحت میں وہ معبد، میدان اور باغ دیکھا تھا جہاں اس قسم کی آزادی سے کام لیا جاتا تھا یہ مقامات تمام ایسی عورتوں سے بھرے رہتے تھے جن کے سر کے بالوں میں ڈوری بندھی ہوتی تھی۔ یہ گویا علامت تھی اس امر کی کہ ایسی عورت آزاد ہے، جب کوئی عورت اس مقررہ مقام میں داخل ہو جاتی تھی تو جب تک وہ اپنا فرض ادا نہ کر لیتی تھی اُسے باہر جانے کی اجازت نہ ملتی تھی اور جو رقم وصول کرتی اُسے دیوی پر چڑھا دیا جاتا تھا، بعض عورتیں جو بدصورت ہوتی تھیں انھیں کوئی خریدار نہ ملنے کے باعث تین تین سال تک مندر کے احاطہ میں پڑا رہنا پڑتا تھا لیکن جو عورت نوجوان خاندانی اور خوبصورت ہوتی تھی اُس کو چند منٹ سے زیادہ انتظار کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس عجیب و غریب رسم کا حال بارو خ نبی نے بھی بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اسوقت اس کا رواج اسقدر بڑھ گیا تھا کہ روز

کی گفتگو میں جب کوئی عورت اپنی ہمسائی کو طعن دیتی تو کہتی تھی کہ "تو اس قابل نہ تھی کہ تیرے کمربند پر ہاتھ ڈالا جاتا"۔ اسی قسم کا حال یونانی مؤرخ و سیاح استرابو (Strabo) نے بھی لکھا ہے اور دیگر مؤرخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکندر اعظم کے زمانہ میں اس قسم کی فحاشی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔"

کلدانیہ میں جس دیوی کا نام مائلتا تھا وہی دیوی فنیقیہ۔ شام و قرطاجنہ میں استار کہلاتی تھی۔ یعنی صرف نام کا فرق تھا ورنہ ہر جگہ یہی تمام باتیں پائی جاتی تھیں اور یہی فواحش ہر جگہ نظر آتے تھے۔

اسی قسم کی باتیں لیجیون اور ان کے جانشین قدیم ایرانیوں میں بھی جاری تھیں، ان کے ہاں عشق و محبت کی دیوی کا نام مترا تھا۔ اس دیوی کے تہواروں میں بے حد فحش ہوتا تھا۔

بابل میں جو معبد اس کے لیے مخصوص تھا اسے بیت شجاچو (Bit shagacho) یعنی "مقام وصل" کہتے تھے۔ بابل کے متعلق دیودورس سیقولس نے لکھا ہے کہ:۔

"ملک کی ہر عورت کا فرض ہے کہ وہ تمام عمر میں کم از کم ایک دفعہ دیوی کے معبد میں جائے اور کسی اجنبی سے مواصلت چاہے۔ بہت سی عورتیں جو دولتمند اور عالی خاندان ہوتی ہیں وہ پردہ کی گاڑیوں میں بیٹھ کر

آتی ہیں لیکن زیادہ تر عورتیں یہ کرتی ہیں کہ سر کے بالوں پر چاند نظر
قلادہ سا باندھکر بیٹھ جاتی ہیں اور اس طرح کی عورتیں کثرت سے
آتی جاتی رہتی ہیں۔ میدان میں ہر طرف سیدھے راستے بنا دیے جاتے
ہیں جہاں عورتیں موجود رہتی ہیں۔ اجنبی مرد انھیں راستوں سے گزرتے
ہیں اور انتخاب کرتے ہیں۔ جو عورت ایک مرتبہ معبد میں جا بیٹھتی ہے وہ
اسوقت تک وہاں سے نہیں جا سکتی جبتک وہ اپنے مقصد کو نہ حاصل
کرلے یعنی جب تک مرد، ان کی گود میں سکہ ڈال کر ان سے ملتفت نہ ہولے جو
مرد کسی عورت کی گود میں سکہ ڈالتا ہے اسے یہ الفاظ کہنے پڑتے ہیں: "میری
دعا ہے کہ مائلیتا دیوی تجھ پر اپنا فضل و کرم کرے" (یہ دیوی وہی ہے جسے
یونانیوں میں وینس کہتے ہیں) سکہ جو عورت کی گود میں ڈالا جاتا ہے وہ
خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو لیکن عورت اس کے لینے سے انکار نہیں کر سکتی سکہ
لینے اور دیوی پر چڑھانے کے بعد وہ عورت اپنے خریدار کے ساتھ مندر سے
باہر چلی جاتی ہے جو عورت جمیل اور متناسب الاعضاء ہوتی ہے اس کا خریدار
بہت جلد پیدا ہو جاتا ہے لیکن جو بدصورت ہوتی ہے اسے بعض اوقات
برسوں تک مندر ہی میں پڑا رہنا پڑتا ہے"۔

اول اول مصر میں اس قسم کی فحاشی کا رواج نہ تھا لیکن کلدانیوں اور
دوسری مشرقی قوموں نے یہ مشغلہ وہاں بھی رائج کر دیا اور نہایت شدت کو پہنچا!

استرابو نے لکھا ہے کہ مصر کے بڑے بت کے لیے پجاری حسین ترین لڑکیاں پسند کیا کرتے تھے جو مندر میں کچھ دنوں خدمت کرنے کے بعد شادی بھی کر سکتی تھیں۔

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر ٹامنڈ ووپرا کرے تحریر کرتے ہیں کہ :-

"مصر میں نوجوان عورتوں اور مردوں کو عیش نشاط کے جملہ اسرار سے آگاہ کر دیا جاتا تھا اور مرد عورت باہم مل کر مندر کے اُن راستوں سے گزرتے تھے جو بالکل سنسان اور زمین دوز تھے۔ ہیرو ڈوٹس نے لکھا ہے کہ پو بسٹیز میں ہر سال آئسس دیوی کا جو میلہ ہوتا تھا اس میں سات لاکھ جاتریوں کو عشق و محبت کے اسرار سے آگاہ کیا جاتا تھا اور چونکہ اس "عشق آموزی" یا اُپدیش دینے کا اختیار صرف پجاریوں کو حاصل تھا اس لیے تمام آمدنی وہی آپس میں تقسیم کر لیا کرتے تھے۔"

بعض فرقوں میں اب بھی یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں دیوتا لڑکیوں سے اور دیویاں مردوں سے ملتفت ہو جاتی تھیں اسی طرح اب بھی ہو سکتا ہے مصر قدیم کے شہر تھیبیا (Thebes) کی نسبت ہیرو ڈوٹس نے لکھا ہے کہ :-

"وہاں ہر رات ایک عورت مندر میں پلنگ پر ٹنگا کر اونچی لٹکا دی جاتی تھی اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ رات کو کسی وقت دیوتا آئے گا اور اس سے ملتفت ہوگا۔ اسی طرح ملک لیسیا کے شہر پتارہ میں یہ رواج تھا کہ کسی جوان لڑکی کو دیوتا کے مندر میں بند کر کے قفل لگا دیا جاتا تھا قطب شمالی کی

رہنے والی اسکیمو قوم میں اگرچہ لنگ پوجا تو نہیں پائی جاتی لیکن بعض
تہواروں کے موقع پر ان کے ہاں فحاشی ضرور ہوتی ہے۔ شمالی امریکہ
کے دیگر قبائل میں سورج دیوتا کا جو سالانہ تہوار ہوتا تھا اس کی رسمیں
عجیب و غریب طریقہ پر ادا کی جاتی تھیں یعنی ایک شوہر دار عورت
ننگی ہو کر زمین پر لیٹ جاتی تھی اور اپنا نفس دیوتا کے سامنے پیش کر دیتی
تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دیوتا کا ایک انسانی نمائندہ عورت کی اس پیشکش
کو قبول کر لیتا تھا۔ اسی طرح ملک نکاراگوا کے قدیم باشندے اور
امریکہ کی ناچیز قوم فصل بہار کے زمانے میں ایک دن کے لیے اپنی
عورتوں کو ہر قسم کی آزادی دیدیتی تھی۔"

وسطی امریکہ کی پیپائل قوم کو انکے مقتدایان دین یہ ہدایت کیا کرتے تھے
کہ اگر عمدہ فصلوں کے پیدا ہونے کی تمنا ہو تو کھیت کے مالک کو لازم ہے کہ وہ اور
اسکی بیوی تخم ریزی کے زمانہ میں چند روز تک ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں اور جب
تخم ریزی سے فرصت ہو جائے تو ایام مقررہ گزرنے کے بعد پورے جوش کے ساتھ
عیش و نشاط میں مصروف ہو جائیں بعض مقامات میں اسکے لیے خاص آدمی مقرر کیے
جاتے تھے۔ جزیرہ قبرص میں بمقام پافاس اور ملک شام میں بمقام بابلوس فحاشی
بہت بڑھی ہوئی تھی مشہور یونانی جغرافیہ داں استرابو نے ایشیائے کوچک کے
شہر الطاکیہ کی نسبت بیان کیا ہے کہ یہاں کے معبدوں میں ہزارہا عورتیں رہتی تھیں

اور حد درجہ آزادی کے ساتھ داد عیش دی جاتی تھی۔

بحیرۂ روم کے مشرقی سواحل پر جتنے ملک تھے ان میں وسعت کے ساتھ "دیوی ماتا" کا مذہب جاری تھا۔ جزیرۂ کریٹ میں "دیوی ماتا" کے سوا کسی دوسرے دیوتا کا ثبت تھا ہی نہیں اور ملک فریجیہ میں بھی ایک بڑی دیوی "دیوتاؤں کی ماتا" کے نام سے پوجی جاتی تھی اور لوگ نہایت عقیدتمندی سے اسکے عضو جنسی کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اسی طرح قدیم یونانیوں میں دیمتر نام کی ایک دیوی تھی جو دراصل "دیوماتری" یعنی "دیوتاؤں کی ماتا" تھی۔ الغرض تمام مہذب و متمدن ممالک میں ایک ہی دیوی مختلف ناموں سے پوجی جاتی تھی جس کے نام الیشتار، استارتھ، سائیبلا، دیمتر، آئسیس، افرودیتہ تھے اور انکے معبد میں انتہا درجہ کی فحاشی ہوتی تھی۔ شہر الیفی سوس میں ڈیانا دیوی کا مشہور بت بالکل برہنہ ہی بنایا جاتا تھا اور پافوس میں سیکڑوں عورتیں افرودیتہ کے نام سے دنیا بھر کے مردوں کی خواہشات پوری کرتی تھیں۔ اسی طرح اسکندریہ، سلوکیس، پیسی نوس وغیرہ میں ہر جگہ یہ تمام حرکات ناشائستہ پائے جاتے تھے اور انسانی زندگی خواہش نفسانی کے لیے وقف تھی۔

تھسموفوریا کے نام سے دیمتر دیوی کا ایک تہوار ہوتا تھا جس میں عورتیں آٹے کا عضو جنسی بناتی تھیں اور اسکے ساتھ فحش مذاق کرتی ہوئی نکلتی تھیں لیکن ان کے جلوس میں کسی مرد کو شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ یہی حال سالوہ تہوار

میں ہوتا تھا اور سایپرا اکپوزس میں یہ رواج تھا کہ جب تھسموفوریا کا تہوار آتا تھا
تو زنانہ شکل کی میٹھی روٹیاں پکا کر دیوی کے استھان پر چڑھائی جاتی تھیں
قدیم رُمیوں میں باخوس، لائبر پریاپس اور وینس کی پرستش ہوا کرتی تھی جن کا
تعلق عشق و محبت سے تھا، اول الذکر دیوتا کا تعلق شراب خواریوں اور
بدمستیوں سے تھا۔ دوسرا دیوتا وہی ہے جس کے نام سے انگریزی لفظ
([illegible]) یعنی عیاش یا شہوت پرست نکلا ہے۔ وینس عشق و محبت
اور عیش و عشرت کی دیوی تھی۔

پریاپس کا بُت برہنہ بنایا جاتا تھا اور جن لڑکیوں کی شادی ہونے والی
ہوتی تھی۔ یا جو عورتیں بانجھ ہوتی تھیں وہ اس بُت کے عضو پر گھوڑے کی طرح ادھر
اُدھر ٹانگیں کر کے بیٹھ جاتی تھیں اور پھول چڑھاتی تھیں۔ سالانہ تہوار کے دن
اس بُت کو رتھ میں بٹھا کر عورتیں گاتی ہوئی بصورت جلوس نکلتی تھیں۔

جب وینس کا تہوار ہوتا تھا تو پریاپس کے بُت کو مندر میں پہنچایا جاتا
اور وینس کے ساتھ اس کو ملا دیا جاتا۔ سالانہ تہواروں کے موقع پر میٹھی ٹکیاں
پکائی جاتی تھیں۔ جن پر اعضاءِ جنسی کی صورت کے ٹھپے لگا کر نئی دلہنوں
اور شادی شدہ عورتوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

یہ حالت تو قدیم زمانہ کی تھی لیکن تماشا یہ ہے کہ بلاد یورپ میں دینِ
مسیح کی اشاعت کے بعد بھی یہی فحاشیاں بدستور جاری رہیں جس شہر کا نام

کسی زمانہ میں پافوس تھا وہ اب کوکلیا کہلاتا ہے سنہ ۱۸۹۶ء میں ایک انگریزی سیاح مسٹر ڈی۔ جی۔ ہوگرتھ نے لکھا ہے کہ :۔

"اس علاقہ کے کسان ہر سال ایک روز افرودیتہ دیوی کے تباہ شدہ مندر میں محراب کے وسطی پتھر پر تیل لگاتے ہیں اور پتھروں میں جو سوراخ ہوتے ہیں وہاں لغو حرکات کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اس عمل سے ان کی بیویوں کا بانجھ پن جاتا رہتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کی پوجا میں عیسائی بھی شریک ہوتے ہیں۔"

امریکہ کا سیاح جوزف میک کیب لکھتا ہے کہ :۔

"میں نے سنہ ۱۹۰۶ء میں ویزہ (قدیم پایہ تخت ملک تھریس) کے گرد و نواح میں یونانی عیسائیوں کو دیکھا کہ وہ ہر سال ایک مذہبی ڈرامہ کھیلتے ہیں جس میں خاص ایکٹر کے پاس ایک بہت بڑا چوبیں عضو ہوتا ہے یہ شخص لڑکیوں کو پکڑنے دوڑتا ہے اور جس کو پکڑ لیتا ہے گویا اس سے شادی ہو جاتی ہے۔ بعد ازاں وہ مرد اور لڑکی نہایت فحش طریقے سے باہم حرکت کرتے ہوئے بازاروں میں نکلتے ہیں اور چندہ جمع کرتے ہیں الغرض یہ تہوار انتہائی سیاہ مستیوں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اسی طرح ناروے اور سویڈن کے عام کھیل تماشوں میں اس قسم کی حرکات کی جاتی ہیں۔"

انگلینڈ میں ایک عورت کا بت جو اپنے خاص حصہ جسم کی طرف اشارہ

کرتی ہوئی دکھائی جاتی تھی۔ گرجا کے صدر دروازہ میں محراب کے وسطی پتھر کے بجائے نصب کرتے تھے کہ شیاطین داخل نہ ہوں۔ اس کو قلطی زبان میں شیلانہ جگ کہتے تھے۔ ایسا ہی ایک پتھر چند سال گزرے ملک کارک کے گرجا کے صدر دروازہ میں نصب تھا، دوسرا پتھر شہر ڈبلن میں رائل آئرش اکاڈمی کے اندر پایا جاتا ہے اسی قسم کی اور تصویریں برطانیہ اور اسپین کے گرجاؤں میں بھی تھیں لیکن اصلاح مذہب کے زمانہ میں اس طرح کے بت توڑ دیے گئے۔

ڈاکٹر بالفورڈ نے لکھا ہے کہ:۔

"اس قسم کی ایک تصویر ہیرفورڈ شائر اور دوسری کارنوال میں ابتک موجود ہے۔ انگلستان کے بعض حصوں میں اس شکل کے پتھر ابھی تک کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ دورسٹ شائر میں ایک پتھر چار فٹ لمبا موجود ہے جو بالکل اصل کے مطابق ہے۔ اسی ملک میں ٹرینڈیل کی پہاڑی پر زمین کھود کر ۱۸۰ فٹ لمبی ایک یونانی تصویر بنائی گئی ہے جسے سرنی دیو کہتے ہیں یہ بت بالکل عریاں ہے اور ہر سات برس کے بعد اس کو صاف کیا جاتا ہے"

اطالیہ کے ملک ابروزائی میں بمقام آئسرنیا ہر سال سینٹ کاسماس اور سینٹ دانیال کے میلے ہوا کرتے تھے۔ ان میں شریک ہونے کے لیے بانجھ عورتیں اور اعضاء جنسی کی بیماریوں کے مریض دور دور سے آتے تھے، دکانیں موم کے بنے ہوئے اعضاء سے بھری ہوتی تھیں اور بانجھ عورتیں انھیں خرید کر گرجا میں چڑھاتی

تھیں۔ امراض خبیثہ کے مریض ننگے ہو کر پادریوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے اور وہ متبرک تیل لگاتے تھے جب پیروں والیٹر نے ان کا بُری طرح مضحکہ اڑایا تو مجبور ہو کر ۱۷۸۰ء میں پاپائے اعظم کے ایک فرمان کے ذریعہ سے یہ مراسم بند کرا دیے گئے۔

الاتری میں جو روما سے اور بھی زیادہ قریب ہے، مکانات کی دیواروں پر اعضائے جنسی کی تصویریں کھنچی ہوئی موجود ہیں جو غالباً پہلے زمانہ میں تمام اطالیہ کے اندر عام طور سے پائی جاتی تھیں۔ مگر اب یہ رسم ہو گئی ہے کہ ایسٹر سنڈے کو لوگ جا کر ان تصویروں پر کنکریاں مارتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جو عورتیں اس سنگ باری میں شریک ہوتی ہیں ان کے گلوں میں سونے کے بنے ہوئے اعضائے جنسی پڑے ہوتے ہیں جن کی صورت عام طور پر ایسی ہوتی ہے گویا کسی شخص کی مٹھی بند ہے اور انگوٹھا انگلیوں کے درمیان دبا ہوا کسی قدر باہر نکلا ہوا ہے، اس زیور کو عام طور پر دیہاتی پہنتے ہیں اور اس کا نام فیکو ہے۔ روما کے پورٹشائی عجائب خانہ میں قربانگاہ کا ایک ظرف ہے جس میں ایک عورت کی تصویر اس طرح کھدی ہوئی ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں میں مردانہ عضو لیے ہوئے ہے۔ مقام ترانی میں چند سال پیشتر تک کارنیوال کے موقع پر ایک عُریاں بُت نکالا جاتا تھا جس کا نام "مقدس عضو" تھا۔

۱۵۸۵ء میں جب پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگوں نے امبروم فتح کیا تو انھوں نے تبرکات میں ایک دلچسپ چیز پائی جسکو بانجھ عورتوں نے شراب

ملتے ملتے سُرخ کر دیا تھا۔ یہ وہ چیز تھی جسے لا معلوم زمانہ سے پادری لوگ فوتین راہب کا عضو بتایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ راہب شہر لاینس کا اولین پادری تھا اور تمام علاقہ اسکا بیحد معتقد تھا اور ہر جگہ اسکے مخصوص حصہ جسم کے مومی نمونے پائے جاتے تھے۔

جنوبی فرانس میں گرجاؤں کے اندر موم کے بنے ہوئے اعضا رجھوپل میں لٹکا کرتے تھے میٹھی ٹکیاں جن پر اعضا رجنسی کا نشان بنا ہوتا تھا بکثرت فروخت ہوتی تھیں، پرانے زمانے کے جو پتھر کہیں کہیں نصب تھے وہاں بانجھ عورتیں جا کر اپنا جسم اُس سے مس کرتی تھیں۔

اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یہ بھی سننے کے قابل ہے کہ راہب فوتین کون بزرگ تھے۔ درحقیقت یہ ایک عریاں بُت تھا جسکے معتقدین کی بہت کثرت تھی۔ جب مسیحیت کا دور شروع ہوا تو پادریوں اور راہبوں نے دیکھا کہ اگر یہ بُت توڑ دیا گیا تو عوام کو ناگوار گزرے گا اور آمدنی کا ایک معقول ذریعہ ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اسلیے انھوں نے یہ چالاکی کی کہ اس بُت کو اصطباغ دیکر عیسائی بنا لیا اور اس کے متعلق یہ روایت گڑھی کہ یہ کسی وقت بڑا زبردست ولی گزرا ہے۔

سینٹ گزر، گینی میں، سینٹ گالز، انجوپیں اور سینٹ رینی سب اسی قسم کی فرضی ہستیاں تھیں۔ ایک بزرگ اور بھی تھے جنکا اسم مبارک سینٹ آرنوذ تھا۔ لیکن اس کے بُت پر کپڑا پڑا رہتا تھا۔ جو صرف بانجھ عورتوں کے لیے اٹھایا

جاتا تھا۔ آرنیچ میں سینٹ پوٹر ڈیبیس کے گرجا کے اندر ایک چوبی عضو تھا جس پر چمڑا منڈھا رہتا تھا۔ لوگ اسکی پوجا بہ کثرت کرتے تھے۔ بائیبل میں جو روایات اس قسم کی فحاشی کی درج ہیں انکو ہم یہاں درج نہیں کرتے۔ شخص انھیں دیکھ سکتا ہے۔ قدیم زمانہ کے عبرانیوں میں یہ رواج تھا کہ جب وہ حلف اٹھاتے تھے تو زور دینے کیلیے اپنے عضو پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے تھے کیونکہ عضو مخصوص تمام جسم میں نازک ہونے کے علاوہ ایسی چیز بھی ہے جس پر انسان کی نسل کا انحصار ہے اور اپنی اولاد بہت زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ قدیم زمانہ کے لوگوں کے نزدیک یہ عضو افزائش نسل کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ مثلاً کتاب پیدائش کے باب ۲۴ آیت ۲ میں ابرہام اپنے سب سے مسن نوکر کو طلب کر کے کہتا ہے :-

"میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو اپنا ہاتھ ران کے تلے رکھ اور میں تجھ سے خداوند کی جو آسمان کا خدا ہے اور زمین کا خدا ہے قسم لوں گا۔"

اسی طرح اسرائیل نے کتاب پیدائش کے باب ۴۷ میں یوسف کو حلف دیتے ہوئے کہا ہے :-

"اور جب اسرائیل کے مرنے کا وقت پہنچا تب اس نے اپنے بیٹے یوسف کو بلا کر اس سے کہا کہ اب جو میں نے تیری نظر میں مہربانی پائی تو اپنا ہاتھ میری ران تلے رکھ اور مہربانی اور صداقت کا سلوک میرے ساتھ کر مجھ کو مصر میں نہ گاڑنا، میں اپنے باپ دادا کے پاس سوؤں گا، تو مجھے مصر

سے باہر لے جا اور ان کے گورستان میں گاڑ دے"

بائبل کی ان آیات میں "ران تلے" کے جو الفاظ آئے ہیں ان سے مراد انثیین ہیں۔ کیونکہ عبرانیوں میں سب سے زیادہ پختہ حلف وہ ہوتا تھا جو خصیتین پر ہاتھ رکھ کر لیا جاتا تھا۔ واضح ہو کہ بائبل کے دو حصے ہیں ایک (Old Testament) یعنی عہد نامہ عتیق اور دوسرا (New Testament) یعنی عہد نامہ جدید اور (Testimony) شہادت اور (Testament) (معاہدہ) کا مادہ بھی وہی ہے جو (Testicles) (خصیتین) کا ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد و پیمان یا حلف کے باب میں خصیتین کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔

قدیم مصریوں میں بھی یہی رواج تھا کہ جب وہ قسم کھاتے تھے تو اپنے عضو کو اوپر اٹھا دیتے تھے۔

مذہبی فحاشیوں کی مرموز علامتیں گزشتہ بیان سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اعضاء جنسی کا تقدس یعنی قدرت کے قوائے تخلیقیہ کی پرستش انسان قدیم کے ادارہ مذہبی میں داخل تھی اور اب بھی بعض قوموں میں کسی نہ کسی صورت سے اسکا رواج چلا آرہا ہے۔ جو قومیں ترقی کر کے اپنے قدیم مراسم کو ترک کر چکی ہیں گو انکے ہاں براہ راست اس قسم کی پرستش نہیں ہوتی لیکن پھر بھی بہت سی علامات انکی معاشرت تہذیب اور موجودہ طریق عبادت میں ایسی نظر آتی ہیں

جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی وقت انکے ہاں یہ مخصوص پرستش ضرور پائی جاتی تھی۔

قدیم ترین اقوام و ملل میں تولید و تناسل ایک طرح کا مقدس فعل سمجھا جاتا تھا اسی لئے اعضاء جنسی کی علامتیں اور صورتیں بالکل نمایاں طور پر بنائی جاتی تھیں۔ چنانچہ اب بھی بیشمار باقیات قدیم زمانہ کے ایسے پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس طرح کی پرستش کا عقیدہ پہلے بہت عام تھا، بعد کو امتداد زمانہ کے ساتھ جب اُن علامتوں سے حجاب آنے لگا تو ان میں تغیر و تبدل کیا گیا اور آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ انسان رفتہ رفتہ ان کی کھلی ہوئی پرستش سے منحرف ہو کر رموز علامتوں سے کام لینے لگا۔ اس زمانہ میں بھی اگر اُن قوموں کی معاشرتی رسموں اور قدیم روایات پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی روز کی زندگی میں پوشیدہ یا علانیہ متعدد علامتیں اس طریق عبادت کی پائی جاتی ہیں۔

قدیم مصریوں، فینیقیوں، پومپیائی والوں، یونانیوں اور بہت سی ایشیائی اقوام و ملل میں چونکہ مقدس مباشرت کا رواج بہت تھا اس لئے اعضاء جنسی کی پرستش بھی بکثرت پائی جاتی تھی، چنانچہ اُنکے کھنڈروں سے انکی حجری شکلیں کثرت سے برآمد ہوئی ہیں اور اب بھی اُنکے عبادتخانوں میں اس قسم کی علامتیں یا صورتیں اکثر و بیشتر نظر آتی ہیں۔ کھیم[۵] مصر قدیم کا نہایت مشہور دیوتا تھا اور اس سے

سے[۵] غالباً کھیم یا کا متف وہی دیوتا ہے جسے ہندوؤں کے یہاں "کام دیو" کہتے ہیں اور جو عشق و محبت یا تعلق جنسی کا دیوتا مانا جاتا ہے۔

جذبات محبت یا جذبات نفسانی منسوب کیے جاتے تھے۔ اس کے متعلق رالنس نے اپنی تاریخ مصر قدیم میں لکھا ہے کہ :۔

"اس کو حد درجہ فحش و حیا سوز صورتوں میں دکھایا جاتا تھا"

زمانہ حال کے بعض ماہرین مصریات اسکی عُریانی پر تاویلات کا پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسکی شرم انگیز عریانی کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی اور نہ عقل انسانی باور کر سکتی ہے کہ ایسے دیوتا کی پرستش کا اخلاق انسانی پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے قدیم اہل مصر کا خیال تھا کہ کھیم قدرت کے قوائے تخلیقیہ کا مظہر ہے اور اسکا بت دیکھنے سے لوگوں میں انس قانون قدرت پر عمل کرنے کی تحریک ہوتی ہے جس کے ماتحت موالید ثلاثہ اپنا ہم جنس پیدا کرتے ہیں جس طرح قدیم یونان میں پان بُت کے سلسلہ پرستش میں صدہا قسم کی ناپاک رسمیں داخل مذہب ہو گئی تھیں اسی طرح مصر میں بھی کھیم کی پرستش کے سلسلہ میں سیکڑوں حرکات ناشائستہ سرزد ہوتی تھیں اور اس مقدس دیوتا کا بت مع تمام اعضاء کے عُریاں بنایا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اس میں بکرے کی تمام خصوصیات شہوانی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس کے مندر میں ایک بکرا بھی رکھا جاتا تھا جس کا نام کامتف تھا۔ ہر چند قدیم زمانہ کے لوگوں میں یہ رواج عام تھا وہ اعضائے جنسی کی تصویر چاندی یا تانبہ کی تختی پر کھدوا کر بطور تعویذ یا طلسم گلے میں ڈالے رہتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ اس تعویذ یا طلسم کے اثر سے اولاد زیادہ ہو گی لیکن اس زمانہ کی عورتیں بھی بعض ایسے زیور استعمال کرتی ہیں جو حقیقتاً اعضا

جنسی ہی کی مرموز صورتیں ہیں، لیکن انھیں اس کا علم نہیں۔ ذیل میں ہم ان بعض رموز و اشکال کا ذکر کرتے ہیں جن کا تعلق حقیقتاً انھیں اعضا سے ہے اور لوگ اس کی اصلیت سے ناواقف ہیں۔

صلیب | صلیب کا تعلق عموماً عیسائی مذہب سے سمجھا جاتا ہے اور عیسائی اس کو اپنے مذہب کی خاص علامت سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح عیسائیوں کی بہت سی مذہبی رسمیں، بجنسہ یا کسی قدر تغیر و تبدل کے ساتھ قدیم مذاہب سے لی گئی ہیں، اسی طرح صلیب بھی ان میں آئی، غالباً یہ سن کر حیرت ہوگی کہ صلیب مسیح سے صدیوں قبل مصر قدیم میں مردانہ آلۂ جنسی کی مرموز شکل تھی، جیسا کہ وہاں کے آثار قدیمہ سے ثابت ہوتا ہے اور ہندوستان میں بھی صلیب کا نشان اسی معنی میں استعمال ہوتا تھا اور اب تک ہوتا ہے۔ چنانچہ ڈیون پورٹ لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کا "لنگم"، یونانیوں کا "فلس"، رومیوں کا "پریاپس" اور عیسائیوں کی "صلیب"، جسے وہ "حیات ابدی" کی نشانی سمجھتے ہیں درحقیقت ایک ہی چیز ہیں اور ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں ہیں قدیم مصر میں "T" وضع کی صلیب مسیحیت سے صدیوں پیشتر قوائے تخلیق کی علامت سمجھی جاتی تھی اور چونکہ اسی قوت کے ذریعہ سے دنیا کا سلسلۂ تخلیق جاری رہتا ہے اسی لیے غالباً عیسائیوں نے صلیب کو "حیات ابدی" کا نشان قرار دیا۔ تمام بڑے بڑے عجائب خانوں میں (مثلاً مٹروپولٹن میوزیم

نیو یارک برٹش میوزیم (لندن) یا لودرے (پیرس) شعبۂ مصریات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس عہد میں اعضاء جنسی کو ظاہر کرنے کے لیے کنایتہً بہت سی چیزوں سے کام لیا جاتا تھا اور انھیں میں سے ایک شکل "T" تھی لیکن اگر اس کو دستہ دار صلیب یعنی اس شکل + میں ظاہر کرتے تھے تو اس سے دونوں جنس کے اعضاء کا اتصال مقصود ہوتا تھا چنانچہ وادی الفیل (ملک مصر) کے آثار قدیمہ کی سیر کرنے سے آپ کو وہاں کے در و دیوار پر "تاؤ" (T) کی ہزار ہا صورتیں کھنچی ہوئی یا کھدی ہوئی نظر آئیں گی حتی کہ بعض بعض دیوتاؤں کے ہاتھ میں بھی "تاؤ" (T) ہوگا۔

دستہ دار صلیب کو قدیم کلدانیوں اور فینیقیوں میں بھی بہ نگاہ تقدس و احترام دیکھا جاتا تھا۔ تاؤ وضع کی صلیب کا استعمال مسیحیت سے پیشتر آئرلینڈ میں بھی پایا جاتا تھا اور قدیم میکسیکانیوں میں بھی اس وضع کی صلیب کے مختلف نام تھے مثلاً :- "شجرۃ الحیات"، "شجرۃ القوۃ" اور "شجرۃ اللحم"۔ قدیم حبش میں جو شکل تاؤ کی بنائی جاتی تھی وہ عام مسیحی صلیب کی طرح تھی۔ مسز کیز بتھ ای گولڈ اسمتھ نے قدامت صلیب کے متعلق تحریر کیا ہے کہ :-

"صلیب بہت قدیم زمانہ سے استعمال ہوتی چلی آئی ہے اور مختلف اقوام و ملل میں ایک مذہبی نشان تصور کی جاتی ہے۔ تمدن انسانی کے ہر درجہ میں یہ چیز موجود رہی ہے۔ امریکہ کی ایک قوم جس کا نام

"انکا" ہی صلیب کا بہت زیادہ احترام کرتی ہے۔ بیٹا گونیا کے قدیم
باشندے صلیب کا نشان اپنی پیشانیوں پہ گود لیتے ہیں۔ قدیم انگلستان کے
ڈروئڈ لوگ اسکی پوجا کیا کرتے تھے اور عیسائیوں کے نزدیک تو یہ حیات ابدی
کا نشان ہے۔ الغرض زندگی کا خیال صلیب کی علامت سے کبھی خالی نہیں رہا۔"

مسٹر سہلاپ تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"عیسائی دنیا میں گڈ فرائڈے کو جو صلیب نما میٹھی روٹی
کھائی جاتی ہے اور ایسٹر سنڈے کو جو رنگے ہوئے انڈے کھائے
جاتے ہیں یہ سب رسمیں قدیم کلدانیوں سے لی گئی ہیں جن کے نزدیک
چیزیں ایک خاص مذہبی حیثیت رکھتی تھیں۔ میٹھی روٹیاں کلدانیوں
میں ملکہ فلک کی پوجا کے نذر کھائی جاتی تھیں جس کا نام "ایسٹر دیوی"
یا الیشتار یا استارتہ تھا اور یہ تمام باتیں اسوقت بھی پائی جاتی
تھیں جب سیکراپس نے یونان کے دارالحکومت شہر ایتھنز کی بنیاد قائم
کی تھی۔"

مثلث | یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ عیسائیوں میں تثلیث کا
خیال کیونکر آیا۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مثلث قدیم زمانہ میں ایک متبرک
نشان سمجھا جاتا تھا اور اعضاء جنسی کی مرموز شکل متصور ہوتا تھا اگر اس کی
چوٹی نیچے ہوتی جیسے ▽ تو وہ نسائی عضو کی علامت سمجھا جاتا تھا اور

اگر اس کی چوٹی اوپر ہوتی جیسے △ تو اُسے مردانہ عضو کی نشانی سمجھتے
اور دو مثلثوں کے میل سے جو چھ کونوں کا ستارہ بنتا ہے جیسے ✡ تو
اس کو دونوں جسم کے اعضاء کا اتصال سمجھا جاتا تھا۔ یہودیوں کے تمام
معابد میں اس قسم کے ستارے ✡ بکثرت دیکھنے میں آتے تھے اور
انکی اصطلاح میں مہر سلیمانی[1] کہتے تھے، قدیم عبرانیوں میں مثلث کی شکل
زمین کے قوائے تخلیقیہ کی علامت سمجھی جاتی تھی۔"

چینیوں میں قدرت کی تخلیقی قوتیں دو سمجھی جاتی ہیں۔ ایک کا نام "یانگ" ہے جو مذکر قوت ہے۔ دوسری کا نام "یین" ہے یعنی قوت مؤنث چینیوں کے عقیدے میں انھیں دونوں قوتوں کے اتصال باہمی سے ایک تیسری جداگانہ چیز پیدا ہوتی ہے جسے "جان" کہتے ہیں چینی مذہب میں تثلیث کے اجزاء آسمان، یانگ اور یین ہیں۔ ان کے عقیدے میں انہی چیزوں کے ملنے سے "قوت خلاق" پیدا ہوتی ہے۔ اس قوت کو ان کی اصطلاح میں "اتحاد قوائے ثلاثہ" بھی کہتے ہیں۔ بہت سی قدیم قوموں میں بجائے مثلث کے ترسول کا نشان ہوتا ہے جو ان کے نزدیک مختلف قوموں کے اتحاد کا مظہر متصور ہوتا تھا مثلاً کسی کے نزدیک آسمان، زمین اور پانی کسی کے نزدیک

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ بعض تعویذوں کو نقش سلیمانی کہنا اسی بنا پر ہے۔ کیونکہ وہ تعویذ بھی تقریباً اسی طرح کے بنائے جاتے ہیں۔

آتش آب ہوا کسی کے نزدیک شمس، قمر اور زہرہ۔ پیروان زردشت کے نزدیک مثلث یا ترسول، آتش۔ نور اور ایثر (ایتھر) کا مظہر تھا اور عبرانیوں کے نزدیک آتش، نور اور ہوا (یا روح) کی علامت سمجھا جاتا تھا۔"

قدیم مصریوں میں یہ مندرجہ تین مورتوں سے منسوب کیا جاتا تھا (۱) دیوتا (۲) دیوی (۳) ان دونوں کا ثمرۂ اتصال یعنی بچہ، لیکن یہ تینوں تثلیث فی التوحید کی صورت میں ہوتے تھے اور اس تثلیث کے اظہار کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک حلقہ میں مثلث کھینچ دیا جاتا تھا جیسے اس کے معنی سیت ہورس اور شیو تھے اور تینوں معبودوں کی تشریح یہ کی جاتی تھی کہ ہورس برسات ہے اور سیت خشک سالی اور شیو ہواؤں اور طوفانوں کا دیوتا ہے، شیو کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلا دیوتا تھا جس نے زمینوں سے آسمانوں کو بصورت مثلث پیدا کر کے بلند کیا اور اس کی تصویر بھی اس طرح دکھائی جاتی تھی کہ وہ ایک مثلث پر کھڑا ہوا ہے جس کے اندر سات زینے (یعنی سات آسمان) بنے ہوتے ہیں یہ دیوتا دوسرے جنگجو دیوتاؤں کے درمیان ثالث یا حکم کا کام کرتا تھا۔

ایک تشریح مصری تثلیث کی یہ بھی تھی کہ نوت آسمان کا دیوتا ہے سیب زمین کی دیوی ہے اور شیو فضا کا دیوتا ہے۔ لیکن قدیم مصریوں کی سب سے زیادہ مشہور تثلیث اوسیریز، آئسس اور ان کے بیٹے ہورس پر مشتمل تھی

اور اسی تثلیث سے غالباً مسیحی تثلیث لی گئی ہے جس کا مفہوم انکے یہاں باپ بیٹا اور روح القدس ہے۔ لیکن ان تمام "مثلثات" کی اصل وہی اعضائے جنسی یا قوائے شہوانی کی تعبیر ہے جو وجود حیات کا باعث ہیں۔

مچھلی

ڈاکٹر فرائڈ اور دیگر ماہرین نفسیات نے لکھا ہے کہ مچھلی بھی قدیم اقوام و ملل میں عضو جنسی کی علامت سمجھی جاتی تھی اور ایک مقدس چیز سمجھ کر اسکی پرستش کی جاتی تھی، چنانچہ بودھوں، مصریوں، بابلیوں، آشوریوں اور فنیقیوں کی مقدس سنگتراشی میں مچھلی کی شکلیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ جیسے

دو مچھلیاں اگر اس طرح بنائی جائیں کہ ایک کی دُم دوسرے کے سر ملی ہو جیسے  اور اس پر بجائے انجیر کا پتّہ ہو تو اسے عورت کا عضو جنسی سمجھا جاتا تھا۔ مصریوں میں جب آئسس دیوی کی تصویر بنائی جاتی تھی تو اس کی گود میں اس کا بچہ ہورس بھی بناتے تھے لیکن اسی کے ساتھ دیوی کے سر پر ایک مچھلی بھی بنا دی جاتی تھی۔

ہندوؤں کے بت اردھا ناری ایشوری کے سر پر بھی ایک بنت البحر یعنی جل کنیا کی صورت بنائی جاتی ہے یہ بت گویا برہما کا ہے اور اس حالت میں دکھایا جاتا ہے جب کہ وہ تکوین عالم کے کام میں مصروف تھا، اس کا داہنا حصہ مردانہ اور بایاں حصہ زنانہ ہے اور اعضائے جنسی کو دستہ دار صلیب کی صورت میں دکھایا جاتا ہے جو زنانہ و مردانہ اعضاء کے اتصال باہمی کی نشانی ہے۔ چونکہ مچھلی بسیار انڈے

بچے دیتی ہے اس لیے قدیم زمانہ کے لوگ اسے افزائش نسل کی دیوی سمجھتے تھے۔

بیضاوی یا اہلیلجی شکل

بیضاوی شکل ○ بھی ایک عام علامت ہے جس کے ذریعہ سے نسوانی عضو جنسی کو ظاہر کیا جاتا ہے بعض اوقات ایک مساوی تری چوگوشیہ شکل ◇ سے بھی یہی مفہوم ظاہر کیا جاتا ہے۔

ناظرین یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ گرجاؤں کی کھڑکیاں اور دروازے عموماً زنانہ عضو جنسی کی شکل کے بنائے جاتے ہیں بعض مذہبوں کے ماننے والے ایسے سوراخوں میں سے گزرتے ہیں جو پتھر میں بیضوی شکل کے بنائے جاتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ گویا وہ از سر نو پیدا ہوئے ہیں اور ایک نوزائیدہ بچے کی طرح معصوم ہیں۔

ڈاکٹر لی الگزینڈر اسوٹن نے گرجاؤں کی طرز تعمیر پر بحث کرتے ہوئے اس کی جنسی یا شہوانی نوعیت پر کافی روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:—

"جب کوئی شخص کسی گرجا میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایک دوہرے دروازے کے ذریعہ سے داخل ہوتا ہے جو بمنزلہ شفرہ کبیر (Labia Minora) کے ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس شخص کو ایک اور دوہرے دروازہ میں جانا پڑتا ہے جو بمنزلہ شفرہ صغیرہ (Labia Minora) کے ہے جب وہ اندر یعنی اندام اندرونی (Vagina) میں پہنچتا ہے تو اسے اپنے سامنے قربان گاہ یعنی رحم (Womb) نظر آتا ہے اور قربان گاہ کے دونوں طرف ایسے دروازے نظر آتے ہیں جو گویا نلے

(Fallopian Tubes) ہیں قربان گاہ میں اسے بپتسمہ دیا جاتا ہے یعنی رطوبت رحمی (Amniate Fluid) لگتی ہے اسکے بعد وہ گرجا سے باہر آتا ہے یعنی دوبارہ پیدا ہو کر باہر نکلا ہے۔ قرون وسطیٰ کے بہت سے گرجاؤں کے صدر دروازوں پر نسائی عضو جنسی کی تصویر نقش کر دی جاتی تھی اور اب بھی کلیسائے ڈبلین کی کھڑکی پر جس کی نسبت ہسکن نے لکھا ہے کہ وہ انگلستان بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے نسائی عضو کی تمام تفصیلات منقوش ہیں۔"

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں بھی یہ دستور تھا کہ جب ان کی کوئی اونٹنی مر جاتی تھی تو وہ اسکے اندام کو کاٹ کر مکان یا خیمہ کے دروازہ پر لٹکا دیتے تھے تاکہ خیر و برکت حاصل ہو، اسی طرح قرون وسطیٰ کے یورپ میں بھی یہ رواج تھا کہ وہ کسی مردہ گائے یا گھوڑی کا اندام نہانی کاٹ کر دروازہ پر آویزاں کر دیتے تھے مگر اب اسکی بجائے گھوڑے کے نعل کا استعمال ہونے لگا ہے جو عورت کے عضو جنسی کی نشانی ہے۔

سانپ

سانپ کو اکثر ممالک میں خواہشات نفسانی کا مکمل مظہر سمجھا گیا ہے اور کوئی مذہب دنیا کا ایسا نہیں ہے جس میں کسی صورت سے سانپ موجود نہ ہو۔ جذبات شہوانی کے علاوہ سانپ کو عقل و دانش کی علامت بھی سمجھا جاتا تھا اگر سانپ کی شکل اس طرح سے بنائی جائے کہ اس کی دُم اس کے منہ میں ہو جیسے



تو یہ اس کے غیر فانی ہونے کی علامت تھی۔ اسرائیلیات میں سانپ کو

جذبات شہوانی کی علامت قرار دیا گیا تھا اور سانپ کی شکل قدیم اقوام عالم میں اس معنی میں بکثرت استعمال ہوتی تھی۔ مثلاً قدیم یونانیوں میں جب طب یونانی کے ابوالآباء استقلیبوس اور اس کی بیٹی ہائجیہ کے بت بنائے جاتے تھے تو ان کے سروں پر ایک سانپ کی تصویر ضرور بنائی جاتی تھی۔

ڈاکٹر وال نے لکھا ہے کہ :-

"ہائجیہ نے ایک سانپ پال رکھا تھا جسے وہ دودھ پلایا کرتی تھی یہ سانپ مندر میں رہا کرتا تھا جس کی وہ پوجا کیا کرتی تھی، جب کوئی مریض مندر میں آکر علاج کا خواہاں ہوتا تو یہ اسے حکم دیتی کہ مندر میں جا کر شگون لے کہ مندر کا سانپ تمہاری دی ہوئی غذا کس طرح قبول کرتا ہے۔ وہ شخص مندر میں داخل ہو جاتا تھا۔ مندر کے اندر کی یہ حالت تھی کہ خوبصورت لڑکیوں کی بڑی تعداد وہاں رہتی تھی جو اس شخص کو ہر طرح سے لبھاتی تھیں اور آخر کار وہ شخص کسی نہ کسی کے قبضہ میں آ ہی جاتا تھا۔ پھر اگر وہ اس دعوت شباب سے پوری طرح فائدہ اٹھاتا، تو یہ حکم لگایا جاتا کہ شفا جلد ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ پھر سال مقررہ دن میں ایک دوشیزہ برہنہ حالت میں مندر کے اس مقام پر یہ غذا لے جاتی تھی جہاں سانپ پلے ہوئے تھے اگر سانپوں نے وہ خوراک جلد اور شوق سے کھا لی تو سمجھا جاتا تھا کہ یہ سال اچھا ہے ورنہ نہیں۔"

سانپ کی پرستش امریکہ کے قدیم آبادی میں بھی پائی جاتی تھی، چنانچہ اوہیو میں اب تک سانپوں کا ٹیلہ موجود ہے اور قوم ازتیق میں ناگ پوجا کی یادگاریں وہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں ناگ پوجا اور ناگ پنچمی سے ہر شخص واقف ہے۔ آدم و حوا اور جنت عدن کے قصہ میں جو سانپ کا ذکر آتا ہے اس کے متعلق قدیم مسیحیین مثلاً جسٹن۔ اگسٹائین۔ غریگوری وغیرہ کا عقیدہ یہ تھا کہ سانپ سے مقصود صرف جذبۂ شہوانی کا اظہار ہے۔ آئرلینڈ میں جب سینٹ پیٹرک نے مذہبی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا تو اس نے کوشش کی کہ ملک کے اندر سے سانپ نکلوا دیے جائیں کیونکہ وہاں قوائے تخلیقیہ کا اظہار سانپوں کی مورتوں سے کیا جاتا تھا۔

قدیم چین و جاپان کی روایات میں بھی سانپ کا عنصر بڑی حد تک موجود ہے اور چین کا تو قومی نشان ہی ابھی تک اژدہا ہے۔ چونکہ سانپ کی صورت ایک طویل عضو جنسی کی طرح ہوتی ہے اس لیے اس کو ازدیاد نسل کی قوت کا مظہر سمجھا جاتا ہے اور اس کی انگوٹھیاں، تعویذ اور کڑے اب تک بعض ملکوں میں شوق سے پہنے جاتے ہیں۔

قدیم یونانیوں کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ بعض دیوتا سانپ کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جیوپٹر آمون اسکندر اعظم کی ماں اولمپیاس سے سانپ ہی کے بھیس میں ملا تھا اور اس سے مواصلت

اسکندریہ پیدا ہوا۔ عہد قدیم میں بدکار اور مغلوب النفس عورت کو ناگن سے تشبیہ دینے کا رواج تھا۔ چنانچہ مصر کی ملکہ قلوپطرہ کو نیل کی ناگن کہنا اسی پر مبنی تھا۔

بعض پھل اور پودے | قدیم اقوام و ملل میں پھولوں اور پودوں سے بھی اعضاء جنسی اور جذبات شہوانی کو تعبیر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یورپ میں ابھی تک سنترہ کے پھول کو شادیوں میں صرف اسی لیے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ اس کے اثر سے دلھن بہت زیادہ صاحب اولاد ہو۔ اسی طرح انگور کو جذبات شہوانی کا مظہر خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انگور سے شراب بنتی ہے اور شراب مقوی و مہیج چیز ہے۔

آشور کے دیوتا بعل سے شمشاد و صنوبر کا پھل منسوب تھا اور انجیر کو بھی عضو جنسی سے تشبیہ دیتے تھے کیونکہ اس کا پتا سہ شاخہ ہوتا ہے جو ترسول سے مشابہت رکھتا ہے جو ممالک سواحل بحیرہ روم پر واقع ہیں وہاں لوگوں میں انجیر کے درخت کی پوجا کی جاتی ہے۔

مصر قدیم اور دیگر ممالک مشرق میں کنول اور بعض دوسرے پھولوں کو ہمیشہ بہ نظر احترام دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ پین نائٹ لکھتے ہیں کہ:-

"کنول یا نیلوفر کو شمالی نصف کرۂ ارض کے جملہ ممالک میں مذہبی احترام کے ساتھ دیکھا جاتا تھا اور ہندوستان اور چین میں بھی یہی حال ہے، تاتاریوں جاپانیوں اور ہندوؤں کی تمام مورتیاں کنول کے پھول

پر قائم کی جاتی ہیں اور اس پھول کو ہندوستان، تبت اور چین میں اب بھی متبرک سمجھا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کا کنول کے پھول سے پیدا ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ پھول عورت کے مخصوص حصۂ جسم کا مظہر ہے لیکن جب دیکھا جاتا ہے کہ کنول کا پھول وشنو کی ناف سے پیدا ہوا تو خیال گزرتا ہے کہ یہ مردانہ عضو جنسی کی علامت ہے۔"

درخت بلحاظ جمالیات دنیا میں بعض درخت نہایت خوبصورت اور دلکش ہوتے ہیں ان کے سیدھے سڈول تنے، گنجان شاخیں اور پتے، خوبصورت رنگین اور خوشبودار پھول، لذیذ اور خوبصورت پھل انسان کا دل لبھائے بغیر نہیں رہتے اور بہت سے درخت سدا بہار ہوتے ہیں، جنھیں دیکھ کر بقائے ابدی کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے۔ بعض درختوں پر ہر سال خزاں آتی ہے۔ ہر سال نئے پھول، پتے اور پھل نکلتے ہیں اور ہمیشہ یہی سلسلہ جاری رہتا ہے اس لیے قدماء کے نزدیک درخت ابدیت کی نشانی تھی۔

آریا و سامی عقائد میں تین طلسمی درخت پائے جاتے ہیں۔ شجرۃ الحیات شجرۃ العلم۔ شجرۃ الجنۃ۔ ڈاکٹر وٹی الویلا لکھتے ہیں کہ ان عقائد کے مطابق ان درختوں کی خصوصیات حسب ذیل تھیں:-

"شجرۃ الحیات سے ایک قسم کا رس پیدا ہوتا تھا جس کے پینے سے دوامی شباب حاصل ہوتا تھا۔ شجرۃ العلم میں یہ کمال تھا کہ وہ غیب کی باتیں

بنا دیتا تھا۔ شجرۃ الجنۃ کا تعلق روشن منور اجرام سماوی سے تھا۔"

قدیم ایرانیوں میں ہوما یا ہوم نامی ایک درخت ہوتا تھا جس کا رس ابدی زندگی بخش دیتا تھا۔ ایسا ہی ایک درخت قدیم ہندوؤں میں تھا جسے سوما یا سوم کہتے تھے اس کا رس بھی آبحیات تھا۔ یہ درخت گویا شجرۃ الحیات تھا۔

چین والوں کے نزدیک سات طلسمی درخت تھے جن میں ایک شجرۃ الحیاۃ بھی تھا، یہ ساتواں درخت کوہستان کوئن لوئن کے اطراف میں پیدا ہوتے تھے۔ اہل چین کے نزدیک یہ کوہستان بہشت ارضی تھا۔ جہاں سائی وانگ مو دیوی کی حکومت تھی، یہ شجرۃ الحیوٰۃ دس ہزار ہاتھ بلند تھا اور ایک ہزار ہاتھ اسکے تنہ کا دور تھا، یہ جڑ سے چوٹی تک سلیم اور زمرد کا بنا ہوا تھا۔ اس پر تین ہزار سال میں ایک مرتبہ پھل آتا تھا۔ تاؤ مذہب والوں کے نزدیک یہ درخت شفتالو کا ہے اور اس مذہب والوں کے نزدیک شادی بیاہ کا درخت ہے۔

ملک آشوریہ میں بھی ایک شجرۃ الحیوٰۃ مانا جاتا تھا۔ پروفیسر لیارڈ کا خیال ہے کہ یہ درخت الشتار دیوی کی پرستش سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ درخت اور اسکی پوجا کا رواج ممالک عرب، وسط ایشیا، ایشیائے کوچک اور ایران میں پہونچا۔

ممالک یورپ میں شاہ بلوط کے درخت کو متبرک سمجھا جاتا تھا۔ جس کا باعث غالباً اسکی مضبوطی اور پائیداری ہوگا، علاوہ ازیں اسکے پھل کی صورت بھی ایسی ہوتی ہے گویا مردانہ وزنانہ اعضاء جنسی کا اتصال ہے قدیم یونانیوں کے نزدیک شاہ بلوط

کا درخت شجرۃ الحیوٰۃ سمجھا جاتا تھا۔ انگلستان کی ڈروئڈ اقوام اس درخت کو بہت مقدس خیال کرتی تھیں۔ شاہ بلوط کے جنگلوں ہی میں یہ لوگ اپنی پوجا پاٹ کی جگہ بناتے تھے۔ یہی تقدس صنوبر کے درخت کو بھی حاصل تھا جو فصل بہار کے دیوتاؤں آیتیس اور دیونسوس وغیرہ سے منسوب تھا۔ اس کا پھل بھی شاہ بلوط کے پھل سے مشابہت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں برگد اور پیپل کے درخت متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ کوئی مندر ایسا نہ ہوگا جہاں برگد یا پیپل کا درخت نہ ہو۔ ان کی شاخوں میں چونکہ دودھ نکلتا ہے اسلیے عورتیں ان درختوں کو خاص طور پر پوجتی ہیں۔

بیل | جو قومیں سورج کو پوجتی تھیں یا پوجتی ہیں ان کے معتقدات میں بیل کو خاص تقدس حاصل ہے۔ بیل کو یہ لوگ افزائش نسل کا مظہر سمجھتی تھیں اور آج بھی اسکی عزت کا سبب یہی خیال ہے۔ منطقۃ البروج میں بھی ایک برج بیل کی شکل کا فرض کیا گیا ہے جسے انگریزی میں (Taurus) کہتے ہیں۔ اس کا موسم فصل بہار میں اپریل سے ۲۰ مئی تک ہوتا ہے اور یہی زمانہ جوش شہوانی کا ہے۔

بیل سے قدیم مذاہب کو خاص تعلق رہا ہے۔ مثلاً قدیم مصریوں کے ہاں آپیس بیل تھا جسے خداوند اوسیریز کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔ یہودیوں میں بھی گوسالہ سامری کی روایت بیل کا تقدس ظاہر کرتی ہے موجود ہے۔ آشوریوں کے مندروں میں بھی پردار بیل بنائے جاتے تھے اور ہندوؤں میں مہادیو کا بیل نندا اب تک موجود ہے۔

آشوریوں کا عقیدہ تھا کہ انسان کی نسل بیل ہی سے چلی ہے۔ جاپان میں سانڈ بیلوں کو بہ نظر احترام دیکھا جاتا ہے اور ہندوستان میں تو سانڈ بیل کو "راجہ" کہتے ہیں۔

قدیم مصریوں میں قوائے مردانہ کو اوسیریز کہتے تھے اور اوسیریز کا اوتار ایپس بیل کو سمجھا جاتا تھا۔ اوسیریز کی نسبت یہ عقیدہ تھا کہ وہ ایک بچھیا کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا جسے چاند کی شعاع یا بجلی کی چمک نے حاملہ کر دیا تھا۔

جب ایپس بیل مر جاتا تھا تو پجاری لوگ ملک بھر میں تلاش کر کے دوسرے بیل کا انتخاب کر لیتے تھے۔ شناخت کی چند خاص علامتیں ہوتی تھیں یعنی بیل کا رنگ سیاہ ہونا چاہیئے، پیشانی پر سفید رنگ کا ایک مثلثی ٹیکا (علامت مرد) ہونا چاہیے۔ پہلو میں ایک سفید رنگ کا ہلال (علامت زن) ہونا چاہیے اور زبان کے نیچے کن سلائی کی وضع کی ایک رسولی ہونی چاہیے۔

جب ایپس بیل مر جاتا تھا تو یہ یقین کیا جاتا تھا کہ اس نے اپنا آسمانی چولا اختیار کر لیا ہے یعنی اوسیریز بن گیا ہے تو اس کے بعد ایپس کی لاش کو حنوط کر کے بہت کچھ اظہار رنج و غم کے بعد ایک مقبرہ میں رکھ دیا جاتا تھا۔ بعد ازاں دوسرا ایپس نہایت شان و شوکت کے ساتھ لایا جاتا تھا۔ عرصہ تک خاص خاص رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ اول چالیس روز تک صرف عورتیں ہی اسے دیکھ سکتی تھیں اور وہی اس کی خدمت اور پرورش کرتی تھیں۔ یہ

حرکتیں ممفیس میں بہت ہوتی تھیں۔

بکرا مصر کی عورتیں صرف آپیس سانڈ ہی سے مالوف نہ تھیں بلکہ منڈیس کے مقدس بکرے کی بھی عزت کرتی تھیں۔ توریت کتاب احبار میں اس رواج کا ذکر ان الفاظ میں پایا جاتا ہے:۔

"نہ تو کسی کے جانور کے ساتھ سوئے گا تاکہ خود کو اس کے ساتھ ناپاک کرے اور نہ کوئی عورت کسی جانور کے نیچے لیٹے گی یہ بات خراب ہے"

قدیم آشوریوں میں بھی بکرے کو بنظر احترام دیکھا جاتا تھا کیونکہ وہ لوگ اس جانور کو قوت نفسانی کا مجسمہ سمجھتے تھے اور عورتیں معبدوں میں نہایت حیاسوز حرکات کی مرتکب ہوتی تھیں۔

گائے گائے کو قدیم اقوام میں دھرتی ماتا کا اوتار سمجھا جاتا تھا جس طرح بیل مرد کی علامت ہے اسی طرح گائے عورت کی نشانی ہے۔ گائے کا احترام مشرق کے تقریباً تمام ممالک میں کیا جاتا تھا۔ مصر میں گائے کو ہاتھور، نوت، آئسیس، نفتیس اور دیگر معبودوں کی قدرت کا مظہر خیال کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اس کی پوجا اب تک ہوتی ہے۔

کچھوا قدیم اقوام میں کچھوا بھی ایک خاص اہمیت رکھتا تھا، کچھوے کی مشابہت جو عضو جنسی سے ہے وہ دراصل اسکی گردن میں ہے۔ قدیم یونانیوں میں اسی مشابہت کی وجہ سے کچھوے کو عشق و محبت کی دیوی وینس سے

منسوب کیا جاتا تھا۔ قدیم یونانی فنون لطیفہ میں بعض اوقات وینس دیوی کو کچھوے کی پشت پر دکھایا جاتا ہے۔ قدیم مصریوں میں بھی کچھوے کو افزائش نسل کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے قدیم ہندوؤں جاپانیوں اور امریکیوں میں کچھوے کا دخل تکوین کائنات میں بھی مانا جاتا ہے مثلاً ہندو روایات میں ہاتھی کو جس کی پشت پر دنیا قائم ہے ایک کچھوے کی پیٹھ پر کھڑا دکھایا جاتا ہے اور جاپانیوں میں کچھوے کی پشت پر دیوتاؤں کا مسکن بتایا جاتا ہے جس کا مرکز ایک پہاڑ ہے۔

امریکہ کی قدیم سنیکا قوم کا یہ اعتقاد تھا کہ "مادر فلک" کا جب ہبوط ہوا تو وہ ایک آبشار پر گری۔ آبشار نے اس کو ایک کچھوے کی پشت پر سوار کر دیا امریکن قوم دلاویر میں ایک روایت ہے کہ "دنیا کا مرکزی درخت" ایک کچھوے کی پشت سے اگا تھا۔ چینیوں کی روایات قدیمہ میں بھی کچھوے کو بہت کچھ دخل ہے۔

بلی مصر قدیم میں بلی کی بھی پوجا ہوتی تھی اور اسے سورج کا نمائندہ خیال کیا جاتا تھا کیونکہ بلی کی آنکھوں میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کا رنگ سورج کے عروج و زوال کے ساتھ بدلتا رہتا ہے لیکن چونکہ یہ جانور عادتاً شب گرد ہے اور چوری چھپے اپنا کام کر جاتا ہے اور چونکہ عشق و محبت کے راز و نیاز رات ہی کے وقت ہوتے ہیں، اسلیے اس جانور کو جذبات شہوانی کا مظہر قرار دیا گیا۔

مصریوں میں باسست ایک گربہ نا دیوی تھی جس کے رتھ میں بلیاں جوتی جاتی تھیں۔ جب کبھی کوئی بلی مرتی تھی تو اس کی لاش کو حنوط کر کے ایک مکتبہ میں محفوظ رکھ دیا جاتا تھا اور جو شخص کسی بلی کو مار ڈالتا تھا اُسے سزائے موت دی جاتی تھی۔

شیر جن اقوام میں سورج کی پرستش ہوتی تھی ان میں شیر کو بھی بنظر احترام دیکھا جاتا تھا اور اس کا سبب بھی یہی ہے جو بلی کے باب میں بیان کیا جا چکا ہے علاوہ ازیں شیر کو سورج کی حرارت سے منسوب کیا جاتا تھا۔ شیر کا قد و قامت چونکہ شاندار ہوتا ہے، اس کی رفتار میں ایک خاص دلفریبی ہوتی ہے اور قوت جسمانی کے لحاظ سے وہ تمام حیوانات پر فوقیت رکھتا ہے اس لیے قدما نے اُسے طاقت مردمی کا مجسمہ قرار دیا۔ اسی لیے قدیم مندروں کے دروازوں پر شیروں کی صورت تعمیر کی جاتی تھی اور ہندوستان کے مندروں میں اب بھی شیروں کے مجسمے دیکھے جا سکتے ہیں۔

ابوالہول سب سے زیادہ عجیب غریب اور دلچسپ چیز مصری ابوالہول ہے اس عجیب الخلقت جانور کا سر اور چہرہ تو ایک خوبصورت عورت کا ہے لیکن باقی تمام جسم شیر کا ہے گویا اس میں زنانہ اور مردانہ دونوں قوتیں موجود ہیں، ابوالہول کے بت میں ایک دلچسپ استعارہ یہ بھی ہے کہ عورت ایسی چیز نہیں ہے جس کے پھندے میں پھنس کر کوئی جان بچا لے جائے کیونکہ وہ اپنی جمیل صورت سے فریفتہ کر کے انسان کو شیر کی طرح پھاڑ ڈالتی ہے۔

فحاشی پر عمومی تبصرہ

محافل نشاط جن حضرات نے ارتقار تہذیب و تمدن پر نظر ڈالی ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ جوں جوں انسان کا روایتی اخلاق، احساس مذہب تہذیب اور سوسائٹی کا آئین ترقی پاتا گیا اسی قدر انسان میں جذبۂ زہد و اتقا بڑھتا گیا۔ لیکن جب اسی کا ردّ عمل ہوا تو پھر اسی مذہب سے رواج فحاشی کا کام لیا گیا اور محافل عیش و نشاط پر تقدس کا رنگ چڑھا کر ان کو جائز و مباح قرار دیا گیا۔ انگریزی زبان میں اس قسم کی محافل شبینہ کو اورجی (Orgy) کہتے ہیں۔

لفظ "اورجی" درحقیقت یونانی زبان کے لفظ "اورجیاؤ (Orgiazo)" سے مشتق ہے جس سے مراد قدیم یونانی کا وہ جشن ہے جو شراب کے دیوتا کی یادگار میں منایا جاتا تھا۔ اس جشن میں اس دیوتا کی سوانح حیات کا کوئی واقعہ منتخب کرکے بطور تمثیل دکھایا جاتا تھا اور نوشا نوش کو ساتھ ایسا زبردست ناچ ہوتا تھا کہ لوگ آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور اپنی خواہشات نفسانی بھی پوری کر لیتے تھے۔

اسی طرح ہندوستان میں سری کرشن جی مہاراج اور برج کی گوپیوں

کی رنگ رلیاں بطور تمثیل عموماً دکھائی جاتی ہیں جن کو رہس کہتے ہیں۔ اس میں بھنگ، چرس، گانجہ کا استعمال ہوتا ہے اور ناچ گانے کی آزاد محفلیں برپا کی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان تماشوں کا اصل مقصد تعمیر سیرت تھا لیکن بعد کو خواہشات نفسانی کا عنصر بھی ان میں شامل کر دیا گیا۔

اسی طرح مسیحیت میں بھی یہ رہس لیلا پائی جاتی تھی جس میں حضرت مسیح یا دیگر اکابر مذہب کے سوانح حیات میں سے کوئی واقعہ چن کر بطور تمثیل دکھاتے تھے۔ مسیحی دنیا میں یہ محافل عیش و نشاط عموماً خانقاہوں میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جن میں بڑے بڑے راہبان مرتاض اور بڑی بڑی پاکدامن مسیح کی مریلیاں ... کار شریک ہوا کرتی تھیں۔ چنگ و ارغنوں کے ساتھ دور بادہ نا چلتا تھا اور خوب خوب خوش فعلیاں ہوتی تھیں یہ سب باتیں اس زمانہ کی باقیات سے تھیں جب تمام یورپ شرک و بت پرستی کی تاریکی میں مبتلا تھا۔ عہد الحمقاء | ۱۲۳۳ء میں بمقام "ہیلنالٹ" کلیسائے مقدس کے علماء کا اجلاس ہوا، جسے سناڈ کہتے تھے اس میں یہ بات پیش کی گئی کہ "فروری" میں جو "ادریچی" ہوتی ہے اسے بند کیا جائے کیونکہ وہ زمانہ بت پرستی کی یادگار ہے لیکن یہی بت پرستوں کی عید کلیسائے مسیحی کی مقدس ترین عید کا رنوا میں شامل کر لی گئی جو مسیحی تہوار لینٹ کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس تہوار کے شروع ہونے سے قبل جو شکل واقع ہوتا تھا اس دن اور اس کے دا

اتوار کو عیسائیوں کی بڑی بڑی محافلِ عیش و نشاط برپا ہوتی تھیں، جن میں ہر طبقہ کے لوگ شرکت کرتے تھے اور آزادی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ بعض آدمی خوش غلافہ ہو کر چلتے پھرتے تھے۔ بعض جانوروں کی طرح چاروں ہاتھوں پاؤں پر چلتے تھے اور بعض بالکل حیوانِ مطلق بن جاتے تھے۔

بارھویں صدی میں یورپ میں عموماً اور فرانس میں خصوصاً بسلسلہ عید نوروز ایک عید الحمقا قائم ہوئی جسے انگریزی میں (Feast of Fools) کہتے تھے۔ اس تقریب میں تمام مسیحی دنیا حد درجہ بدمستیوں کا اظہار کیا کرتی تھی جس میں سب سے زیادہ حصہ مقدس پادری لیتے تھے۔

قدیم یونانیوں و رومیوں کا خیال

قدیم یونانیوں اور رومیوں نے اس خیال کو اکثر جگہ ظاہر کیا ہے کہ مسلسل محنت اور زہد و اتقا کے بعد انسان کو کبھی کبھی "غم غلط" کرنا چاہیے چنانچہ نطشے (Nietzsche) نے قدیم یونانیوں کی نسبت بالکل صحیح کہا ہے کہ:-

> "وہ لوگ انسان کی فطری خواہشات اور جذبات کو پوری طرح تسلیم کرتے تھے خواہ ان میں بعض کتنے ہی دنئے درجہ کے کیوں نہ ہوں اور اسی لیے وہ ایسا انتظام کر لیا کرتے تھے کہ کسی خاص دن، خاص رسوم کے ساتھ جذبات کو آزاد چھوڑ دیتے تھے"

حکیم (Seneca) نے جو رومی معلمینِ اخلاق میں سب سے زیادہ

صاحب اثر شخص بھائیاں تک سفارش کی ہے کہ انسان کو کبھی کبھی بدمست بھی ہو جانا چاہیئے چنانچہ حکیم صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ:-

"کبھی کبھی ہمیں اتنی شراب پی لینی چاہیئے کہ سر دیا کا ہوش نہ رہے کیونکہ شراب ہمارے آلام و افکار کو دور دیتی ہے اور ہم کو عمیق ترین گہرائیوں سے ابھار کر مسرت شادمانی کی سطح پر لے آتی ہے۔ شراب کے موجد کا نام لائبر (Liber) ہے کیونکہ وہ انسان کی روح کو فکروں کی قید سے آزاد کر دیتا ہے۔ غلامی کی زنجیریں توڑ دیتا ہے۔ نئی روح پیدا کرتا ہے اور ہمکو تمام کاموں کے لیے پوری طرح دلیر بنا دیتا ہے۔"

روم والے بھی یونانیوں کے شاگرد تھے اور ان لوگوں نے بھی اس بات کی ضرورت محسوس کی تھی کہ جذبات و خواہشات کو کبھی کبھی پورے ہونے کا موقع دینا چاہیئے۔ لہذا انھوں نے بھی اپنے یہاں بعض ایسے تہوار قائم کر لئے تھے جن میں انسان کی خواہشات نفسانی کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وحشی اقوام کی رنگ رلیاں دنیا کی کوئی قوم خواہ وہ کتنی ہی وحشی و پست ہو، ایسی نہیں جس میں وقتاً فوقتاً یا مقررہ اوقات پر رنگ رلیاں منانے کی ضرورت کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔ اسپنسر اور گلن نے اپنی کتاب "وسطی آسٹریلیا کی شمالی قومیں" کے باب وازدہم میں لکھا ہے کہ:-

---

لہ اسی سے انگریزی لفظ (Libertine) بنا ہے جس کے معنی عیاش و فحاش کے ہیں۔

"وسطی آسٹریلیا کی وارڑامونگا قوم میں ایک تہوار ہوتا ہے، جسے وہ لوگ ناتھاگوراکہتے ہیں۔ اس تہوار میں لوگ آگ سے کھیلتے ہیں اور بعض عجیب رسمیں ادا کرتے ہیں۔ یہ تہوار بالکل ایسا ہی ہے جیسا رومیوں میں "سیٹرنیلیا" ہوتا تھا یا ہندوؤں میں ہولی کی دلہنڈی ہوتی ہے۔ اس میں تہذیب اخلاق کے تمام آئین و قوانین بالائے طاق رکھ دیے جاتے ہیں۔ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہوتی اور لوگوں کو نوشا نوش اور کوشاکوش کی پوری اجازت حاصل ہوتی ہے۔"

ہل ٹاؤٹ نے "جرنل اینتھروپولاجیکل انسٹی ٹیوٹ (جولائی و دسمبر سنہ ۱۹۰۴ء) کے صفحہ ۳۲۹ میں لکھا ہے کہ:-

"برطانوی کولمبیا کی امریکی قوم سالش بیان کرتی ہے کہ یورپینوں کے آنے سے قبل ان کے آباواجداد ہفتہ میں ایک روز یوم السبت[1] یعنی آرام آسائش کا دن منایا کرتے تھے۔ اس روز وہ دنیا کا کوئی کام نہیں کرتے

[1] یوم السبت، آرام و آسائش کا دن۔ دنیا کی تقریباً تمام متمدن و مہذب اقوام میں ایک دن ہفتہ کے اندر یوم السبت مقرر ہے یا تھا مثلاً یہودیوں میں ہفتہ، عیسائیوں میں اتوار، قدیم یونانیوں میں دوشنبہ قدیم ایرانیوں میں سہ شنبہ، آسٹریلیا والوں میں چہار شنبہ، مصریوں میں جمعرات اور مسلمانوں میں جمعہ۔ یوم السبت کو عیش و عشرت سے خاص تعلق ہے۔ دکن کے مسلمانوں میں شادی کے بعد جب پہلا جمعہ آتا ہے تو دلھن جمعہ نہانے اپنے میکے جاتی ہے۔ گویا یوم السبت کی رات عیش رانیوں کی خاص شب ہے۔ عیسائیوں میں بھی سنیچر کی رات کو "گولڈن نائٹ" یعنی سنہری رات کہتے ہیں۔

"تھے اور صبح سے لے کر دوپہر تک مذہبی ناچ رنگ میں مصروف رہتے تھے۔
اے۔ ای کرالی نے اپنی کتاب "پُراسرار گلاب" (Mystic Rose)
میں لکھا ہے کہ:۔

"مختلف اقوام میں رنگ رلیوں کے لیے جو دن مخصوص کر دیے جاتے تھے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ انسان پُرانا بوجھ اُتار کے ہلکا ہو جائے اور دنیا میں ازسرِ نو کام کرنے لگے۔ بعض ملکوں میں لوگ یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ ایسے تہواروں پر اپنی بیویاں تک بدل لیتے ہیں۔ اس کا مقصد شادی بیاہ نہیں ہوتا بلکہ قانونِ ازدواج کو توڑنا ہوتا ہے۔ اور یہ تبدیلی دائمی نہیں بلکہ عارضی ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر حرام و حلال کی کوئی تفریق باقی نہیں رہتی اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ زندگی ازسرِ نو شروع کی جائے۔"

مندرجہ بالا واقعات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ انسان نے تقاضائے فطرت سے مجبور ہو کر اپنی خواہشات و جذبات کی رعایت کس کس طریق سے کی اور اپنی عیش رانیوں پر مذہبی رنگ چڑھا کر کس طرح اسے جائز و مباح کر لیا۔

مگر اب "مقدس عیش رانیوں" کی جگہ "مہذب عیش رانیوں" نے لی ہے تھیٹر، سینما، ناچ گھر، خرابات، قمار خانے وغیرہ سب اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں جیسکی ایک باقاعدہ ادارہ بن گیا ہے کھیل تماشوں میں زن و مرد شریک ہو کر ہیجان انگیز تصویریں اور تماشے دیکھتے ہیں۔ محافلِ شبینہ

(مسلسل تلاطم) جگہ جگہ قائم ہیں اور اس لیے اب "قدیم" اور "جیا" کی کسی شخص کو ضرورت نہیں رہی۔

عصمت فروشی وحشی اقوام میں باقاعدہ اور پیشہ ور عصمت فروشی کی ابتدا معلوم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ابتدائی قسم کی عصمت فروشی جو پیشہ کی صورت نہیں رکھتی وحشی یا نیم وحشی اقوام و ملل میں بھی اکثر دیکھی گئی ہے مثلاً کوئی مرد کسی عورت کو کوئی چیز بطور تحفہ دیتا ہے تاکہ وہ اس کی معیت کا لطف حاصل کرے۔ ہر چند یہ ایک قسم کی بدکاری ہے مگر عصمت فروشی کے درجہ تک نہیں پہنچتی کیونکہ وہ تحفہ یا نذرانہ کوئی اجرت نہیں سمجھی جاتی بلکہ عارضی تعلقات کی ابتدا شمار کی جاتی ہے اور وہ عورت اس مرد کو متمتع کرنے کے بعد بھی اپنی مجلسی وقعت و منزلت کم و بیش برقرار رکھتی ہے اور ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے لیے معاش کے تمام دروازے بند ہو جائیں اور وہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بیان کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ جب کپتان کک کا جہاز جزائر نیوزی لینڈ پہنچا تو جہازران جو عرصہ دراز سے مجرد تھے یہ معلوم کر کے خوش ہوئے کہ جزائر کی عورتیں ان کی دسترس سے باہر نہیں ہیں اور ان کی شرائط بالکل ویسی ہی ہیں جیسے مہذب لوگوں میں شادی کی ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک اس قسم کو عارضی معاہدہ ازدواج میں کوئی حرج نہیں ہوتا ضرورت

صرف اس قدر تھی کہ عورت کے سرپرست سے اجازت حاصل کر لی جائے اور تکمیل معاہدہ کے بعد اس "عروس یک شبہ" (Juliat of Night) کے ساتھ ویسا ہی باعزت برتاؤ کیا جائے جیسا مہذب متمدن اقوام میں اپنی بیویوں سے کیا جاتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ بحر الکاہل کے بعض جزائر میں کبھی کبھی عورتیں پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ یا یوں سمجھیے کہ بدچلنی کی وجہ سے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ان عورتوں سے نفرت و حقارت نہیں کی جاتی بلکہ اگر وہ اپنے پیشہ میں دولت جمع کر لیتی ہیں تو بعض معزز آدمی ان سے نکاح کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے سابق چال چلن یا پیشہ کی نسبت کسی قسم کا اشارہ کرنا بھی برا سمجھا جاتا ہے۔

اگر پست و وحشی اقوام میں اوّل اوّل ایسی عورتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو بسا اوقات انھیں ذلت و حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا جس کا باعث یہ ہے کہ ان میں بھی ابھی تک پاکدامنی اور حفظ عصمت کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ مثلاً ڈاکٹر شورٹز نے بحوالہ یک عرب جغرافیہ دان کے یورپ کی سلافی قوم کی نسبت حسب ذیل دلچسپ معلومات حاصل کی ہیں:۔

"اگر اس قوم میں کوئی جوان لڑکی کسی مرد پر عاشق ہو جاتی ہے تو وہ اسکے پاس جا کر اپنی خواہش پوری کر لیتی ہے اور اسکو مطلق برا نہیں سمجھا جاتا

بلکہ برعکس اس کے اگر شادی کے بعد کوئی مرد اپنی بیوی کی دوشیزگی کو
سلامت پاتا ہے تو وہ اسے گھر سے باہر نکال دیتا ہے۔ یا اگر نہیں نکالتا
تو بہت ذلت کے ساتھ رکھتا ہے۔"

"بعض قوموں میں نوجوان لڑکیاں اُن تحائف کو جو ان کے عشاق پیش
کرتے ہیں نہایت فخر کے ساتھ لیتی ہیں اور جب ان کی شادی ہو جاتی ہے
تو وہ اُن تحائف کو بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ جس قدر
ایسے تحائف زیادہ ہوں گے اتنی ہی اس کی قدر و منزلت شوہر کے گھر
میں زیادہ ہو گی۔"

سلاوی قوم کے مندرجہ بالا رواج کی تصدیق ڈاکٹر کراوش نے بھی کی ہے۔

"وحشی اقوام میں شادی سے قبل نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں تعلقات
شہوانی بہت آزادی کے ساتھ ہوتے ہیں اور بعض خاص تہواروں اور
تقریبوں میں کوئی روک ٹوک ہوتی ہی نہیں لیکن ان وحشیوں میں پیشہ ور
کسبیاں ہرگز نہیں ہوتیں۔ اگر کوئی زمانہ وحشی عورتیں نفس فروشی کرتی
ہیں یا ان کے شوہر انھیں فروخت کر ڈالتے ہیں تو یہ صرف جدید
تہذیب و تمدن کا اثر ہے۔"

مقدس مباشرت | ڈاکٹر سورٹز کا یہ قول بالکل درست ہے کہ جس قوم
میں نوجوانوں کے آزادانہ اختلاط و ارتباط میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں گی اور ایسے

ساتھ جلد شادی کرنے کا بھی کوئی انتظام نہ ہوگا اس قوم میں عصمت فروشی پیدا ہوگی اور لذت نفس حاصل کرنے کے مختلف طریقے پیدا ہو جائیں گے محققین نے جہاں تک تحقیق کی ہے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس فعل کی ابتدا مذہب کے آڑ میں ہوئی۔ پانچویں صدی قبل مسیح کی کیفیت یونان کے مشہور و معروف مؤرخ و سیاح ہیروڈوٹس نے جو کچھ بیان کی ہے اس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

اس بیان کی تصدیق ان لوگوں نے بھی کی ہے جنھوں نے بابلی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ بابلی آثار قدیمہ سے ایک لوح برآمد ہوئی ہے جس پر ایک رزمیہ نظم بنام جلجامش کندہ ہے۔ پروفیسر ماریس جسٹرا نے اس لوح کا مطالعہ کرکے بیان کیا ہے کہ شہر اروک یا ایریخ میں اشتاردیوی کا جو مندر تھا اس میں کثرت سے عورتیں موجود رہتی تھیں۔

اسی قسم کا رواج ایشیا کے دیگر حصص، شمالی افریقہ، مغربی افریقہ(۱)، جزیرہ قبرص

---

(۱) اے۔ بی۔ ایلس (A. B. Ellis) نے اپنی کتاب (The Ewe Speaking People of S. Africa) میں لکھا ہے کہ جو لڑکیاں کسی دیوتا کے نام سے منسوب کر دی جاتی تھیں وہ جوان ہو کر پنچایتی عورتیں بن جاتی تھیں۔ اسی طرح ڈبلیو۔ جی۔ سمنر (W. G. Sumner) نے اپنی کتاب (Folk Ways) باب ۱۶ میں بہت سے واقعات مذہبی عصمت فروشی کے لکھے ہیں۔

بحرِ روم کے دیگر جزائر اور مصر[1] و یونان وغیرہ میں بھی پایا جاتا تھا۔ یونان کے
شہر کورنتھ کے قلعہ میں آفرودتیہ دیوی کا ایک مندر تھا جس میں ایک ہزار سے
زیادہ "قرلیاں" یا "مقدس اچھوتیاں" مندر کی خدمت کے لئے رہا کرتی تھیں
اور بقول مؤرخ استرابو جن لوگوں کو دیوی کے مندر میں کوئی منت ماننا ہوتی
تھی وہ ان عورتوں کے تمام نخرے برداشت کرتے تھے اور لطف یہ ہے
کہ لوگ ان کو عام طور پر بہت نیک اور پارسا بھی سمجھتے تھے اور ہر قومی
مصیبت کے وقت ان سے دعائیں کراتے تھے۔

ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ قبل تاریخ سے جو آزادی
چلی آتی تھی اسے مذہب کی آڑ میں قائم رکھا گیا اور پھر عوام کے دلوں میں
رفتہ رفتہ یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ مرد عورت کا مندروں کے اندر تعلقات
شہوانی قائم رکھنا خود دیوتا یا دیوی کی خدمت اور ان کی خوشنودیٔ مزاج کا
باعث ہے۔ عورتیں چونکہ سریع الاعتقاد ہوتی ہیں اس لئے ان میں عام طور پر
یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ دیوتا یا دیوی کے استھان میں پجاریوں یا اور مردوں سے

---

[1] فلنڈرس پیٹری (Flinder Petrie) نے اپنی کتاب "قصص المصر" میں لکھا ہے
کہ قدیم مصریوں میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی عورت کسی مرد پر عاشق ہو جاتی تھی تو وہ اسے اپنے
کپڑے بھیج کر "دعوت" دیتی تھی۔ خواہ وہ زن شوہردار ہو یا کنواری۔ رفتہ رفتہ یہ رواج موقوف کر دیا گیا
لیکن بایں ہمہ آمن (Amen) دیوتا کی داسیوں نے دیوتا کو زیر سایہ اپنا یہ طریقہ قائم رکھا۔

اختلاط رکھنا ثواب کا کام ہے۔ یہی باعث تھا کہ دنیا کے تمام وحشی ممالک میں عموماً اور مغربی ایشیا میں خصوصاً مذہبی عمارتوں کے اندر "مقدس عصمت فروشی" کا سلسلہ جاری تھا۔

ڈاکٹر الیف۔ ایس۔ کراؤس[1] نے لکھا ہے کہ "بربریت کے زمانہ میں جو بہر ڈولش کے بعد گزرا ہے مذہبی فحاشی درختوں کے نیچے ہوا کرتی تھی۔" اور ڈاکٹر جے۔ جی۔ فریزر نے اپنی مشہور کتاب (Adonis Attis Osiris) میں اس کا عقیدہ اور اس کے اسباب حسب ذیل بیان کئے ہیں:۔

"جملہ حالات پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک "مہادیوی ماتا" تھی۔ جو قدرت کے تمام قوائے تخلیقیہ کی حامل تھی، اس کی پرستش مختلف ممالک میں مختلف ناموں سے کی جاتی تھی اور تمام مغربی ایشیا کی مختلف اقوام میں اس دیوی کے متعلق قریب قریب یکساں روایات اور یکساں رسوم پرستش جاری تھے۔ ان قدیم روایات میں اس دیوی کا تعلق کسی خاص عاشق یا متعدد عشاق سے بتایا جاتا تھا۔ یہ عاشق یا عشاق عموماً دیوتا مگر فانی ہوتے تھے۔ وہ دیوی ہرسال ان عشاق سے مواصلت کرتی تھی اور ان کی یہ مواصلت انسانی و حیوانی افزائش نسل اور شادابی فصل کیلئے ضروری

(1) Dr. F. S. Krauss "Beischl Afansir Burgals Kulthan Dlungs" Anthro Phytria Vol: III P. 20

سمجھی جاتی تھی - بعد میں ان آسمانی عاشق و معشوق کی مواصلت کا
کھیل کو دہ دنیا میں کھیلا جانے لگا یعنی لوگ دیوی کے استھان میں جاکر
خود حرام کاریاں کرنے لگے اور عقیدہ یہی تھا کہ ان کی ان سیہ کاریوں سے اولاد
پیدا ہوگی، مویشیوں کی نسل بڑھے گی اور فصل خوب پیدا ہوگی، مدت دراز
کے بعد جب لوگوں کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور انفرادی شادی و
نکاح کا رواج بڑھنے لگا اور اشتراک فی النسواں کا طریقہ برا سمجھا جانے لگا
تو عورت کا عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی کسی غیر مرد سے اختلاط مذموم شمار ہونے
لگا، بالآخر لوگوں نے اس فحاشی سے اپنی عورتوں کو محفوظ رکھنے کے لیے
بہت سے انسدادی طریقے اختیار کیے جن سے وہ عملی کیفیت تو جاتی
رہی لیکن عقیدہ بدستور قائم رہا اور عورتیں مندروں میں جاکر فرضی رسمیں
مواصلت کی ادا کرتی رہیں مگر چونکہ پرانی عادتیں بہت مشکل سے چھوٹتی ہیں
اور مردوں کو رنگ رلیوں کا چسکا پڑا ہوا تھا، اس لیے انھوں نے ضرورتاً
سمجھا کہ عورتوں کی ایک تعداد پرانے طریقے پر مقدس عصمت فروشی کرتی
رہے - چنانچہ لڑکیاں وقتاً فوقتاً دیوتا دیوی کے نام سے منسوب کرکے
مندروں پر چڑھائی جاتی رہیں، جو زندگی بھر یا کچھ عرصہ کیلیے فحاشی میں مصروف
رہتی تھیں - اور چونکہ یہ عورتیں دیوتا دیوی کے نام سے منسوب ہوتی تھیں اسلیے
ان میں ایک قسم کا مذہبی رنگ پیدا ہو گیا - مختلف ممالک میں ان عورتوں کے مختلف

نام ہوتے تھے۔ یونان میں "ہائرو ڈیول (Hierodules)
کہلاتی تھیں۔ روم میں ان کا نام "وسٹا کی کنواریاں" (Vestal Virgins)
تھا۔ بابل میں یہ "کادشتو" (Kadishtu) کے نام سے پکاری جاتی
تھیں۔ جنوبی ہند میں یہ "دوشیزگان مقدس" "دیوداسیاں اور مرلیاں"
کہلائیں اور مسیحی دنیا میں "نن" (Nun) ہو گئیں۔"

جب امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مذہبی رہنماؤں کا اثر زیادہ قوی ہو گیا
تو انھوں نے یہ دیکھ کر کہ لوگ عام طور پر اس سے متنفر ہوتے جاتے ہیں یہ تبلیغ شروع
کی کہ جو شخص دیوتا دیوی کے استھان پر کوئی چیز چڑھا دیتا ہے خواہ وہ عصمت
عفت ہی کیوں نہ ہو تو اس کو بہت نفع ہوتا ہے اور عورت کی قوت بچہ کشی"
بہت بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر ویسٹر مارک (Wester MarH) نے بھی
یہی توجیہ کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"جو مرد مندر میں کسی عورت کی گود میں سکہ پھینکتا تھا وہ یہ الفاظ کہتا تھا
"دیوی تمھیں برکت دے اور تم پر مہربان ہو۔"

ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ وہ
بانجھ نہ رہے اور دیوی اُسے خوب اولاد دے۔

اہل بابل کی اسی رسم کے متعلق فارنیل کا یہ نظریہ ہے کہ بعض قدیم اقوام میں
یہ عقیدہ تھا کہ جو شخص دوشیزہ سے ملتفت ہوتا ہے تو وہ ارواح خبیثہ جو اس

عورت پر عاشق ہوتی ہیں، اس مرد کو ستاتی ہیں۔ چنانچہ اہل بابل کی عورتیں
اپنے شوہروں کو ارواح خبیثہ کے خراب اثر سے محفوظ رکھنے کے لئے اجنبی
مردوں سے مل لیا کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس نامعقول حرکت سے ان لوگوں میں
عورتوں کی قدر و منزلت بھی بڑھ جاتی تھی۔ کیونکہ جو عورتیں مندر میں جاکر
اسی مقصد خاص سے بیٹھتی تھیں اور انھیں کوئی مرد نہیں پوچھتا تھا تو
سوسائٹی میں ایسی عورتوں کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔

واضح ہو کہ جس طرح بقول ہیروڈوٹس ملیٹا دیوی کے مندر میں
یہ رواج قائم تھا تقریباً اسی عقیدہ کے ساتھ ملک مصر میں عورتیں ایک
خاص رسم ادا کیا کرتی تھیں۔ مصری عورتوں میں یہ عقیدہ تھا کہ دیوتا، یا اس کے
نائب دیوتا کی مورتی سے چھوا جانا باعث خیر و برکت ہوتا ہے چنانچہ اس کام کیلئے
مندر کے اندر ایک مقدس بکرا پالا جاتا تھا۔ جو پان دیوتا (Pam)[1] کا
مظہر تھا۔ عقیدتمند عورتیں مندر میں جاکر اس بکرے کی خوب خدمت کرتیں
پجاریوں کو تحائف دیتیں اور برہنہ ہوکر اس بکرے کے سامنے چوپایہ کی

(۱) ملاحظہ ہو ہیروڈوٹس جلد دوم باب ۴۶۔ پان دیوتا درحقیقت گڈریوں، شکاریوں
زراعت پیشہ دیہاتیوں کا دیوتا تھا۔ یہ مرکری کے نطفہ اور پینی لوپ کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔
اسکے بت کے سر پر دو چھوٹے چھوٹے سینگ، چپٹی سی ناک اور جسم زیریں بکرے کا سا بنایا جاتا تھا۔

(۲) ملاحظہ ہو سینٹ آگسٹائن کی کتاب ("De Cinilate BK. III ch. IX")

طرح اپنے آپ کو پیش کر دیتیں۔

ایسی ہی رسم قدیم رومیوں میں بھی تھی، رومی عورتوں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ دیوتا کے التفات سے آسمانی خیر و برکت نازل ہوتی ہے اسی خیال سے رومی عورتیں پریاپس (Priapus) (ممکن ہے یہی دیوتا ہندوؤں میں پرجاپتی کے نام سے مشہور ہو گیا ہو) کے بت کی پوجا کیا کرتی تھیں جس کا عضو مخصوص بحالت آمادگی بنایا جاتا تھا۔ رومیوں کی بڑی بوڑھیاں نو عروس کو مندر میں لے جا کر پریاپس کے اس عضو پر بٹھا دیتی تھیں۔

شادی کا خرچ اور جہیز

مدت بعد بگڑ جانے پر بھی یونان کے مندروں میں مقدس کسبیاں موجود رہیں۔ کورنتھ کے مندر میں وینس کی داسیاں عرصہ تک پائی جاتی تھیں اور جبتک ان مقدس سیہ کاریوں کا تعلق مندر سے رہا لوگ انکی عزت و وقعت کرتے رہے۔ مگر بعد کو انھوں نے حرام کاری کا پیشہ اختیار کر لیا جن مندروں میں یہ داسیاں رہتی تھیں وہ عموماً بندرگاہوں جزیروں اور بڑے بڑے شہروں میں ہوتے تھے جو عام طور سے اجنبی سوداگروں اور ملاحوں کے آماجگاہ بنے رہتے تھے جزیرہ قبرص میں یہ داسیاں ایک طرف تو دیوی کے استھان کی دیکھ بھال کرتی تھیں، مورتی کے سامنے بخور جلاتی تھیں اور بھجن بھی گاتی تھیں لیکن اسکے علاوہ بقول پنڈار (Pindar) "یہ نوجوان عورتیں اجنبیوں کی آؤ بھگت اور انکی میزبانی بھی کرتی تھیں" گویا مندر کی خدمت کے ساتھ ساتھ یہ عورتیں ان مردوں کی ضرورتیں بھی رفع کر دیتی

تھیں جو اپنے گھروں سے دُور ہوتے تھے۔

ہیرو ڈوٹس نے اپنی تاریخ و سیاحت نامہ جلد دوم باب ۹۳ میں ملک لیڈیا (Lydia) کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"وہاں کی نوجوان اور نوخیز لڑکیاں اپنے آپ کو مردوں کے حوالہ کر دیتی ہیں تاکہ شادی کے مصارف نکال سکیں۔"

اس رواج کی نسبت ڈاکٹر فریزر تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"غالباً یہ طریقہ "مذہبی فحاشی" سے پیدا ہوا تھا، اور اس خیال کی تائید میں واقعہ سے بھی کچھ کچھ ہوتی ہے کہ جب رومی شہنشاہ جسٹینین جزیرہ قبرص میں گیا تو اس وقت یہ معلوم ہوا کہ مندر کی داسیوں کو جو رقم اجنبیوں کی طرف سے وصول ہوتی ہے وہ دیوی کی قربان گاہ پر نہیں چڑھائی جاتی بلکہ ایک بڑے صندوق میں رکھی جاتی ہے تاکہ اگر کوئی داسی مندر کی خدمت سے اٹھا کر شادی کرنا چاہے تو اس کی شادی اور جہیز وغیرہ کے اخراجات بھی بیت المال سے دیئے جائیں۔"

پارٹر نے اپنی کتاب "سہراب و رستم" صفحہ ۱۶۸ میں لکھا ہے کہ:۔

"دنیائے قدیم و جدید دونوں میں ایسی قومیں اکثر پائی جاتی ہیں جن میں نوخیز لڑکیاں شادی اور جہیز کا خرچ حاصل کرنے کے لیے فحاشی کرتی ہیں۔"

الجزائر میں ایک قبیلہ بنی نائل کے نام سے مشہور ہے اس کی لڑکیاں خصوصیت کے ساتھ نہایت حسین و جمیل ہوتی ہیں یہ لڑکیاں جوان ہو کر باہر چلی

جاتی ہیں اور دو چار سال میں خوب دولت کما کر واپس آتی ہیں اور شادی کر لیتی ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہی عورتیں شادی کے بعد نہایت اچھی بیویاں اور مائیں ثابت ہوتی ہیں۔ اسی طرح فیثا غورث نے ملک حبش کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"وہاں کی کسبیوں کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اگر چہ اس زمانہ میں از روئے قانون انہیں ہفتہ میں دو بار ڈاکٹری معائنہ کرانا پڑتا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے پیشے میں کوئی ذلت نہیں دیکھتیں۔ ان کے پاس جب کافی دولت جمع ہو جاتی ہے تو وہ اکثر شادیاں کر لیتی ہیں۔"

فحش کی ابتدا

انسان کے معتقدات مذہبی میں جوں جوں عنصر روحانیت زیادہ ہوتا گیا مذہبی فحاشی کا تقدس بھی زائل ہوتا گیا۔ اگرچہ ایشیائے کوچک کے سواحلی بلاد میں مذہبی اور غیر مذہبی دونوں قسم کی حرامکاری پائی جاتی تھی لیکن جب مذہبی فحش میں انحطاط شروع ہو گیا تو لوگوں کی عام توجہ غیر مذہبی فحاشی کی طرف ہو گئی جیسا کہ بتایا جا چکا ہے یہ تھا کہ جوان لڑکیاں، اپنی شادی کے مصارف کے لیے روپیہ جمع کرتی ہیں۔ بادشاہ قسطنطین اعظم نے اس قسم کی فحاشی کا بھی خاتمہ کر دینا چاہا تھا لیکن چونکہ دنیا سے توہم پرستی ہمیشہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی ہے اس لئے لوگوں کے دل میں یہ خیال جاگزیں رہا کہ جو عورت دیوی کے استھان پر اپنے نفس کی بھینٹ نہیں چڑھاتی وہ خواہش نفسانی کی آگ سے جلتی رہتی ہے۔ الغرض معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی عورتوں سے بازاری فحش کی ابتدا ہوئی اور جب مذہبی فحاشی کا

فقدان ہو گیا تو غیر شادی شدہ مردوں نے تقاضائے فطرت سے مجبور ہو کر لوگوں کی بہو بیٹیوں کو گھورنا اور چھیڑنا شروع کر دیا جس سے نظام معاشرت میں خلل پڑنے لگا اور انھیں تمام باتوں سے متاثر ہو کر یونان کو مشہور و معروف مقنن حکیم سولن نے سب سے پہلے ایک عام قحبہ خانہ قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اوباش نوجوانوں کی تسکین خواہشات کے لیے سرکاری طور پر کوئی آسان ذریعہ مہیا کیا جائے تاکہ اس طرح شریف عورتوں کی عزت و آبرو محفوظ رہے علاوہ اس کے ایک خیال یہ بھی تھا کہ ان سے سرکاری خزانہ کو فائدہ پہنچے گا الغرض اس تحریک نے فحاشی کو ایک قانونی صورت دیدی اور وہی چیز جو پہلے یونان میں ڈکیٹرین (Dicterion) کے نام سے موسوم تھی موجودہ زمانہ کا قحبہ خانہ (Brothel) ہو گئی اور جو عورت قدیم یونان میں "ڈکیٹریڈ" کہلاتی تھیں وہی اس زمانہ میں سرکاری قانون کے ماتحت "کسبی" کہلائی جانے لگی۔ لیکن قدیم یونان میں جن عورتوں سے قحبگی کا کام لیا جاتا تھا وہ کنیزیں ہوتی تھیں یعنی یا تو وہ عورتیں ہوتی تھیں جو جنگ میں اسیر ہو کر آئی ہوں یا وہ عورتیں جنھیں خرید لیا گیا ہو۔

اس کے بعد قدیم یونان میں ایسی کسبیوں کی جماعت پیدا ہوئی جو آزاد ہوتی تھیں ان کا نام ہتائرہ (Hetairae) تھا یہ عموماً تعلیم یافتہ مہذب، علم مجلسی میں کامل، موسیقی میں ماہر اور متمول ہوتی تھیں لیکن ان کو مندر

کی خدمت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

فحاشی ممالک مشرق میں | دنیا کی مختلف قوموں کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں فحاشی نہ پائی جاتی ہو لیکن باقاعدہ عصمت فروشی صرف متمدن اقوام کا حصہ ہے اور جہاں بھی تہذیب کا قدم پہونچا ہے وہیں یہ بھی ساتھ گئی ہے۔ مثلاً بحر جنوبی کے جزیرہ روتومہ (Rotumma) میں عصمت فروشی قطعی مفقود تھی لیکن اب وہاں عصمت فروش عورتیں کثرت سے موجود ہیں اور قریب قریب یہی حال افریقہ کی بمبولا بنتو قوم کا ہوا۔ اسی طرح ملک ویلز کی قدیم قوم میں بہت کچھ متمدن فحاشی موجود تھی لیکن باقاعدہ عصمت فروشی جرم قرار دی گئی تھی۔

برہما | برہما میں آوارگی یا عصمت فروشی اس سے قبل بالکل مفقود تھی اور لوگ اسکو ایک شرمناک فعل خیال کرتے تھے لیکن اس زمانہ آزادی میں وہاں بھی اس کا رواج ہو گیا ہے اور ہندوستانیوں کی تقلید میں وہاں بھی اس کا چرچا بکثرت پایا جاتا ہے۔ ہر چند وہاں کے مقتدایان دین نے زن و مرد کے اس آزادانہ تعلق کی روک تھام کرنے میں بہت سختی کی یہاں تک کہ ایسے لوگوں کو جلتی آگ پر تیل ڈالنے کی خدمت سپرد کی۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

ہندوستان | ہندوستان میں مذہبی اور غیر مذہبی پیشہ ور عورتیں ہمیشہ سے

موجود ہیں۔ کتاب کام شاستر میں جو آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل کی تصنیف ہے بعض نہایت دلچسپ معلومات درج ہیں اس میں لکھا ہے کہ :۔

"اگر عرصہ دراز تک بیوی لاولد رہے تو ہندو شوہر آخری تدبیر یہ اختیار کرتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو لباس فاخرہ اور زیور سے آراستہ کر کے مع دان دکھشنا کے کسی مندر میں چلہ کشی کے لیے بھیج دیتا ہے"

یہ امر بھی محقق ہے کہ بعض لوگ دقت اور پریشانی سے بچنے کے لیے اوّل ہی شب مندر میں بھیج دیتے ہیں۔ مندر کے اندر یہ ہوتا ہے کہ عورت دن بھر دیوتا کی پوجا پاٹ کر کے اس سے اولاد کی التجا کرتی ہے اور شب کو دیوتا کے حجرہ میں سو رہتی ہے۔ صبح کو وہ مندر کے مہنت سے رات کا تمام ماجرا بیان کرتی ہے جس پر مہنت کہتا ہے کہ "اے صاحب عصمت و عفت عورت خوش ہو کہ دکھشتی (جو رات کو تیرے ساتھ ہمبستر ہوئی) خود دیوتا کی تھی۔"

"اس کے بعد وہ عورت اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ اس سرگزشت کے بعد اگر وہ عورت حسن اتفاق سے حاملہ ہو جائے اور وضع حمل کے بعد زندہ بچہ پیدا ہو تو سال بھر کے بعد وہ عورت چند تحائف اور بچہ کے سر کے چند بال لیکر پھر مندر میں جاتی ہے۔(۱) ایسے مندروں کا وقار قائم رکھنے

(۱) ملاحظہ ہو کتاب "ہندوؤں کی عادات رسوم و اخلاق" مصنفہ ڈیبے صفحات ۵۹۳، ۵۹۴

کے لیے عموماً نوجوان اور تندرست پجاری مندر میں رکھے جاتے ہیں"۔
ہندوستان کے بعض حصّے خصوصاً جنوبی ہند اور اڑیسہ میں متعدد جگہ یہ رواج ہے کہ عورت مرد منت مانتے ہیں کہ اگر ان کے اولاد پیدا ہوئی تو وہ اپنی پہلی لڑکی یا اپنی تمام لڑکیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی مندر کی نذر کر دیں گے۔ اس لڑکی کو مندر کی ایک عورت (جو خود بھی اسی طریقہ سے آئی تھی) لیکر پرورش کرتی ہے۔ یہاں اس لڑکی کو رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی ہے بعض اوقات یہ خوبصورت لڑکی دس برس کی عمر تک بھی نہیں پہونچنے پاتی کہ مندر کا مہنت اسے اپنی معشوقہ بنالیتا ہے۔ اگر وہ زندہ رہتی ہے تو مندر میں ناچنے گانے کی خدمت انجام دیتی رہتی ہے اور جب میلے کے وقت وہاں مختلف شہروں کے جاتری جمع ہوتے ہیں تو یہ عورتیں ان مردوں کے ساتھ مختلط ہوتی ہیں۔ اس لڑکی کی جب تک جوانی باقی رہتی ہے اسوقت تک وہ ہمیشہ عمدہ بیش قیمت لباس اور زیور سے آراستہ رہکر حسن فروشی کرتی رہتی ہے اور جب وہ کسی قابل نہیں رہتی بلکہ مندر پر بار ہو جاتی ہے تو اس کی پیشانی پر دیوتا کی تصویر داغ کر دیجاتی ہے اور مندر سے نکال دیجاتی ہے تاکہ بقیہ عمر بھیک مانگ کر گزارے۔ اس لڑکی کے والدین کو خواہ وہ کسی رتبہ و حیثیت کے ہوں اپنی لڑکی کی حیا سوز زندگی پر کوئی غیرت نہیں آتی کیونکہ عام ہندو پبلک اپنی اولاد کو دیوتا کی نذر کر دینا

قابل تعریف ایثار سمجھتی ہے۔ اس قسم کی عورتوں کو اصطلاح میں "دیوداسی" کہتے ہیں اور بقول مسٹر رنگاچاریہ مندروں کی ان "دیوداسیوں" سے کسی فرقہ یا ذات کا ہندو بھی شادی نہیں کر سکتا، اس لیے گاؤں کے زمینداروں یا تعلقداروں کو ترغیب دیکر اس بات پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس لڑکی کو اپنی آشنا یا داشتہ کے طور پر رکھ لیں۔

ہندوستان میں عوام کے خواہشات نفسانی کو جوش میں لانے کے لیے مندروں کے در و دیوار پر بھی فحش تصویریں بنائی گئیں۔ جب بین الاقوامی مجلس نے فحش تصاویر کے انسداد کا ریزولیوشن پاس کیا جس پر ستمبر ۱۹۲۳ء میں مقام جنیوا سب کے دستخط ہوئے تو اس کی تعمیل میں ہندوستان کی اسمبلی نے بھی یہ قانون بنایا کہ جو شخص فحش تصاویر بیچتا ہو، یا کرایہ پر دیتا ہو، یا تقسیم کرتا ہو، یا منظر عام پر رکھتا ہو، یا کسی فحش کتاب یا تصویر یا مجسمہ کے ذریعے سے نفع کماتا ہو، وہ سزا پانے کا مستحق ہوگا لیکن ہندو سوسائٹی کے مذہبی جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس قانون کو مندرجہ ذیل استثناء کے ساتھ منظور کیا گیا کہ:۔

"کوئی کتاب، رسالہ، تحریر، تصویر یا نقوش جو رسوم مذہبی کے لیے رکھے جاتے ہوں یا استعمال ہوں یا وہ مجسمے اور تصویریں جو مندر پر یا مندر میں کھدی ہوئی ہوں، یا وہ بت جو رتھوں پر رکھے ہوں یا جو کسی مذہبی رسم کی ادائی کے لیے رکھے گئے ہوں یا استعمال ہوتے ہوں

اس دفعہ میں نہیں آتے۔"[1]

فلسطین مغربی ایشیاء کے اکثر حصوں میں جہاں انسان کی تمدنی حالت وحشت و بربریت کی انتہا تک پہونچ گئی تھی عصمت فروشی معمولی بات تھی۔ عبرانیوں میں حرامکاری کثرت سے رائج تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ بائبل میں فاحشہ عورتوں کا بار بار ذکر آتا ہے۔ صحیفۂ امثال کے ابواب فاحشہ عورتوں کی مذمت سے بھرے پڑے ہیں بایں ہمہ عبرانی قوم غیر عورتوں کے فحش کو گوارا کرلیتی تھی اور خود اپنی عورتوں کی چھنگی پر سخت قانون نافذ کرتی تھی۔

اسلام نے فحش اور چھنگی کا قلع قمع کردیا تھا چنانچہ علامہ جلی کا قول ہے کہ رسول مقبول صلعم کی وفات کے بعد پہلی صدی میں دنیائے اسلام کے اندر عصمت فروشی بالکل مفقود تھی۔ لیکن اب وہ زمانہ ہے کہ ہندوستان کے اندر ۷۵ فیصدی سے زیادہ کسبیاں مسلمان ہی ہیں۔

قدیم ایران ہر چند مذہب زرتشت میں زہد و اتقا اور نکوکاری پر بہت زور دیا گیا ہے اور ان کے ہاں کسبیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن قدیم ایران میں کثرت سے ایسی عورتیں موجود تھیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے جو پارسیوں کی کتب مقدسہ سے لیا گیا ہے قدیم ایران میں فاحشہ عورتوں کی موجودگی اور ان کی حالت پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے کیونکہ اگر اس زمانہ

(۱) ملاحظہ ہو قانون تعزیرات ہند ایکٹ نمبر ۵ مجریہ ۱۹۲۵ء دفعہ ۲۹۲۔

میں فاحشہ عورتیں موجود نہ ہوتیں تو انکی مذمت اس طرح نہ کی جاتی :-

"اے سپیتما زرتشترا! یہ گاہی (یعنی کسبی) ہے جو اپنے اندر مومنین و منکرین پرستاران مزدا اور پیروان دیو (یعنی بُرے اور بھلے دونوں قسم کے آدمیوں کا بیج ملاتی ہے۔ اے زرتشترا! اس کی نگاہ عظیم الشان سیلاب کے پانی کو جو پہاڑوں سے نازل ہوتا ہے بقدر ایک ثلث کے خشک کر دیتی ہے۔ اے زرتشترا! اسکی نگاہ ایک ثلث خوبصورت طلائی رنگ پودوں کو افسردہ کر دیتی ہے اسکی نگاہ سپنتا ارمائتی (دھرتی ماتا) کی ایک ثلث طاقت زائل کر دیتی ہے اور اسکے چھونے سے مومنین کے ایک ثلث نیک خیالات، ایک ثلث اقوال پسندیدہ، ایک ثلث اعمال حسنہ ایک ثلث طاقت جسمانی، ایک ثلث قوائے فتح مندی اور ایک ثلث تقدس خاک میں مل جاتا ہے۔ اے سپیتما زرتشترا! میں تجھ سے کہتا ہوں کہ رینگنے والے سانپوں سے، غرانے والے بھیڑیوں سے، اس مادہ گرگ سے جو گلہ پر چھاپہ مارتی ہے، نیز اُس مینڈکی سے جو اپنے ہزارہا بچوں کو لیے ہوئے پانی میں کودتی ہے، ان سب سے زیادہ اس مخلوق کو تباہ ہونا چاہیے"۔

تاتار و ترکستان

تاتار و ترکستان میں بھی کسبیاں بکثرت پائی جاتی ہیں، ایک مستند مسیحی سیاح کا بیان ہے کہ یہاں کسبیوں کے مکانات میں جانا ممنوع نہیں، نہ خلاف اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ ایسے مقامات ہیں جہاں

پہونچ کر ایک شخص اپنے گھر کو بھی بھول جاتا ہے۔ رقص و سرود سے اس کی طبیعت خوش کی جاتی ہے، دلپسند نظمیں اور غزلیں سُنائی جاتی ہیں، لطیفہ اور بذلہ سنجی سے اس کا دل مسخر کر لیا جاتا ہے۔ کسی کی نفیس مکان کے دروازہ ہی پر وصول کر لی جاتی ہے اور پھر اس کے بعد آنے والے کو اسقدر راحت پہونچائی جاتی ہے گویا وہ اپنے ہی گھر میں محو استراحت ہے وہ کسبی سے وہی کام لیتا ہے جو اپنی بیوی سے لے سکتا ہے۔ کسی قسم کی بدمزگی یا ناگوار بات نہیں ہونے پاتی۔ اس سیاح کا ایک معنی خیز قول یہ بھی ہے کہ:-

"مشرقی قحبہ خانہ میں کوئی بیحیائی نہیں ہوتی اور نہ وہاں یورپین کسبیوں کی طرح نادان بچوں کی سی باتیں بنائی جاتی ہیں۔"

چین مشرقی چین میں خصوصًا مغل نسل کی اقوام میں فحاشی تجارتی بنیاد پر قائم ہے، ان لوگوں میں ایک بات نہایت عجیب ہے کہ وہ حرامکاری کو تو بُرا نہیں سمجھتے مگر کسبیوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پیشہ ور عورتیں جو لاولد ہوتی ہیں۔ دوسرے خاندانوں سے خوبصورت لڑکیاں چھوٹی عمر کی خرید لیتی ہیں اور انکی تعلیم و تربیت اپنے ذوق کے مطابق کرتی ہیں اور لوگوں کی نظروں سے الگ چار دیواری میں محفوظ رکھتی ہیں چونکہ ان لوگوں میں بیوہ عورتوں کی شادی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا، اس لیے اکثر نوجوان بیوائیں بھی تقاضائے فطرت یا ضرورت معاش سے مجبور ہو کر یہ پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ قدیم چین میں کسبیوں کو عمدہ طبقہ کی عورتیں خیال کیا جاتا تھا اور انکی وقعت تقریباً وہی تھی جو قدیم یونان میں ہتایرہ (Helaira) کی تھی۔

ساحلی شہروں اور بڑے بڑے بندرگاہوں میں خاص قسم کی چینی کسبیاں ہیں جو دریا پر خوبصورت بجروں اور موٹر کشتیوں میں رہتی ہیں۔ انکی کشتیاں نہایت خوبصورت اور آراستہ ہوتی ہیں کشتیوں کے اندر جو مکان بنے ہوتے ہیں وہ بھی نہایت پر تکلف ساز و سامان سے سجے ہوتے ہیں۔ شنگھائی کانگ ٹونگ چین کے اتاچی متعینہ پیرس نے پلاش و بارسٹیل سے بیان کیا تھا کہ "یہ پھول والیوں" کے بجرے یورپین قحبہ خانوں کی طرح نہیں ہوتے بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک قسم کے تفریح خانے ہیں جہاں نوجوان چینی مرد گانا سننے، چائے پینے اور "پھول والیوں" سے لطف صحبت حاصل کرنے آتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ پھول والیاں ان نوجوانوں کے خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کا بھی انتظام کریں (حالانکہ دراصل ہوتا یہی ہے)

جاپان جاپان میں کسبیوں کی حالت ایسی ذلیل نہیں جیسی چین میں پائی جاتی ہے۔ جاپان بمقابلہ چین کے زیادہ مہذب و متمدن ہے۔ یہی باعث ہے کہ وہاں کی کسبیاں زیادہ خود دار ہوتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جاپان والے ان کو رحم، افسوس اور ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جاپان کی کسبیاں

آزادی کے ساتھ مردوں سے تعلقات رکھ سکتی ہیں، وہ اگر چاہیں تو شادی بھی کر سکتی ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ بڑے بڑے لوگوں سے شادی کر کے معزز بیویاں بن جاتی ہیں۔ کوکیمٹین نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ :۔

"جب میں ٹوکیو سے شہر یاکوہامہ کی طرف جا رہا تھا تو میں نے چار نوجوان مردوں اور تین خوبصورت نوجوان کسبیوں کو دیکھا جو ایک ہی موٹر میں بیٹھے ہوئے لطف صحبت اُٹھا رہے تھے، ان کے پاس مختلف شرابوں کی دو تین بوتلیں، سنترے اور خوبصورت کیک رکھے ہوئے تھے۔ آپ ملک چین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کر کے دیکھ لیں آپ کو اس قسم کا دلچسپ منظر کہیں نظر نہ آئے گا۔"

لیکن جاپانی کسبیوں کی جو تاریخ ایک انگریز سیاح نے اپنی کتاب "وہ شہر جہاں رات نہیں ہوتی" (The Night lesscity) میں تحریر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ جاپان میں قحبگی پر حکومت نے سخت قواعد ضوابط عائد نہیں کیے ہیں لیکن اس کو ذلت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور بعض اوقات کسبیوں کو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب کسبی بالکل غلام سمجھی جاتی تھی اور اُسکے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ مگر اب وہ بالکل آزاد ہے اور حکومت کسی ایسی بات کو گوارا نہیں کرتی جو اسکی آزادی میں خلل انداز ہو۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک جاپانی کسبیوں کی حالت بہت

اچھی تھی۔ اس وقت ان کو فن موسیقی اور علم مجلسی کی خاص طور سے تعلیم دیجاتی تھی لیکن اس کے بعد انھوں نے تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کم کردی جس نے سوسائٹی میں انھیں ذلیل کردیا لیکن نہ اسقدر جتنی ذلت ہر جگہ پائی جاتی ہے ماتزنان (Makignam) کا بیان ہے کہ اسوقت بھی جاپان میں کسبیوں کو زیادہ ذلیل نہیں سمجھا جاتا اور نہ ان میں اس قدر بیحیائی پائی جاتی ہے جتنی یورپ کی کسبیوں میں ہوتی ہے۔ اگرچہ جاپان میں ان کا نظام اسیطرح قائم کر دیا گیا ہے جیسے سرکاری ڈاکخانوں یا تارگھر کا، لیکن پھر بھی بے قاعدہ فحش بکثرت ہوتا ہے۔ پیشہ ور عورتوں کو ایک خاص محلہ میں رہنا پڑتا ہے جسے جاپان کی اصطلاح میں یوشی وارہ (Yoshi Wara) کہتے ہیں ان کے مکان نہایت صاف ستھرے خوبصورت و آراستہ ہوتے ہیں لیکن اس زمانہ میں چونکہ جاپان کی کسبیاں زیادہ تر مغربی وضع قطع اختیار کرنے لگی ہیں اس لیے ان کا قدیم ذوق معاشرت مفقود ہوتا جاتا ہے۔

تقریبًا دو صدی پہلے جاپان میں کسبیوں کا زوال شروع ہو گیا تھا اور یہ اس زمانہ میں وہاں گیشا (Geishas) عورتوں کا طبقہ پیدا ہوا حکومت نے ان پر بھی بعض ایسی قیود عائد کردی ہیں جن کے باعث وہ فحاشی میں باقاعدہ کسبیوں سے مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں لیکن ان عورتوں کے لیے اتنی آزادی ضرور ہے کہ وہ لائسنس دار، باقاعدہ کسبیوں کیطرح "یوشی وارہ" میں رہنے پر

مجبور نہیں ہیں۔

کوریا کوریا میں بھی یہ طبقہ زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے اور جاپان کے قابض ہونے سے قبل وہاں رقاصہ اور فاحشہ عورت میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ آنگس ہملٹن (Angus Hamilton) نے اپنی کتاب "کوریا" میں لکھا ہے کہ :۔

"یہاں جو اعلیٰ طبقہ کی ڈیرہ دار اور خاندانی کسبیاں ہیں، ان کو عموماً بہت اچھی تعلیم دیجاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ عورتیں حاضر جوابی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور علم مجلسی میں کمال حاصل کر لیتی ہیں، انکی صحبت اسقدر دلچسپ ہوتی ہے کہ اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان ڈیرہ دار اور اعلیٰ طبقہ کی تعلیم یافتہ کسبیوں کو یہاں کی اصطلاح میں گیسانگ (Gisaing) یعنی "ورق النور" کہتے ہیں اور ان کی حالت تقریباً ویسی ہی ہے جیسے جاپان کیا "گیشا" عورتوں کی۔ سرکاری حیثیت سے ان عورتوں کا تعلق بھی ایک سرکاری محکمہ سے ہے، ان کے ساتھ درباری مغنّی اور گویّے بھی ہوتے ہیں ان عورتوں کو قومی خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے اور قصر شاہی کے تمام جلسوں، درباروں اور ضیافتوں میں ان کو شریک ہونا پڑتا ہے۔ یہ عورتیں تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ ناچ گانے اور فنون لطیفہ میں انھیں دسترس حاصل ہوتی ہے، وہ نہایت سلیقہ سے لباس پہنتی ہیں اور عموماً نازک بدن

ہوتی ہیں، بلحاظ حسن و جمال یہ عورتیں "کوریا" بھڑ بھی جوتی کا پھول"
سمجھی جاتی ہیں لیکن بایں ہمہ انھیں اس بات کی اجازت نہیں کہ
کسی عالی نسب مرد سے شادی کریں۔"

تحبگی قدیم روم میں یورپ کے بہت سے معاشرتی مسائل کی طرح رسم تحبگی بھی غالباً قدیم روم سے یہاں آئی۔ لیکن ادارہ فحاشی کی نسبت یہاں کے لوگوں کی بھی رائیں متضاد تھیں اور اب تک یہی حالت چلی جاتی ہے۔ یونان قدیم میں یہ حالت نہیں تھی کیونکہ عوام کے دلوں سے "مذہبی فحاشی" کی یاد فراموش نہ ہوئی تھی اور پیشہ ور عورتوں کا بڑا اثر پایا جاتا تھا، یونان کے علاوہ یورپ میں کبھی کسی کسبی کو اس قسم کا موقع نہیں دیا گیا۔ ہاں فرانس میں البتہ کوئی کسبی خفیف سا اثر پیدا کر لیتی تھی۔ علاوہ ازیں رومیوں کے طبائع بھی یونانیوں سے مختلف تھے۔ یونانی شائستہ تھے اور رومی وحشی، یونانیوں کے مزاج میں نفاست تھی اور رومیوں کے مزاج میں عسکریت۔ اسی لیے رومی یہ تو ممکن تھا کہ وہ کسبیوں کے وجود کو گوارا کر لے، لیکن وہ یہ کبھی پسند نہیں کر سکتا تھا کہ ان کے وجود سے جو قدرتی نتائج پیدا ہو سکتے ہیں ان کے سامنے بھی سر تسلیم خم کر دے۔

حکیم سسرو (Cicero) جو روما کا بہت بڑا معلم اخلاق تھا اگرچہ بظاہر یہ نہیں کہتا تھا کہ یہ پیشہ اچھی چیز ہے مگر اس کا قول یہ ضرور تھا کہ

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ نوجوانوں کو کسبیوں سے حظ اٹھانے میں کون شخص مانع ہو سکتا ہے۔" روم والے کسبیوں سے ضرور ملتفت ہوتے تھے اور ان کے پاس اعلیٰ طبقہ کی کسبیاں بھی ضرور ہوتی تھیں جنہیں وہ "(Bona Malier)" کہا کرتے تھے لیکن ان کی وہ عزت و قعت نہیں تھی جو قدیم یونان کی "ہتائرہ" کو حاصل تھی۔ رومیوں کے مزاج کی سختی انھیں اس طبقہ کی زیادہ مرید نہ ہونے دیتی تھی۔ یہ لوگ قحبہ خانوں کی حوصلہ افزائی ضرور کرتے تھے لیکن جب وہاں جاتے تھے تو منھ چھپا کر تاکہ کوئی پہچان نہ سکے بلکہ کسبیوں کو یہ ہدایت تھی کہ وہ ایک خاص رومی پوشاک جس کا معزز طبقہ کی خواتین سے تعلق تھا اور جسے "وٹا" (Vitta) یا "اسٹولا" (Stola) کہتے تھے، ہرگز نہ پہنیں۔

مسیحیت کا اثر فحاشی پر | جب دین مسیحی کا دور آیا تو خیال تھا کہ ادارہ فحش کی بنیاد متزلزل ہو جائے گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسیحیت کے دور میں بھی کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں سے قدیم بت پرستی کی یاد فراموش نہ ہوئی تھی اور مسیحی فرمانرواؤں کو ایک مخلوط اور سرکش رعایا پر حکومت کرنی پڑتی تھی، علاوہ ازیں کلیسائے مسیحی کے ممتاز پادری اس مسئلہ میں رواداری برتنا چاہتے تھے تاکہ فتنے برپا نہ ہوں اور فحاشی کے جراثیم معزز گھرانوں سے دور رہیں۔ اس کے علاوہ مسیحی شہنشاہوں کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ اپنے پیش رو حکمرانوں کی طرح ادارہ فحش سے آمدنی حاصل کریں

مگر جو آزادی کسبیوں کو عہد بت پرستی میں حاصل تھی وہ اب غائب ہو چکی تھی بلکہ بعض جوشیلے مسیحی فرمانروا اس امر کی کوشش کرتے تھے کہ سخت قوانین نافذ کرکے اس پیشے کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ شہنشاہ تھیوڈوسیس اور ویلنٹینین نے فرمان جاری کیا کہ قلمروئے روم میں تمام قحبہ خانے بند کر دیئے جائیں اور اگر کوئی شخص کسی کسبی کو پناہ دے تو اسے سخت سزا دی جائے۔ اس حکم کی توثیق بعد میں جسٹینین نے بھی کی اور حکم دیا کہ تمام کسبیوں کو خارج البلد کیا جائے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

اس کے بعد ہزار برس تک وقتاً فوقتاً یورپ میں اسی قسم کے فرامین جاری ہوتے رہے۔ لیکن سب بیکار ثابت ہوئے۔

قوم ورزگوت (Visigothes) کے ایک بادشاہ تھیوڈورک (Theodoric) نے ہر اس شخص کے لیے جو پیشۂ قحبگی کو ترقی دینے کی کوشش کرے سزائے موت مقرر کی اور چھٹی صدی میں اسی قوم کے ایک بادشاہ نے جو کیتھولک مذہب کا پیرو تھا اور جن کا نام (Recared) تھا ادارۂ قحبگی کا قطعی انسداد کر دیا اور فرمان نافذ کر دیا کہ اگر ملک میں کوئی ایسی عورت پائی جائے تو اسے کوڑے لگا کر شہر سے نکال دیا جائے۔ علاوہ ازیں شہنشاہ شارلمین، پیرشاہ فرانس جانشین شارلمین نے اور کچھ عرصہ بعد جرمنی میں فریڈرک باربروسہ نے کسبیوں کے خلاف نہایت سخت قوانین بنائے مگر

سب ہی نتیجہ ثابت ہوسے

قحبگی کے خلاف جہاد

قحبگی کے خلاف سب سے زیادہ سخت جہاد فرانس میں ہوا، لوئی نہم نے ۱۲۵۴ء میں حکم جاری کیا کہ ملک کی تمام کسبیوں کا اسباب چھین کر انھیں ملک سے نکال دیا جائے۔ اسی بادشاہ نے ۱۲۵۶ء میں اسی فرمان کا پھر اعادہ کیا اور ۱۲۶۹ء میں جب وہ صلیبی جہاد کے لئے فلسطین جانے لگا تو اس نے حکم دیا کہ تمام کسبیوں کے گھر اور قحبہ خانے مسمار کر دیے جائیں۔ لیکن ان احکام کا اثر ملک پر اُلٹا پڑا یعنی پہلے کسبیاں الگ تھلگ رہا کرتی تھیں اور اب وہ مجبور ہو کر عام لوگوں میں شامل ہو گئیں اور اس طرح ان کا اثر بہت زیادہ پھیل گیا حتیٰ کہ جب شاہ لوئی ممالک مشرق میں مسلمانوں کے خلاف جہاد کر رہا تھا اور اتقاء و نکوکاری کا زبردست علمبردار بنا ہوا تھا اس وقت بھی اس کے لشکر میں عصمت فروشی ہوتی تھی اور لشکر تو کیا خود شاہی خیموں کے باہر قریب جوار کے خیمے کسبیوں کے اڈّے بنے ہوئے تھے۔

سترھویں صدی کے وسط تک شاہ لوئی کے فرامین کا اس طرح بے سود اعادہ ہوتا رہا اور جب ۱۵۶۰ء میں چارلس نہم نے ایک فرمان جاری کر کے ملک کے تمام قحبہ خانے توڑ دیے تو کسبیوں کی تعداد میں دراضافہ ہو گیا یعنی اگر پہلے کھلے قحبہ خانے موجود تھے تو اب ملک بھر میں خفیہ اڈّے قائم ہو گئے جن پر

کوئی شخص شبہ نہیں کر سکتا تھا اور جو سرکاری قحبہ خانوں سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔

الغرض باوجود سخت جہاد کے بھی یورپ میں فحاشی کا انسداد نہ ہو سکا اور اٹھارویں صدی کے پیرس میں تو اس کو اس قدر ترقی ہوئی کہ قحبہ خانے نہایت شاندار اور پُر تکلف عمارتوں میں نظر آتے تھے۔

مانتوا (Mantua) میں کسبیوں کے خلاف نفرت و حقارت کے اس قدر جذبات پھیلے کہ ان کو بازار میں سڑے ہوئے پھل اور خراب شئی کھانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہی حالت ۱۲۴۳ء میں اوگنان (Avignon) کی تھی اور کیٹلونیہ (Catalonia) میں بھی کسبیوں کو اس قدر ذلیل کیا جاتا تھا کہ انہیں کسی معزز خاتون کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھنے نہ دیا جاتا تھا نہ وہ کسی معزز آدمی کے ساتھ کھانا کھا سکتی تھی۔

وینس میں، انسداد فحاشی کے لیے بے شمار سخت قوانین نافذ کیے گئے لیکن ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، چنانچہ سترھویں صدی کی ابتدا میں کوریات (Coryat) نے شہر وینس کی سیر کی تو اس نے اپنی کتاب (Crudities) میں وہاں کی کسبیوں کا بھی دلچسپ و مفصل حال لکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

"ان دنوں وینس میں کسبیوں کی تعداد بیس ہزار تھی جن سے حکومت کو اسقدر ٹیکس وصول ہوتا تھا کہ ایک درجن جنگی جہاز انکے عطیے کی مدد سے آراستہ

پورے ہوتے تھے۔"

یورپ میں انسداد فواحش کے لیے سب سے آخری کوشش اٹھارویں صدی کے وسط میں وائنا کی ملکہ ماریا تھریسا (Maria Theresa) نے کی تھی۔ اس نے لوگوں کو قید کیا، ان سے جرمانہ وصول کیا، سزا کے تازیانے لگائے اور مختلف قسم کے عذاب میں مبتلا کیا۔ عورتوں کو اونچا لباس پہننا منع کیا گیا، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کا سختی کے ساتھ معائنہ کیا جانے لگا۔ میخانوں کی سخت دیکھ بھال ہونے لگی۔ ایسے مقامات میں خادماؤں کا رکھنا ممنوع قرار پایا اور ۱۷۵۱ء میں ایک کمیشن جس کا نام (Chastity Commission) تھا قائم کیا گیا لیکن شہنشاہ جوزف ثانی نے تخت نشین ہوتے ہی اس کمیشن کا خاتمہ کردیا۔

جے شرنیک (J. Shrank) نے اپنی کتاب (Dupzostitution in Wife) میں لکھا ہو کہ "ان سخت قوانین سے فحاشی کا خاتمہ تو کیا ہوتا، اس میں اور زیادتی ہوگئی اور یہ واقعہ ہے کہ جس قدر فحاشی وائنا میں ہوتی تھی یورپ کے کسی شہر میں نہ ہوتی تھی۔

قرون وسطیٰ کے ادارات فحش پیشہ ور عورتوں کی حالت ہر ملک میں مختلف رہی ہے۔ بلکہ ایک ہی وقت اور ایک مقام میں انکی حالتوں میں تفاوت رہا ہے۔ ددفور (Do Foun) نے لکھا ہو کہ:۔

"ان پہ ہر طرح کا ظلم و ستم ہوتا تھا لیکن ملک کے تمام طبقوں میں فحاشی کا

شوق پایا جاتا تھا اور نوجوانوں کو تو بغیر ایسی عورتوں کے جینا محال تھا۔"

چودھویں صدی میں بعض ممالک نے جن میں انگلستان بھی داخل ہے ان کو مجبور کیا کہ وہ ایک خاص قسم کا لباس پہنا کریں جس سے انکا پیشہ ور ہونا ظاہر ہو۔ لیکن اکثر حالتوں میں ان کی کوئی تذلیل نہیں کی جاتی تھی بعض اوقات جب کوئی بادشاہ یا شاہی خاندان کا آدمی کسی بڑے شہر میں جاتا تھا تو ان کی جو ضیافتیں سرکاری طور پر کی جاتی تھیں ان میں رقص و سرود اور تفریح طبع کے لیے یہ بھی طلب کی جاتی تھیں۔

فرانس میں قحبہ خانوں کو (Abbayes) کہتے تھے اور وہاں کی مشہور و معروف قحبہ خانے (Ment Pellie اور Toulouse) میں تھے جن کا حال (Rasatana) نے بھی بیان کیا ہے۔ ڈرخیم (Durkheim) کا خیال ہے کہ قرونِ وسطیٰ اسے پہلے آزادانہ عشقبازی اور نکاح کے درمیان بہت کم فرق تھا لیکن جب قرونِ وسطیٰ میں طبقہ متوسط کو عروج ہونے لگا تو اسکو اپنی بیویوں اور بیٹیوں کی حفاظت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اس لیے ان لوگوں نے کوشش کر کے فحاشی کے لیے علیحدہ ادارہ قائم کر دیا جس کی سرکاری طور پر نگرانی ہونے لگی۔ یہ تھی ابتدا گویا "سرکاری قحبہ خانہ کی"۔ ان قحبہ خانوں کو "ادارت خدمت عامہ" قرار دیا گیا اور جو لوگ ان کا انتظام کرتے تھے وہ "ملازمان سرکار" سمجھے جاتے تھے۔ ان لوگوں کا فرض تھا

کہ وہ اپنے متعلقہ قحبہ خانہ میں کسبیوں کی ایک مقررہ تعداد رکھیں، مقررہ فیس لوگوں سے وصول کریں اور پاس پڑوس کی عورتوں کو داخل نہ کریں، یورپ میں اس قسم کے قحبہ خانے تین سو برس تک قائم رہے لیکن جب پیروان فرقہ پروٹسٹنٹ کا زور ہوا اور ادھر امریکہ کی طرف سے آتشک کی بیماری آگئی تو قرون وسطیٰ کے قحبہ خانوں پر زوال آگیا۔

اعلیٰ معیار کی پیشہ ور عورتیں اعلیٰ طبقہ کی پیشہ ور عورت جسے انگریزی میں کورٹ زن (Courtesan) کہتے ہیں اور جو پبلک قحبہ خانوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ یورپ کے دور ارتقار کی پیداوار ہے اور یہ سب سے پہلے پندرھویں صدی میں اطالیہ کے اندر رونما ہوئی لفظ "کورٹ زن" یا "کورٹی جیانا" کے معنی دراصل وہی ہیں جو اس املاء سے ظاہر ہو رہے ہیں یعنی "درباری عورت" یا "دربار کی محبوبہ" اور یہ وہ عورتیں تھیں جو شاہی حشم و خدم کے ساتھ رہتی تھیں، چنانچہ اسکندر بورجیا (Alexander Borgia) کا پاپائی دربار بھی ان سے خالی نہ تھا برچارڈ (Burchard) نے جو اس زمانہ کے دربار پاپائیت کا نہایت سچا مورخ ہے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ:-

"ماہ اکتوبر ۱۵۰۱ء میں پاپائے اعظم نے حکم دیا کہ دربار میں پچاس ایسی عورتیں لائی جائیں۔ چنانچہ حکم کی تکمیل کی گئی عشاء کے بعد یہ عورتیں

قیصر بورجیا (Caisar Borgia) اور اس کی بہن لقریزیہ (Lucrezia) کے سامنے پہلے تو پشوازیں پہن کر اہل دربار کے ساتھ خوب ناچیں بعد ازاں انھیں ننگا نچایا گیا۔ اس کے بعد شمعدانوں کے کافوری کے جھاڑوں کی مختلف روشنیاں بنائی گئیں۔ شمعیں روشن کر دی گئیں اور فرش پر اخروٹ بکھیر کر ان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان بلوریں جھاڑوں کے درمیان جانوروں کی طرح چاروں ہاتھوں پاؤں سے چلیں اور اخروٹ چنیں۔ اس سلسلہ میں انعامات بھی تجویز ہوئے اور ان کو دیئے گئے جن کی بیحیائی اہل بزم کو زیادہ پسند آئی۔"

لفظ "کورٹ زن" کے وجود میں آنے سے قبل ان کا نام عام طور سے (Sinners) تھا اور اطالوی زبان میں ان کو پیکاٹرس (Pecgatrice) کہا کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ ان کو نہ صرف عام طور پر پسند کرتے تھے بلکہ ان کو ایک قسم کی عزت و وقعت بھی حاصل تھی۔ بعد کو اطالیہ میں بھی اعلیٰ طبقہ کی پیشہ ور عورتوں کا نام "امپیریا" (Imperia) ہو گیا اور دربار پاپائیت میں جو کسبی سب سے پہلے طلب کی گئی وہ لاطینی زبان کی فاضل ہونے کے علاوہ اطالوی زبان کی بھی ماہر تھی۔ یہ عورتیں فن موسیقی اور رقص میں بھی کمال حاصل کرتی تھیں الغرض یورپ کے عہد ارتقا کی پیشہ ور عورتیں قریب قریب ایسی ہی تھیں

جیسی قدیم یونان کی "ہتائرہ"

ان کی فیس دو روپیہ سے لیکر پچاس روپیہ تک ہوتی تھی۔ باندیلو (Bandello) نے لکھا ہے کہ:-

"شہر وینس کی پیشہ ور عورتیں متعدد چاہنے والے رکھا کرتی تھیں ہر شخص کے لیے ایک شب مقرر تھی۔ وہ اُس رات کو وہیں کھانا کھاتا اور وہیں رہتا۔ ہفتہ کے بقیہ ایام میں اسے اس سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا۔ ہر شخص کی طرف سے ماہوار تنخواہ مقرر ہوتی تھی لیکن اس کو یہ حق ہمیشہ حاصل رہتا تھا کہ اگر کسی روز وہ اپنے نفع کے لحاظ سے دوسرے شخص کو بلالے تو وہ اُس دن کے آنے والے کا وقت بدل دے۔"

یورپ کی بعض تاریخی پیشہ ور عورتیں کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کسی بازاری عورت نے کوئی تاریخی خصوصیت نہ حاصل کی ہو۔ لیکن چونکہ اس طبقہ سے عوام کو ہمیشہ بے اعتنائی رہی ہے اس لئے مؤرخین نے مختلف ممالک کی کسبیوں کے حالات کی طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن یورپ کے بعض مورخین نے مغرب کی بعض ایسی مشہور عورتوں کے حالات لکھے ہیں۔ مثلاً:-

(طولیہ دی آرا گونہ) یہ یورپ کے قرون وسطیٰ میں سب سے زیادہ ممتاز عورت تھی اور کہا جاتا ہے کہ مشہور مسیحی پادری کارڈنل۔ ڈی۔ آراگونہ کی لڑکی تھی۔ اس کی ماں بھی ایک کسبی تھی جس کا تعلق کسی پادری سے ہو گیا تھا للّف

یہ ہے کہ خود کارڈنل بھی اگرچہ ہسپانیہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، مگر تھے کسی کے پیٹ سے۔ یہ عورت اپنی اعلیٰ فلسفیانہ شاعری کی وجہ سے بہت مشہور ہو گئی تھی۔ اسکی ایک چہاردہ مصرعی نظم (Sonnet) بیحد مشہور ہے جو اس نے ایک بست سالہ خوبصورت جوان کی محبت میں لکھی تھی۔

یہ عورت نہایت روشن خیال اور مہذب تھی۔ بالآخر اس نے متنفر ہو کر یہ پیشہ چھوڑ دیا۔ اس کی ہر شخص عزت و وقعت کرتا تھا۔ ۱۵۴۶ء میں فلورنس کے حاکم نے فرمان جاری کیا کہ تمام کسبیاں چہرہ پر زرد نقاب ڈالا کریں یا ہاتھ میں زرد رومال رکھا کریں جس سے ہر شخص پر ان کا پیشہ ظاہر ہو جائے۔ طولیہ نے اسکی شکایت نواب بیگم سے کی جو ایک اعلیٰ سیرت کی ہسپانوی خاتون تھی اس خاتون نے اپنے شوہر پر زور ڈال کر طولیہ کو اس ذلت انگیز حکم سے "بوجہ اعلیٰ فلسفیانہ شاعری" کے مستثنیٰ قرار دیا۔ اسکے بعد طولیہ نے اپنی نظمیں نواب بیگم کے نام سے منسوب کیں۔ طولیہ بہت خوبصورت تھی، اسکے سنہرے بال اور بڑی بڑی آنکھیں خاص طور پر لوگوں کو بہت محبوب تھیں اسکی آنکھوں میں موہنی تھی وہ جس طرف دیکھ لیتی تھی لوگ مسحور ہو جاتے تھے اور یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص اسکے سامنے آئے اور مرعوب نہ ہو جائے۔

(ورونیکا فرانکو) یورپ کی دور نہضت کی کسبیوں میں سب سے ممتاز ورونیکا فرانکو (Veronica Franco) تھی جو ۱۵۴۶ء میں بمقام وینس

پیدا ہوئی تھی۔ یہ متوسط طبقہ کی لڑکی تھی جس کی شادی کمسنی میں ایک ڈاکٹر سے ہوگئی تھی۔ شاعری اور فنون لطیفہ کے لیے اس کا دماغ بہت موزوں تھا متعدد زبانیں جانتی تھی، گاتی بھی نہایت اچھا تھی اور مختلف ساز نہایت عمدگی سے بجا سکتی تھی۔ وہ صرف حسین ہی نہ تھی بلکہ اپنے ناتجربہ کار چاہنے والوں کے حق میں ناصح مشفق بھی تھی۔ مثلاً ایک نوجوان لڑکا جو ہنوز طالبعلم نہ تھا اس پر عاشق ہوا۔ درونیکا نے اس نوجوان کو نصیحت کی:-

"آپ جانتے ہیں کہ جن لوگوں کو مجھ سے دعوائے محبت ہے اور جو یقیناً مجھے بھی بیحد پیارے ہیں وہ نہایت سختی کے ساتھ اپنی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر مجھے اس قدر استطاعت حاصل ہوتی تو میں اپنا تمام وقت خاموشی کے ساتھ قابل لوگوں کی صحبت میں صرف کرتی۔"

ایک مرتبہ وہ ایک مسیحی پادری پر عاشق ہوئی اور فریفتگی کی حالت اس درجہ تک پہنچی کہ جب تک وہ پادری کو دیکھ نہ لیتی اُسے چین نہ پڑتا لیکن چونکہ پادری صاحب بہت محتاط تھے اس لیے یہ تعلق دوستی کی حد سے آگے نہ بڑھا۔ ایک مرتبہ شاہ فرانس ہنری سوم کو بھی اسکی ملاقات کا شوق دامنگیر ہوا اور چلتے وقت وہ درونیکا کی تصویر بھی لیتا گیا۔ وہ فنون لطیفہ کی بیحد حامی تھی وہ جس سے دوستی کرتی تھی ہمیشہ خلوص کے ساتھ کرتی تھی۔ وہ اسقدر شائستہ

تھی کہ بعض اعلیٰ طبقہ کی شریف زادیاں بھی اس کی دوست بن گئی تھیں ۱۵۸۰ء
میں اس نے کلیسا میں قرار کیا کہ اس کے پیٹ سے چھ بچے پیدا ہوئے تھے
اس نے ۱۵۹۱ء میں بعارضہ بخار وفات پائی۔

(نینون دی لنکلوس) نینون دی لنکلوس (Ninon De Lenclos)

بھی نہایت بلند ذوق کی عورت تھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی اعلیٰ فطرت اور اچھی عقل و
فہم والی عورت تجملی سے خوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن نینون اس کلیہ سے
مستثنیٰ تھی۔ اس میں تمام اوصاف پسندیدہ موجود تھے مگر وہ پیر بھی کسبی
تھی۔ یہ عورت سترھویں صدی کی ابتدا میں پیدا ہوئی۔ ماں باپ دونوں طرف
سے نجیب الطرفین تھی۔ یہ سولہ یا سترہ برس کی عمر تھی جب اس کا پہلا
چاہنے والا پیدا ہوا۔ اس کا نام گیسپارڈ ڈی کولگنی (Gaspard De
Coligny) تھا۔ اس کے بعد نصف صدی تک اس کے چاہنے والوں کا
سلسلہ لگاتار قائم رہا۔ بعض اوقات ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ
چاہنے والے اس کے موجود رہتے تھے لیکن اس کا نباہ تین برس سے زیادہ
کسی سے نہ ہوا۔ اس عورت کی صورت ایسی اچھی تھی کہ خاندان سیونزنہ
(Sevignes) کی تین پشتیں اس کے چاہنے والوں میں گزریں
لیکن اس کا جمال اسی طرح قائم رہا۔ یہ عورت بہت بیغرض تھی اور عام
کسبیوں کی طرح اسے زر و مال کی کوئی طمع نہ تھی۔ اس زمانے کے بڑے بڑے آدمی اسکی

عزت و آبرو کیا کرتے تھے۔ وہ بہت باوقار اور صاحب عظمت عورت تھی۔ جو رونق اور دلچسپی اس کے چھوٹے سے دربار میں رہتی تھی وہ اس زمانہ کی شہزادیوں تک کو نصیب نہ تھی۔

انسداد فحبگی کے لیے سعی و کوشش

ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ انسداد فحبگی کے لیے وقتاً فوقتاً سخت قوانین نافذ کیے گئے اور حد درجہ ظالمانہ فرامین جاری ہوئے جن سے انسداد فواحش کے بجائے اس میں اور زیادہ ترقی ہوئی اسلیے دَورِ نہضت میں ارباب حل و عقد نے عاجز آکر فحبگی کے خلاف جہاد کرنا بھی ترک کر دیا، لیکن اس کے بعد موجودہ زمانے میں بھی اس کے انسداد کے لیے وقتاً فوقتاً سخت تدابیر اختیار کی جاتی رہیں اور آخر کار اب زمانہ بھر نے تسلیم کر لیا کہ علاج مرض سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

سنہ ۱۸۰۶ء میں پیرسٹھر کے میئر بلدیہ نے حکم جاری کیا کہ اگر کسی نے ان عورتوں کو پناہ دی تو اس کی سخت سزا دی جائے گی۔ اسی کے ساتھ ایک دن مقرر کر کے شہر بھر کی تین چار سو بدنصیب کسبیوں کو پکڑ لیا گیا۔ بعض کی حالت اس قدر خستہ اور ردّی تھی کہ ان کے تن پہ چیتھڑا تک نہ تھا، پھر ان کی کئی دن تک بازاروں میں تشہیر کی گئی اور محتاج خانہ (Work House) پہونچا دیا گیا۔ لیکن وہاں ان کو داخل نہیں کیا گیا۔ اسکے بعد یہ چند روز تک

یونہی خانہ خراب پھرتی رہیں۔ پھر مجبور ہو کر ان کو گھر جانے کی اجازت دیدی گئی۔
اسی قسم کی بہت سی کوششیں امریکہ میں بھی کی گئیں۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں ریاست
پنسلوینیا کے مقام پٹسبرگ میں کسبیوں کے مکانات بند کر دیے گئے، ان کو
بازاروں میں نکال دیا گیا اور کسی فرد بشر نے ان کو نہ رہنے کو جگہ دی نہ کھانے
کو ٹکڑا۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی یہ حالت دیکھ کر تمام ملک میں رحم و کرم کے
جذبات مشتعل ہو گئے۔ اور ارباب حل و عقد کو پگڑی سنبھالنا دشوار ہو گیا
حال ہی میں نیویارک کے اندر بھی ایسا ہی واقعہ گزرا اور اس کے نتائج
بھی ایسے ہی افسوسناک نکلے۔

قحبگی کے متعلق قواعد و ضوابط

جب انسداد فحاشی میں کسی طرح کامیابی نہ ہوئی تو ارباب حل و عقد کا
میلان خاطر اس طرف ہوا کہ قحبگی کے متعلق قواعد و ضوابط وضع کر کے اس
کو قاعدہ کے اندر لے آیا جائے اور حکومت کی نگرانی میں لے لیا جائے
تاکہ اس فعل سے جو نتائج تیجہ پیدا ہوتے ہیں ان کی روک تھام ڈاکٹروں
اور پولیس افسروں کے ذریعہ سے ہو سکے اس غرض سے جدید قحبہ خانے
قائم ہوئے جو قرون وسطیٰ کے قحبہ خانوں یا چکلوں سے بعض صورتوں میں مختلف تھے
انکا طبی معائنہ کیا جاتا تھا اور بغیر لائسنس کے یہ پیشہ نہ کر سکتی تھیں۔ اس
طریقہ کا سب سے بڑا حامی برنارڈ مینڈیویل (Bernard Mandeville) تھا۔

۱۷۲۴ء میں اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "سرکاری قحبہ خانوں کی سنجیدہ حمایت" (Modest Defence of Public Stews) تھا۔ اس کتاب میں اس نے یہ بحث کی کہ:۔

"اگر پبلک قحبگی کی حمایت اور حوصلہ افزائی کی گئی تو اس سے اس گناہ کی نہ صرف بدترین مضرتیں کم ہو جائیں گی بلکہ عام حرامکاریوں میں بھی کمی ہو جائے گی اور قحبگی کے حدود تنگ ہو جائیں گے۔"

اس نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر بذریعہ قانون پارلیمنٹ کسبیوں کو خاص حقوق عطا کر دیے گئے اور ان کے ساتھ خاص رعایتیں کی گئیں تو اس سے خانگی فحاشیوں میں کمی ہو جائے گی۔ اس نے یہ طریق عمل تجویز کیا کہ شہر کے کسی خاص محلہ میں سو قحبہ خانے تعمیر کئے جائیں جن میں دو ہزار کسبیاں رہ سکیں۔ ان سب کو ایک سو تجربہ کار اور قابل عورتوں کے اہتمام اور نگرانی میں دیدیا جائے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر اور سرکاری کمشنر بھی انکی نگرانی اور دیکھ بھال کرتے رہا کریں لیکن لوگوں نے اس تجویز کو دیوانگی سمجھا اور کوئی توجہ نہ کی گئی لیکن یہ کام اسی برس کے بعد نپولین اعظم کے ہاتھوں انجام پذیر ہونا مقدر ہو چکا تھا جس نے گزشتہ صدی میں موجودہ یورپین قحبگی پر بیحد اثر ڈالا۔

مگر اب کسبیوں کو درج رجسٹر کرنا، انکی نگرانی، ان کے متعلق قواعد و ضوابط کا انضباط اور ان کا طبی معائنہ ایک فسانۂ ماضی ہو گیا ہے۔ اس مسئلہ پر

بڑے بڑے جھگڑے ہوئے جن میں سب سے زیادہ وہ ہے جو انگلستان میں دربارہ "قوانین امراض متعدی" برسوں تک ہوتا رہا، اس کی کل روئداد ایک منتخب کمیٹی کی رپورٹ میں درج ہے جو ان قوانین کے متعلق بنائی گئی تھی اور جو ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی۔ لیکن یہ قوانین ۱۸۸۶ء میں منسوخ کر دیے گئے۔ پھر اس کے بعد انگلستان میں ان قواعد و ضوابط کے نفاذ پر کوئی زور نہیں دیا گیا۔ اس وقت بھی اگرچہ یورپ کے مختلف ممالک میں پرانے قواعد و ضوابط باقی ہیں مگر محض برائے نام ہیں اور علمائے نفسیات اور ماہرین علم معاشرت نے بھی یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ کسبیوں کو ستانا قطعی وحشت و بربریت ہے۔

لیکن جو تکالیف و مصائب عالم انسانی پر آتشک سوزاک کے ذریعہ سے نازل ہوتے ہیں جو بالواسطہ قحبگی کے نتائج ہیں، انھیں دیکھتے ہوئے یہ خیال ضرور گزرتا ہے کہ ممکن ہے کوئی شخص کسی زمانہ میں ان کے انسداد کے لیے کوئی نیا طریقہ سوچے۔ فرانس میں کسبیوں کی رجسٹری اور قحبہ خانوں کی نگرانی کا سلسلہ ۱۸۰۲ء سے شروع ہوا تھا اور ۱۸۲۵ء سے ڈاکٹری معائنہ کا کام بھی جاری کر دیا گیا تھا، جو اب تک چلا آ رہا ہے۔ لیکن فرانس کے بڑے بڑے اہل الرائے ان مستبدانہ طریقوں کے قطعی خلاف ہیں۔ جرمنی میں بھی قحبہ خانوں پر سختی اور ان کی سرکاری نگرانی اور نگہداشت کے خلاف

ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی تھی جس کی قیادت برلن یلا سچکو (Blaschko) نے کی۔

جرمنی میں قحبہ خانوں کا سرکاری انتظام اور نگرانی ابھی تک جاری ہے جس کے نتائج خود اہل جرمنی کے نزدیک بھی افسوسناک ہیں۔ مثلاً جرمن قانون کی رُو سے اگر کوئی شخص اپنے مکان میں مرد و زن کے ناجائز تعلقات ہونے دے تو وہ مستوجب سزا ہوگا۔ اس حکم کا اصلی مقصد یہ ہے کہ بغیر لائسنس کے قحبگی کا انسداد کیا جائے، مگر درحقیقت اس کا نتیجہ اُلٹا نکلتا ہے۔ یعنی امریکہ اور یورپ کے بعض ممالک میں اگرچہ جوان لڑکے اور لڑکی کا شادی سے قبل تعلقات رکھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن جرمنی میں اس خیال سے اس تعلق کو بُرا نہیں خیال کرتے کہ ممکن ہے اس کے بعد دونوں میں باقاعدہ شادی ہو جائے جرمنی کی پولیس ایسے لڑکے اور لڑکی کو سخت پریشان کرتی ہے اور ان کے ایسے پرائیویٹ تعلقات کو بغیر لائسنس قحبگی قرار دیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ پولیس کی ایذا برداشت کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ باقاعدہ قحبہ بن جائیں اور خود کو پولیس کی پناہ میں دیدیں جرمن قانون دراصل ان لوگوں کے خلاف ہے جو قحبگی کی آمدنی پر بسر اوقات کرنا چاہتے یا کرتے ہیں لیکن اس کے عملی نتائج اچھے نہیں نکلتے۔

اطالیہ میں بھی کئی بار قواعد و ضوابط جاری ہوئے اور پھر منسوخ کر دیے

گئے۔ سوئٹزرلینڈ میں مختلف اضلاع کے اندر مختلف قواعد و ضوابط بنا دیا کر کے تجربہ کیا جا رہا ہے، بعض علاقوں میں سوائے خاص حالات کے کسبیوں سے کوئی تعارض نہیں کیا جاتا لیکن بعض علاقوں میں معمولی فحاشی بھی قابل سزا سمجھی جاتی ہے۔ خاص شہر جنیوا میں صرف ان عورتوں کو پیشہ کرنے دیا جاتا ہے جو وہیں کی رہنے والی ہوں۔ لیکن زیوریخ (Zurich) میں ہر قسم کی قحبگی ممنوع ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں بھی باوجود تمام قواعد و ضوابط اور رعایتوں کے لوگوں کی عام اخلاقی حالت وہی ہے جو دیگر حصص یورپ میں پائی جاتی ہے اور یہی حالت لندن کی بھی ہے۔ اسی طرح ڈنمارک میں دیکھا گیا کہ تحریک انسداد قحبگی کا کوئی عمدہ نتیجہ نہیں نکلتا تو وہاں ۱۹۰۶ء سے یہ تحریک بالکل بند کر دی گئی۔

جو لوگ اس بات کے لیے بے حد شور و غل مچاتے تھے کہ کسبیوں کو درج رجسٹر کیا جائے، اب وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ تہذیب و تمدن اس قسم کی قید و بند کی منافی ہے۔ کیونکہ جن ممالک میں رجسٹری کا طریقہ جاری ہے وہاں بغیر لائسنس کی کسبیاں رجسٹری شدہ کسبیوں سے زیادہ ہوتی جا رہی ہیں۔ اب فرانس میں بھی جہاں سب سے پہلے قحبہ خانوں کو باقاعدہ نگرانی میں لیا گیا تھا چکلوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ اسلیے نہیں کہ قحبگی کم ہوتی جاتی ہے بلکہ اس لیے کہ ابادقی درجہ کے بردہ خانے، قہوہ خانے

اور ہوٹل جو بغیر لائسنس کے قحبہ خانے ہیں باقاعدہ چکلوں کی جگہ لیتے جاتے ہیں۔

ناکامی

البتہ بعض اب متمدن ممالک میں اس خیال کے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں جو قحبگی اور قحبہ خانوں کو سرکاری نگرانی اور سخت قواعد و ضوابط کی زنجیروں میں کسنا چاہتے ہیں۔ اب صرف یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ موقع محل اور مقامی حالات کو دیکھ کر کوئی ضابطہ مقرر کیا جائے ورنہ کسی عام قانون اور ضابطہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو لوگ قحبہ خانوں کو پولیس کی نگرانی میں رکھنے کے حامی تھے اب وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ایسا کرنا محال ہے۔ کیونکہ بہت سی لڑکیاں چھوٹی عمر سے اس مذموم فعل میں مبتلا ہو جاتی ہیں اس لیے کسبیوں کو بہت چھوٹی عمر سے درج رجسٹر ہونا چاہیے۔ لیکن یہ کام عملاً ناممکن ہے اور یہی وہ بات ہے جو لوگوں کو عام طور سے ناگوار گزرتی ہے۔

پیرس میں سولہ سال سے کم عمر کی لڑکی کو بطور قحبہ درج رجسٹر نہیں کیا جاتا حالانکہ اکثر لڑکیاں اس پیشہ میں بہت کمسنی سے پڑ جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں جب کوئی رجسٹری شدہ کسبی اپنے پیشہ سے گھبرا جاتی ہے یا کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے تو وہ پولیس کی نگرانی سے چپ چاپ نکل جاتی ہے اور کسی اور جگہ جا کر خفیہ طور پر پیشہ کرنے لگتی ہے جس سے بیماریاں اور زیادہ بڑھتی ہیں۔ علاوہ ازیں کسبیوں کے شبہ میں پولیس والے اکثر معزز عورتوں پر بھی زیادتی کر بیٹھتے ہیں جس کے باعث ان کے خلاف عام جذبات مشتعل

ہو جاتے ہیں۔

الغرض معلوم یہ ہوتا ہے کہ کسبیوں کا مسئلہ جس طرح اب سے تین ہزار برس پہلے لاینحل تھا، اسی طرح اب بھی ہے۔ اس کو معقول طریقہ سے سمجھنے کے لئے نہ صرف اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم قحبگی کی ابتدا اور ارتقا پر غور کریں بلکہ اس کے اسباب و علل اور موجودہ سوسائٹی سے اس کے تعلقات پر بھی کافی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آئندہ صفحات میں ہم اسی بات پر بحث کریں گے کہ قحبگی کے اسباب و علل کیا ہیں اور پیشہ ور عورتوں کا عام سوسائٹی سے کیا تعلق ہے۔

قحبگی کے اسباب و علل

قحبگی کی ابتدا اور ارتقا کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ ہمارے نظام ازدواج کا کوئی اتفاقی شاخسانہ نہیں ہے بلکہ اس کا ایک جزو لازم ہے۔ جب کنبہ کا نظام رفتہ رفتہ اجتماعی سے پدری بن گیا اور اس کی بنیاد زیادہ تر رشتہ ازدواج پر قائم ہونے لگی تو عورتوں کا اپنے آپ کو کسی ایک کو سپرد کر دینا روز بروز مشکل ہوتا گیا۔ قبیلہ کے پدری نظام پر خوب غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں لڑکی اپنے باپ کا مال ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ خود اپنے فائدہ کے لئے لڑکی کی حفاظت اسوقت تک نہایت احتیاط سے کرتا تھا جبتک کوئی بر پیدا ہو اور اس لڑکی کو خرید نہ لے۔ لڑکی قدر و قیمت سے

اس کی دوشیزگی کا خیال زیادہ وابستہ ہوتا گیا، اور اگرچہ پہلے زمانہ میں "دوشیزہ" وہ عورت سمجھی جاتی تھی جو اپنے نفس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینے میں آزاد ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ زمانہ آیا جب اس کے معنی اس عورت کے ہو گئے جس کو کسی مرد نے نہ چھوا ہو۔ جب لڑکی اپنے باپ کی طرف سے شوہر کی طرف منتقل ہوئی تو سسرال میں بھی اسکی طرح نگرانی ہوتی رہی۔ گویا باپ اور شوہر دونوں کے نزدیک یہی بات مفید تھی کہ وہ اس عورت کی مردوں سے حفاظت کریں۔ اس طریقہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ سوسائٹی میں ایسے نوجوان مرد و زن کی ایک جماعت کثیر پیدا ہو گئی جو محروم الازدواج تھے۔ کیونکہ بعض مردوں میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ وہ بیوی کا خرچ اٹھا سکیں اور بعض عورتیں ایسی بھی تھیں جو اپنی زندگی میں شادی سے مایوس ہو گئی تھیں، الغرض جب سوسائٹی اس حالت کو پہنچی تو فحاشی کا ہونا لازم تھا۔ اس طرح گویا بعض نوجوان عورتوں نے جو بلحاظ حسن جمال و شائستگی اپنی کچھ قدر و قیمت سمجھتی تھیں اپنے نفس کی قیمت لگا دی اور وہ آزادی کے ساتھ ناکتخدا مردوں کی خواہشات نفسانی عارضی طور پر پوری کرنے لگیں۔ اس طرح گویا فحبگی کی ابتداء ہوئی۔

موجودہ نظام معاشرت میں فحبگی کی حالت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارہ کا پوری طرح تجزیہ کر کے فحبگی کی خاص

خاص اسباب و علل بیان کئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے ہم کو اقتصادی اخلاقی، تمدنی اور حیاتی پہلوؤں پر غور کرنا چاہیئے۔

ہیولاک ایلیس کو ایک تجربہ کار شخص نے مندرجہ ذیل بیان لکھ کر بھیجا تھا جسے ہم اس کی کتاب "تعلقات نفسانی اور معاشرت" سے اقتباساً درج کرتے ہیں:-

"مجھے پیشہ ور عورتوں کا مختلف طریقوں سے تجربہ ہو چکا ہے اور میں بلا پس و پیش کہہ سکتا ہوں کہ ایسی عورتوں میں ایک فیصدی بھی ایسی نہیں ہوتیں جنہیں تعلیم یافتہ کہا جا سکے۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عموماً ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی روز افزوں تعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان عورتوں میں جذبات شرم و حیا کا اوائل عمر ہی میں فقدان ہو جاتا ہے اور سن بلوغ تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ لڑکیاں تعلقات زناشوئی سے واقف ہو جاتی ہیں۔ جب یہ لڑکیاں سن بلوغ کو پہنچ جاتی ہیں تو جن لڑکوں یا جوانوں سے انکی آشنائی ہوتی ہے وہ ان کو بیحیائی کی آخری حد تک پہنچا دیتے ہیں اس کے بعد وہ لڑکیاں کارخانوں اور دکانوں میں کام کرنے کے لیے جانے لگتی ہیں اور اگر وہ خوبصورت یا قبول صورت ہوتی ہیں تو کارخانوں کے مہتمم ان سے تعلق پیدا کر لیتے ہیں۔ اسی زمانہ میں ان لڑکیوں کو تو دو صورتیں

چیزوں اور سامان آرائش وزیبائش کا شوق ہو جاتا ہے اور وہ
کسی صاحب مقدور مرد کے ساتھ بحیثیت "مدخولہ" رہنے لگتی ہیں، ان
عورتوں کے متعلق ایک بات اور قابل ذکر ہے یعنی انھیں اپنے چاہنے
والے مرد کے ساتھ اختلاط کرنے میں چنداں لطف حاصل نہیں ہوتا بلکہ
وہ اپنے ہی جیسے مزاج اور طبیعت والے شخص کے اختلاط سے زیادہ
خوش ہوتی ہیں۔ میں ایسی بہت عورتوں کو جانتا ہوں جنھیں کسی بدمعاش
نے سبز باغ دکھا کر دام میں پھانسا، آبرو ریزی کی اور چھوڑ کر بھاگ
گیا۔ مے خانوں کی ساقیوں سے قحبگی میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوتا ہے
خصوصًا اس وجہ سے کہ وہ شراب خوار ہوتی ہیں اور شراب خواری عورت
کے لیے سم قاتل ہے۔ اس شوق میں مبتلا ہو کر عورت شرم وحیا بالکل
بالائے طاق رکھ دیتی ہے۔ دوسرا سبب لڑکیوں کے خراب ہونے کا یہ
ہے کہ وہ دیدہ زیب اور نظر فریب چیزوں کو پسند کرنے لگتی ہیں اور یہ
شوق ان میں ایسی عورتوں کی دیکھا دیکھی پیدا ہو جاتا ہے جو اس پیشے میں
داخل ہو چکی ہیں۔ مثلاً ایک جوان لڑکی صبح سے شام تک مزدوری
کرتی ہے اور وہ دیکھتی ہے کہ اس کے ہمسایہ میں کوئی عورت عمدہ لباس
پہنتی ہے تو اس کو دیکھ کر یہ غریب لڑکی بھی گمراہ ہو جاتی ہے یعنی
جب وہ اس سے دریافت کرتی ہے کہ ایسی عمدہ چیز یا ایسا نفیس

لباس کہاں سے آیا تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جاکر مروسی مانوس کرا دیتی ہے اور اس جماعت میں ایک فرد کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔"

سب سے زیادہ دلچسپ اسباب و علل وہ ہیں جو خود انھیں عورتوں کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض ممالک میں قحبگی کے اسباب و علل کا ان لوگوں نے بھی اندازہ لگایا ہے جنھیں سرکاری یا دیگر حیثیت میں ان سے واسطہ پڑتا ہے اور بعض ممالک میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب کوئی عورت پیشہ اختیار کرتی ہے تو اسے نام درج رجسٹر کراتے وقت یہ پیشہ اختیار کرنے کا سبب بھی بتانا پڑتا ہے۔ پیرنٹ دوشاتلے (Parent Dushatelet) نے جن کی کتاب قحبگی کے متعلق پیرس میں اب بھی مستند مانی جاتی ہے۔ ہر قسم کی کسبیوں کا حسب ذیل تخمینہ لگایا ہے۔

کل تعداد جس پر تخمینہ قائم کیا گیا	تعداد	اسباب
[illegible]	۱۴۴۱	مفلسی و ناداری
	۱۴۲۵	چاہنے والے کا آبروریزی کر کے بھاگ جانا
	۱۲۲۵	والدین کا سایہ اٹھ جانا

مندرجہ بالا نقشہ سے صرف اس قدر ظاہر ہوتا ہے کہ قحبگی کے اسباب

صرف اقتصادی ہیں۔ بلجیم کے دارالحکومت برسیلز (Brussels) میں
قحبگی کے اسباب علل کا اندازہ بیس برس (یعنی ۱۸۶۵ء لغایۃ ۱۸۸۴ء
تک) اعداد و شمار سے لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ قحبگی کے اسباب نقشہ مندرجہ بالا سے
بالکل مختلف ہیں۔ ۲۵۰۵ واقعات فحاشی کی چھان بین کی گئی تو نتیجہ حسب ذیل نکلا۔

تعداد	سبب
۱۵۲۳	انتہائی مفلسی و ناداری۔
۲۸	خاوندوں کا خرچ کمانے پر مجبور کرنا۔
۱۱۱۸	خواہشات نفسانی کی شدت۔
۴۲۰	صحبت بد کا اثر
۳۱۶	ایماندارانہ کام سے نفرت۔
۱	والدین کا قحبگی اختیار کرنے پر مجبور کرنا۔
۱۰۱	عاشقوں کی بے وفائی
۱۰	والدین سے جھگڑا۔
۴	سرپرستوں سے ناموافقت۔
۳	گھر سے جھگڑے۔
۷	شوہروں کا چھوڑ دینا۔

جس وقت لندن میں مسٹر میرک (Mr. Merrick) بحیثیت پادری مل بینک جیل میں کام کرتے تھے تو انھوں نے ہزار ہا کسبیوں سے قحبگی کے اسباب دریافت کیے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل نقشہ سے ان کی تحقیقات ظاہر ہوتی ہے۔

کل تعداد	تعداد	سبب
۱۴۰۲۲	۵۰۶۱	خواہش نفسانی کے پیچھے خود بخود گھر چھوڑنا
	۳۳۶۳	افلاس و ناداری۔
	۳۱۵۴	عاشقوں کا خراب کر کے چھوڑ دینا۔
	۱۶۳۱	عشاق اور رشتہ داروں کا شادی کا وعدہ کر کے دغا کرنا۔

مسٹر میرک تحریر کرتے ہیں کہ ان میں ۴۷۰۹ عورتیں یعنی ایک ثلث کے قریب ایسی ہیں جن کا چال چلن مردوں نے خراب کیا اور ۱۱۲۳۲ ایسی ہیں جو دیگر اسباب کی بنا پر کسبیاں بنیں۔ مصنف موصوف نے یہ بھی ظاہر کیا ہے جو کسبیاں اپنے پیشہ کا سبب مفلسی و ناداری بتاتی ہیں وہ درحقیقت سست اور کاہل تھیں اور محنت مزدوری سے جی چراتی تھیں۔

مسٹر لوگان (Logan) ایک انگریز پادری نے جو شہر میں کام کیا کرتے تھے۔ انھوں نے حسب ذیل تقسیم کی ہے:۔

(۱) ایک چوتھائی ایسی ہیں جو میخانوں اور بوزہ خانوں میں کام کیا کرتی تھیں اور اس طرح خراب ہو کر کسبی بن گئیں۔

(۲) ایک چوتھائی وہ عورتیں ہیں جو دکانوں اور کارخانوں وغیرہ میں کام کیا کرتی تھیں اور وہاں خراب ہوکر کسبی ہوئیں۔

(۳) ایک چوتھائی کے قریب ایسی لڑکیاں ہیں جنھیں کٹنیاں دیہات اور قصبات وغیرہ سے بھگا کر لائیں۔

(۴) بقیہ تعداد ایسی عورتوں کی ہے جن سے بوجہ سستی و کاہلی ایماندارانہ کام نہ کیا گیا۔ یا بدمزاجی کے باعث کہیں نوکر نہ رہ سکیں یا جن سے مردوں نے شادی کے جھوٹے وعدے کرکے خراب گمراہ کیا۔

امریکہ کے شہر نیویارک میں مسٹر سینگر (Sanger) نے ان اسباب کی تحقیقات کی تو نتیجہ یہ نکلا :-

کل تعداد	تعداد مدوار	سبب
۲۰۰۰ عورتیں	۵۲۵	مفلسی و ناداری
	۵۱۳	شوق
	۲۵۸	عشاق کا خراب کرکے چھوڑ دینا۔
	۱۸۱	علت شراب خواری

والدین، عزیزوں یا شوہروں کا بُرا برتاؤ۔	۱۶۴	
تن آسانی و عیش پسندی۔	۱۲۴	
صحبت بد۔	۸۴	
اغوا۔	۷۱	
سستی و کاہلی۔	۲۹	
زنا بالجبر۔	۲۷	
جہاز پر مردوں کا خراب کرنا۔	۱۶	
بورڈنگ میں مردوں کا بہکا کر خراب کرنا۔	۸	

حال ہی میں امریکہ کے پروفیسر ووڈس ہچنسن (Woods Hutchinson) نے دنیا کے تیس بڑے بڑے عالمگیر شہروں کے نمائندوں سے قحبگی کے اسباب کے متعلق چند سوالات کیے اور ان کے جوابات پر حسب ذیل نقشہ مرتب کیا گیا۔

اسباب و علل	تعداد فی صدی
شوق نمائش، تعیش و کاہلی	۴۲ ر ۱
گھر کا خراب ماحول	۲۳ ر ۸
عشاق کا خراب کرنا	۱۱ ر ۳
بیکاری	۹ ر ۴
خاندانی پیشہ	۷ ر ۸
جذبۂ شہوانی	۵ ر ۶

سنہ ۱۸۸۰ء میں اطالیہ کی رجسٹر شدہ کسبیوں سے جن کی عمریں سترہ ۱۷ سال سے زیادہ تھیں دریافت کر کے فیربانی نے حسب ذیل نقشہ مرتب کیا :-

کل تعداد	تعداد	اسباب وعلل
۱۰۴۲۲	۲۷۵۲	شوقِ گناہ
	۲۱۳۹	والدین یا شوہر وغیرہ کی وفات
	۱۶۵۳	چاہنے والوں کا بہکا کر خراب کر دینا
	۹۲۷	نوکری کے سلسلہ میں خراب ہونا
	۷۹۴	والدین یا شوہر وغیرہ کا چھوڑ دینا
	۶۹۸	عیش پسندی
	۶۶۶	عاشق یا گھر سے باہر کسی مرد کا بہکانا
	۴۰۰	والدین یا شوہر کا بہکا کر اس پیشہ کیلئے مجبور کرنا۔
	۳۹۳	والدین یا بچوں کی پرورش

فیڈیرو (Fedorow) نے سنہ ۱۹۰۱ء میں روس کی کسبیوں کے متعلق حسب ذیل نقشہ مرتب کیا تھا :-

اسباب	تعداد فی صدی
ناکافی مزدوری	۳۸،۵
شوق تفریح	۲۱،۰
نوکری چھوٹ جانا	۱۴،۰
دیگر عورتوں کا بہکانا	۹،۵
جوش انتقام	۵،۵
شراب خوری	،۵

قحبگی کے اقتصادی اسباب

قحبگی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے اکثر مصنفین محققین نے لکھا ہے کہ اس مذموم پیشہ کی بنیاد اقتصادیات پر قائم ہے یعنی عورتیں عموماً مفلسی و ناداری کی وجہ سے یہ پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ حالانکہ جب خود ان سے دریافت کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ تر یہ بتاتی ہیں کہ دیگر ذرائع سے وجہ معاش حاصل کرنا ان کے لیے مشکل تھا، اس لیے وہ یہ پیشہ کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزرا کہ پیرنٹ ودشاتلے نے لکھا تھا کہ:-

"پیرس میں خصوصاً اور دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں میں عموماً قحبگی کے اسباب میں اس سے زیادہ موثر سبب اور کوئی نہیں کہ عورت کے پاس

حصول معاش کا کوئی ذریعہ نہ ہو یا اگر ہو تو کافی نہ ہو۔"

انگلستان کے متعلق بیشر ویل (Bhee Well) نے بھی یہی خیال ظاہر کیا تھا یعنی اخلاق عامہ کے حُسن و قبیح کا انحصار وجہ معاش کی وسعت و تنگی پر ہے۔ یہی خیال امریکہ کے بارے میں بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور یہی سبب برلین میں پیش کیا جاتا ہے کہ جب روزگار یا کاروبار خراب ہوتا ہے تو کسبیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جاپان میں بھی انکی کثرت کا باعث مفلسی ناداری بتایا جاتا ہے۔

الغرض تقریباً ہر جگہ کے محققین نے یہی بتایا کہ قحبگی میں کمی زیادتی کے اسباب اقتصادی ہیں، یعنی مفلسی و ناداری، یعنی روزگار یا کاروبار کی خرابی سے جب آمدنی یا مزدوری کم ہو جاتی ہے تو عورتیں کسبی بننے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

افلاس اور قحبگی

لیکن جب اس بیان کی جانچ اُن نتائج کی روشنی میں کیجاتی ہے جو مختلف محققین نے فرداً فرداً اخذ کیے ہیں تو اسکی تردید ہوتی ہے مثلاً استراسمبرگ (Stro Humberg) نے جب ۱۴۶ کسبیوں کے حالات کی نہایت غور کے ساتھ تفتیش کی تو ان میں صرف ایک عورت ایسی نکلی جس نے اپنی قحبگی کا سبب مفلسی و ناداری بیان کیا اور جب مزید تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس ایک عورت نے بھی جھوٹ بولا تھا۔ اسی طرح ہیمر (Hammer) نے جرمنی کی ۹۹ رجسٹری شدہ کسبیوں کے

حالات کی تفتیش کرکے معلوم کیا کہ ان میں ایک عورت بھی ایسی نہ تھی جس نے مفلسی و ناداری سے مجبور ہو کر یا کسی بچے کی پرورش کیلئے قحبگی اختیار کی ہو۔ بلکہ ان میں بعض ایسی بھی تھیں جو مالدار ہونے کے باوجود بدکار ہو گئی تھیں اور بعض تو ایسی تھیں جو کوئی معاوضہ طلب نہ کرتی تھیں۔

پادری لیشمان جن کا تعلق برلن کے ٹلنا ڈیمیگڈلینی ہوم (کسبیوں کے نجات خانے) سے ہے فرماتے ہیں کہ:۔

"عورتیں حاجت مندی کی وجہ سے قحبگی پیشہ اختیار نہیں کرتیں بلکہ عام اصول اخلاق کی طرف سے بے پروا ہو کر وہ ایسا کرتی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ برلن میں جب کوئی عورت بحیثیت کسبی اپنا نام درج رجسٹر کراتی ہے تو اسے موقع دیا جاتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی "نجات خانہ" میں جا کر ایماندارانہ کام کرے لیکن دس برس کے تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اگرچہ اس دوران میں ہزارہا کسبیاں رجسٹرڈ ہوئیں لیکن ان میں صرف دو ایسی نکلیں جنہوں نے اس عایت سے فائدہ اٹھایا۔"

انگلستان کی بھی یہی حالت ہے اور یورپ کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں بھی یہی کیفیت دیکھی گئی ہے بلکہ ان بدقسمت عورتوں کو حرامکاری کا کچھ ایسا چسکا پڑ جاتا ہے کہ وہ "نجات خانوں" (Rescue Home) سے نکل کر پھر قحبگی پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ مثلاً میڈرڈ کی نسبت برنالڈ وڈی کو

ٹرڈس اور لاتاس انگو ٹلانیڈ ڈ رنے بیان کیا ہے کہ :-

"کسبیاں جب نجات خانوں" میں منتقل ہو جاتی ہیں تو باوجود اس امر کے کہ وہاں ان کی بے حد خاطر مدارات ہوتی ہے، موقع پا کر نکل جاتی ہیں"

ان تمام واقعات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہر چند اسباب تحبگی میں اقتصادی مشکلات ضرور شامل ہیں لیکن اس قدر نہیں جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

یوروپین کسبیوں کی کثرت

یورپ میں فاحشہ عورتیں تجارت و حرفت کے ساتھ بڑھتی جاتی ہیں

ان میں زیادہ تر عورتیں یا لڑکیاں ہیں، جو کارخانوں، دوکانوں یا ہوٹلوں میں کام کرتی ہیں، بات یہ ہے کہ ان مقامات میں عورتوں کو مستقل کام نہیں ملتا، چار دن کام سے لگی رہتی ہیں تو چار دن بیکار بیٹھی رہتی ہیں اس لیے بہت سی زنانہ ٹوپیاں بنانے اور پوشاک پر ساز ٹانکنے والیاں فصل ختم ہونے کے بعد کسبیاں بن جاتی ہیں اور جب فصل پھر شروع ہوتی ہے تو اپنا کام کرنے لگتی ہیں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورتیں دن بھر محنت کرتی ہیں لیکن شام کو اتنی اجرت نہیں ملتی جو ضروریات زندگی کے لیے کفایت کر سکے۔ اس لیے وہ مجبوراً رات کے وقت گلی کوچوں اور بازاروں میں ادھر اُدھر پھر کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرتی ہیں۔

گلبرگ (Gallberg) نے ملک سویڈن کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"وہاں تیرہ سے سترہ سال عمر کی لڑکیاں جو اپنے والدین کے گھروں میں نہایت عیش و آرام کے ساتھ رہتی ہیں، اکثر بازاروں میں آکر شوقیہ طور پر مبتلائے فحش ہوتی ہیں"

ڈبلیو ایکٹن (W. Acton) نے اپنی کتاب "قحبگی" (Prostitution) مطبوعہ ۱۸۷۰ء میں لندن کی قحبگی اور حرامکاری کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"حرامکاری زندگی کا ایک ایسا عارضی قصہ ہے جس سے برطانیہ کی بیشمار عورتیں گزرتی ہیں"

لیکن تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ نہ صرف انگلستان بلکہ دیگر ممالک میں بھی زیادہ تعداد ایسی ہی عورتوں کی ہے۔ اس کے متعلق ہم فرانس کے زبردست اور مستند محقق پیرنٹ دوشاٹلے کی سند پیش کرتے ہیں جس نے لکھا ہے کہ:-

"اکثر عورتوں کے لیے قحبگی اور حرامکاری کا ایک عارضی زمانہ ہوتا ہے بعض عورتیں عموماً پہلے ہی سال تائب ہو جاتی ہیں اور زندگی بھر تر شاذ و نادر ہی کوئی عورت حرامکار رہتی ہو"

اسی سلسلہ میں بعض دیگر اقوال و بیانات بھی قابل ذکر ہیں۔ مثلاً پوپٹ نے فرانس کے شہر لاینس (Lyons) کی نسبت لکھا ہے کہ:-

"یہاں منجملہ ۴۸۸ فاحشہ عورتوں کے ۲۱۹ نے یہ شغل بالکل ترک

کر دیا تھا۔ پیرس میں بھی کسبیوں کی بہت بڑی تعداد نے یہ پیشہ ترک کر کے دیگر باعزت پیشے اختیار کر لیے تھے۔"

سلوجیٹ (Sloggett) نے شہر ڈیون پورٹ کے متعلق لکھا ہے کہ۔

"یہاں منجملہ ۱۷۷۵ کسبیوں کے ۲۵۰ نے نکاح کر لیا تھا اور یہ امر مسلمہ ہے کہ کسبی جب کسی سے نکاح کرتی ہے تو دیکھ بھال کر ایسے شخص کے ساتھ کرتی ہے جہاں وہ عیش و راحت اور عزت و وقعت کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ملازمت کر لیتی ہیں یا کوئی اور پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر کسی نے جوانی میں کچھ روپیہ جمع کر لیا ہے تو وہ حمام، یا ہوٹل وغیرہ کھول لیتی ہے لیکن رجسٹری شدہ کسبیوں میں ایسی عورتوں کی تعداد دو فی صدی سے زیادہ نہیں۔"

اس خیال کی تردید کہ عورتیں مفلسی و ناداری کی وجہ سے کسبیاں بن جاتی ہیں اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ ان میں زیادہ تعداد ایسی عورتوں کی ہوتی ہے جو شریف اور امیر گھروں میں کام کاج کیا کرتی ہیں۔ پھر گھر والوں کو اقتصادی مشکلات پیش آتی ہیں یا نہ آئیں لیکن پیش خدمتوں اور ماماؤں کو کبھی کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ نہ انھیں کھانے کی فکر ہوتی ہے نہ مکان کی۔ علاوہ ازیں وہ بیکار بھی کبھی نہیں رہتیں کیوں ان کی ہر جگہ مانگ ہے لیکن بایں ہمہ کسبیوں میں ایسی ہی عورتیں زیادہ نظر آتی ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اقتصادی اسباب ہی کی

بنا پر عورتیں کسبیاں نہیں بنجاتیں بلکہ اسکے اسباب کچھ اور بھی ہیں۔

آرتھر شیر ویل (A. Sher Well) نے اپنی کتاب "مغربی لندن کی زندگی" (Life in w. london) میں لکھا ہے کہ:۔

"ویسٹ اینڈ لندن کے گلی کوچوں میں جس قدر بدکار عورتیں نظر آتی ہیں ان میں اکثریت (اور بقول سالویشن آرمی ۸۰ فی صدی) ایسی عورتوں کی ہوتی ہے جو گھروں میں کام دھندا کرتی ہیں۔"

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل غور ہے کہ خادمائیں اپنے طرز زندگی اور طریق معاشرت میں بمقابلہ دوسری عورتوں کے کسبیوں سے زیادہ ملتی جلتی ہیں اور کسبیوں کی طرح ان عورتوں کی آمدنی بھی جداگانہ ہے۔ یہ عورتیں خاص خاطر و مدارات یا احترام و اکرام کی مستحق نہیں سمجھی جاتیں بعض ممالک میں ایسی خادمائیں بھی کسبیوں کی طرح رجسٹری شدہ ہوتی ہیں۔ اس قسم کی عورتیں متمول عورتوں کے پاس رہ کر زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کی شائق ہو جاتی ہیں لیکن چونکہ وہ فیشن کا پورا خرچ نہیں اٹھا سکتیں اس لیے کسبی بن جاتی ہیں۔ ان میں عموماً شوق نمائش اور تقلید کا شوق ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے اور یہی باتیں عام کسبیوں میں پائی جاتی ہیں۔ ڈی رائکیری (De Rycker) نے ایسی عورتوں کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"یہ بداخلاق نہیں ہوتیں بلکہ ان میں کسی قسم کا اخلاق ہی نہیں پایا جاتا۔"

پیرس کی کسبیوں کی نسبت پیرنٹ دوشاتلے کا قول ہے کہ ان میں سب سے زیادہ تعداد اُن عورتوں کی ہے جو پہلے گھروں میں نوکریاں کرتی تھیں اور کمنجہ (Commengay) نے لکھا ہے کہ:۔

"پیرس کی ان عورتوں میں جو بغیر لائسنس حرامکاری کرتی ہیں اچالیس فی صدی تعداد ان عورتوں کی ہے جو پہلے گھروں میں ملازم تھیں۔"

فرانس کے شہر بورڈو (Bordeaux) کی نسبت جنیل (Jeannel) نے لکھا ہے کہ:۔

"۱۸۶۰ء میں ان کے اندر چالیس فی صدی تعداد ان عورتوں کی تھی جو پہلے گھروں میں نوکریاں کرتی تھیں ان کے بعد نمبر درزنوں کا تھا (سینتیس ۳۷ فی صدی)"

انیسویں صدی کے وسط سے پہلے لیپرٹ (Lippert) نے جرمنی اور گروس ہافنجر (G. Hoffinger) نے آسٹریا کے متعلق لکھا تھا کہ:۔

"یہاں کسبیوں میں سب سے زیادہ تعداد ان عورتوں کی ہے جو پہلے معزز گھرانوں میں ماماکیں تھیں۔"

۱۸۹۸ء میں بلاشکو (Blashko) نے لکھا تھا کہ:۔

"برلن کی کسبیوں میں پیشہ خدمتوں کی تعداد اکیاون ۵۱ فی صدی ہے اور درزنوں میں ۲۸ فی صدی ہے۔"

انگلستان میں دارالامراد کی ایک منتخب کمیٹی نے قانون تحفظ بچگان کے متعلق جو رپورٹ مرتب کی تھی اس میں لکھا تھا کہ :-

"کسبیوں میں ساٹھ فیصدی عورتیں ایسی ہیں جو پہلے گھروں میں مائیں تھیں"

اور ایف ریمو (F. Remo) نے ان کی تعداد اسّی فیصدی لکھی ہے مغربی لندن میں تو غالبًا ان کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہوگی۔

تمام لندن کے متعلق میریک (Merrick) نے جو اعداد و شمار فراہم کیے تھے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ منجملہ ۱۴۷۹۰ کسبیوں کے ۵۸۲۳ عورتیں سابق خادمہ کی حیثیت سے کام کر چکی تھیں، دھوبنوں کا نمبر دوسرا، اور درزنوں کا نمبر تیسرا ہے بحیثیت مجموعی اس طبقہ میں ماماؤں کی تعداد ۳۵ فی صدی سے زیادہ ہے۔

امریکہ کے متعلق ڈاکٹر سینگر (Sanger) نے لکھا ہے کہ :-

"یہاں کی کسبیوں میں پیشہ خدمتوں کی تعداد ۴۳ فیصدی ہے اسکے بعد درزنوں کا نمبر آتا ہے"

اور گڈ چائلڈ (Good child) نے شہر فلاڈلفیا کی نسبت لکھا ہے کہ :-

"یہاں کی کسبیوں میں مائیں نسبتًا سب سے زیادہ ہیں۔ یہی حالت قریب قریب ہر ملک کی ہے"

نام ملک	نام محقق	تعداد	کیفیت
اطالیہ	تامیو (Tammeo)	۲۸ فیصدی	مامائیں
//	// //	۱۷ //	درزنیں وغیرہ

سارڈینیا	لے مانٹی گیزا (Mantegazza)	اکثریت	دیہاتی خادمائیں
رہیس	فیاڈ (Fiaux)	۵۴ فیصدی	مامائیں
میڈرڈ رہیشیا	الیلافا (Exlana)	۲۷ "	خادمائیں
سوئیڈن	ویلانڈر (Welander)	۶۲ "	خادمائیں

قحبگی علم الحیوۃ کے نقطۂ نظر سے

فصل اول میں قحبگی کے اقتصادی اسباب پر کافی بحث ہو چکی ہے لیکن ایک دوسرا مسئلہ بھی ہے جو محققین کے سامنے عرصۂ دراز سے زیر بحث ہے وہ یہ کہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے کسبیاں کس حد تک اپنے مذموم پیشہ کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ یعنی کیا بعض عورتیں ماں کے پیٹ سے کوئی ایسی خصوصیت لیکر آتی ہیں جس سے وہ آئندہ زندگی میں کسبی بن جاتی ہیں؟ یہ امر تو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اقتصادی و دیگر اسباب عورتوں کے چال چلن پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں لیکن معلوم یہ کرنا ہے کہ ایسی کتنی عورتیں ہیں جو غیر معمولی پیدائشی خصوصیات کے باعث قحبگی اختیار کر لیتی ہیں۔

قحبگی میں جبلیاتی عنصر

بعض ماہرین فن اور محققین کا یہ خیال ہے کہ جس طرح بعض مردوں میں جرائم پیشگی کی طرف پیدائشی رغبت ہوتی ہے اسی طرح بعض عورتوں میں بھی فحاشی کی طرف

فطری میلان پایا جاتا ہے۔ مثلاً جن خاندانوں میں مرد فطری میلان کے باعث جرائم پیشہ ہو جاتے ہیں ان خاندانوں کی عورتیں بھی پیدائشی بدکار ہوتی ہیں لیکن بعض محققین نے اس خیال کی تردید کی ہے۔

اس نظریہ کی حمایت سب سے زیادہ لومبروزو (Lombroso) نے کی ہے کہ "عورتوں میں مجرمیت کی قائم مقام فحاشی ہوتی ہے"۔ اپنے اس قول کی تائید میں اس نے ڈوگڈیل (Dugdale) کے ان نتائج کو پیش کیا ہے جو خاندان جوکس (Jukes) کے افراد کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اخذ کئے گئے تھے۔ اس خاندان کے متعلق انھوں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ:۔

"اس خاندان میں بھائی تو عادی جرائم پیشہ ہیں اور بہنیں تمام بدکار"

اس خاندان کے حالات دیکھ کر لومبروزو اور فریرو (Ferrero) نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ:۔

"ایک پیدائشی مجرم اور پیدائشی فاحشہ بلحاظ نفسیات و بلحاظ تشریح الاعضاء اخلاقی پاگل ہیں، دونوں میں وہی حساس خلاق کا فقدان، وہی سنگدلی، وہی میلان بدکاری، وہی تلون مزاجی، وہی تن آسانی اور وہی عارضی اور سطحی مسرتوں کا شوق، اور یہی خود بینی و خود نمائی ہوتی ہے۔ گویا فحاشی نسوانی پہلو ہے مجرمیت کا اور نفسیاتی لحاظ سے ایک زن فحبہ، جرائم پیشہ

مخلوق ہے۔ اگر وہ کسی جرم کا ارتکاب نہیں کرتی تو یہ اس کے جسمانی ضعف، ناتوانی کا باعث ہے یا اس کی عقلی کمزوری کا سبب۔"

ڈبلو فشر (W. Fisher) نے اپنی کتاب (Disprostitution) میں لکھا ہے کہ "فحبگی عین مجرمیت ہے۔" یہی بات فیرے (Fere) نے اپنی دلچسپ کتاب "Degineresce Ammnalite" میں لکھی ہے کہ:-

"فحبگی اور مجرمیت دونوں ایک ہیں۔ کسی فاحشہ عورت یا کسی مجرم سے دین کا فائدہ ہے نہ دنیا کا۔ لہذا دونوں معاشرت کے دشمن ہیں۔"

لیکن بعض محققین کا خیال اس کے قطعی خلاف ہے۔ ان کے نزدیک کسبی چور نہیں ہوتی بلکہ وہ چوروں سے نفرت کرتی ہے۔ بامگارٹن (Baumgartner) نے آٹھ ہزار کسبیوں کی نسبت تحقیقات کی، مگر ان میں بہت ہی کم تعداد مجرموں کی پائی۔

کسبیوں میں خواہشات نفسانی

محققین کے نزدیک یہ مسئلہ بھی عرصہ دراز سے بحث طلب ہے کہ کیا کسبیوں میں خواہش نفسانی زیادہ ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کا جواب مختلف طریقوں سے دیا جاتا ہے۔ مورا سو (Morasso) اور دیگر محققین کا قول یہ ہے کہ ان میں خواہشات نفسانی کی شدت ہوتی ہے اور اسی لیے اس ذلیل پیشہ کی طرف مائل ہو جاتی

ہیں لیکن بعض محققین یہ کہتے ہیں کہ ان میں عموماً خواہش مواصلت قریب قریب مفقود ہوتی ہے۔ ویبرورز کا یہی قول ہے کہ خواہشات نفسانی کے لحاظ سے یہ سرد ہوتی ہیں اور اس کی تائید میریک (Merrick) کے بیان سے بھی ہوتی ہے جنھوں نے لندن کی تقریباً سولہ ہزار کسبیوں کا مطالعہ کرکے لکھا ہے کہ انھوں نے صرف چند کسبیاں ایسی پائیں جو خواہش شہوانی کی شدت سے مائل بہ قحبگی ہوئی ہوں۔

راسی بورسکی (Raci Borski) نے پیرس کی کسبیوں کے بارہ میں بھی یہی بیان کیا ہے کہ:۔

"ان میں ایسی تعداد بہت کم ہے جو محض شدت خواہش کے باعث قحبہ بنی ہوں۔"

اسی طرح کومنجہ (Commenja) نے جنھیں پیرس کی کسبیوں کا بیحد تجربہ ہے یہ بیان کیا ہے کہ قحبگی کے اسباب میں خواہش نفس کی شدت چنداں اہمیت نہیں رکھتی وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"میں نے ہزاروں سے دریافت کیا لیکن ایسی بہت کم نکلیں جنھوں نے خواہش نفسانی کی تسکین کے لیے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ اگرچہ ایسے معاملات میں عورتیں بہت کم صاف گوئی سے کام لیا کرتی ہیں مگر میرے خیال میں انھوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔"

لیکن جہاں تک غور کیا گیا ہے ان لوگوں کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اقوال ایسی عورتوں کے بیانات پر مبنی ہیں جن کی عمریں اسی کام میں گزر گئی ہیں اور اب بوجہ سن رسیدگی انکی خواہش نفسانی سرد ہو گئی ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ صحیح جذبات کی بنا پر ان کو بہت کم رغبت ہوتی ہے جس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ان کے تعلقات پیشہ کے لحاظ سے بہت سطحی ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ اس حرکت کو بہت کمسنی کے عالم میں شروع کر دیتی ہیں جب اعضاء میں پوری طرح پختگی بھی پیدا نہیں ہوتی، اس پیشہ کی عورتوں میں عام طور پر دماغی لحاظ سے بہت سطحیت پائی جاتی ہے اور یہی باعث ہے کہ ان میں جذبات نفسانی بھی ضعیف ہوتے ہیں لیکن یہ کلیہ نہیں ہے کیونکہ برعکس اس کے بعض کسبیوں میں یہ جذبہ بہت قوی ہوتا ہے۔ علی الخصوص وہ جن کی صحت اچھی ہوتی ہے اور نشو و نما مکمل!

یہ بات عام طور پر دیکھی گئی ہے کہ ان میں سے اکثر جسمانی لحاظ سے بہت مضبوط و توانا ہوتی ہیں اور اس لیے وہ اپنے پیشہ کے تمام خطرات کو آسانی سے برداشت کر لیتی ہیں اور اگرچہ کثرت فحش کے باعث ان کی طبیعتیں شر اور ان کے نازک اعضاء سخت ہو جاتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ان کی خواہش شہوانی قطعی غائب ہو جاتی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ بلحاظ پیشہ ان کو ہر شخص سے کوئی لطف حاصل نہیں ہوتا اور اسی لیے وہ اپنی لطف صحبت

کے لئے کسی ایک کو مخصوص کر لیتی اور اس سے وہ اسی طرح سچی محبت کرتی ہیں جیسے کوئی شریف بیوی اپنے شوہر سے کرتی ہے۔

ایک جرمن کسبی سے ایک مرتبہ اسی بارہ میں دریافت کیا گیا تو اس نے صاف صاف بیان کیا کہ:۔

"پیشہ اور چیز ہے اور محبت شوق اور۔ پیشہ کے لحاظ سے جو فعل کرنا پڑتا ہے اس سے دل خوش نہیں ہوتا لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہم دوسری عورتوں کی طرح خود بھی کوئی "شوہر نہ رکھیں" آخر ہم لوگ بھی تو دل اور دل میں جذبات رکھتے ہیں۔ ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ کسی خاص شخص سے محبت کریں"

ہیولاک الیس نے اپنی کتاب "تعلقات شہوانی اور سوسائٹی" میں اپنے ایک نامہ نگار کا مراسلہ درج کیا ہے جس کو نہ صرف انگلستان بلکہ جرمنی، بلجیم ہالینڈ اور فرانس کی کسبیوں کا بھی بہت کافی تجربہ حاصل ہے، مراسلہ مذکور سے ظاہر ہوتا ہے کہ بمقابلہ اور ممالک انگلستان کی پیشہ ور عورتیں خواہشات نفسانی کا اظہار طبعی طور پر بہت کرتی ہیں۔ نامہ نگار مذکور لکھتا ہے کہ:۔

"کسبیوں میں کسی قسم کی خواہش نفسانی ظاہر نہیں ہوتی اپنے کسی ملک کی کوئی کسبی ایسی نہیں پائی جو دل کھول کر ملتی ہو۔ لیکن انگلستان میں ضرور یہ بات ہے کہ اگر کوئی شخص محبت و شفقت سے پیش آئے اور

یہ بھی ظاہر کر دے کہ اسے محبت کی ضرورت ہے تو پوری بے تکلفی ہو ملتی ہیں۔ دوسرے پیشوں کی طرح اس پیشہ میں بھی لاگ ڈانٹ ہوتی ہے اور ہر کسی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دل خوش کر کے دوسری کسی کے آدمی کو توڑ لے یا اپنے آدمی کو کسی اور کے پاس نہ جانے دے"

بہرحال تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ اوائل عمر میں کسبیوں کے اندر جذبات نفسانی ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں یا آگے چل کر بعض میں باقی رہیں یا نہ رہیں لیکن ان میں خواہش نفسانی کم و بیش ہوتی ضرور ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ ان خواہشات کی طرف سے بے پروا ہو جائیں۔

نفسیاتی خصوصیات

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا نفسیاتی یا جسمانی ساخت کے لحاظ سے ان کی دنیا الگ ہے؟ اس مسئلہ پر بھی محققین میں باہم سخت اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ ان کی دنیا ہی نرالی ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ بھی عام عورتوں کی طرح ہوتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ نفسیاتی اور جسمانی حیثیت سے حد درجہ گری ہوئی اور بتذل ہوتی ہیں لیکن بعض کا قول ہے کہ ان میں صرف حسن معاشرت اور اخلاق کی کمی ہوتی ہے ورنہ ان میں اور دوسری عورتوں میں کوئی فرق نہیں۔

محققین نے بڑی چھان بین کے بعد جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں بُری بھلی دونوں باتیں پائی جاتی ہیں، مثلاً دیپا ان

([illegible]) نے فرانس کی کسبیوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ان کے عیوب و محاسن دونوں شمار کیے ہیں وہ لکھتا ہے کہ :-

"ان میں حسب ذیل عیوب ہوتے ہیں (۱) حرص و آز۔ (۲) شوق مےخواری (۳) دروغ گوئی (۴) غیظ و غضب (۵) فقدان ترتیب و سلیقہ (۶) تلون مزاجی (۷) فقدان ولولہ (۸) استلذاذ بالمثل یا بالنفس کا رجحان اس کے ساتھ ہی ان میں بعض اوصاف حمیدہ بھی پائے جاتے ہیں مثلاً (۱) ماں باپ کی محبت (۲) ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک (۳) باہمی فیاضی اور دریادلی (۴) ایک دوسرے کی تنقیص سے پرہیز (۵) دینداری (۶) خودداری و سنجیدگی (۷) عام دیانتداری۔

لومبروزو (Lombroso) کا قول ہے کہ قحبگی کی بنیاد "اخلاقی حماقت" پر ہے۔ اگر اس "اخلاقی حماقت" (Moral Idiocy) کا تعلق زیادہ تر "دیوانگی" سے ہے تو ہم اس قول کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کیونکہ قحبگی اور دیوانگی میں کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا اور تامیو ([illegible]) نے اپنی کتاب (La Prastitution) میں دکھایا ہے کہ قحبگی اور دیوانگی میں نسبت معکوس ہے۔ یعنی جب لوگوں میں دیوانگی کی کثرت ہوتی ہے تو کسبیوں کی تعداد میں کمی ہو جاتی ہے لیکن اگر "اخلاقی حماقت" کے معنی "اخلاقی کمزوری" کے ہیں یعنی قواعد و ضوابط تہذیب و تمدن سے بے پروائی اور

شرم وحیا کی طرف سے بے حسی، تو یہ قول کسی حد تک سچ ہے کیونکہ یہ کمزوری کم وبیش اکثر کسبیوں میں پائی جاتی ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو عورت اپنی عصمت حقیر فائدے کے عوض نذر کر دے وہ ضرور پاگل ہے۔ اگر وہ ایسی حرکت محض محبت کے باعث کرے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے بیوقوفی یا غلطی کی۔ کیونکہ ایسی حرکتیں نوجوان اور ناتجربہ کاروں سے اکثر سرزد ہو جاتی ہیں لیکن اگر کوئی عورت دیدہ و دانستہ اور قلیل منفعت سے یا بغیر کسی منفعت کے ایسا کرے تو وہ ضرور پاگل ہے۔ اس بارہ میں موسیو کومنجہ (Commenge) نے فرانس کے متعلق جو تجربات لکھے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ موسیو مذکور لکھتے ہیں کہ:۔

"بہت سی لڑکیوں کے نزدیک شرم وحیا اور اخلاق کوئی چیز ہی نہیں انھیں بعض اوقات اپنا جسم ننگا دکھانے میں بھی کسی قسم کی حیا نہیں آتی اور بعض اوقات وہ اسقدر بیحیا اور بداخلاق ہو جاتی ہیں کہ وہ خود کو ذرا سے لالچ میں غیروں کے حوالہ کر دیتی ہیں۔ ان لڑکیوں کے نزدیک عصمت کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور بعض اوقات وہ بغیر فائدہ یا بغیر کسی جذبہ کے مرد کے آغوش میں پہنچ جاتی ہیں۔ وہ بعض اوقات اس کام میں حیوانوں کو بھی مات کر دیتی ہیں۔"

ایک لڑکی پندرہ سال عمر کی آرام و راحت سے اپنے والدین کے ساتھ

رہا کرتی تھی، اتفاقاً ایک اجنبی سے ملی جس نے اسے صرف دو فرانک کھا کر اپنے ساتھ چلنے کی ترغیب دی۔ وہ لڑکی بلا پس و پیش فوراً اجنبی کے ساتھ چلی گئی بعد ازاں وہ ایسی خراب ہوئی کہ خود مردوں کے پیچھے پھرنے لگی۔ اسی طرح ایک چہاردہ سالہ لڑکی نے جو اپنے والدین کے ساتھ بارآم و راحت رہتی تھی اپنی موتی سی آبرو نہایت بری طرح کھوئی۔ وہ ایک میلہ میں گئی تھی جہاں اسے ایک مرد نے بیر شراب کا صرف ایک جام پیش کیا تھا۔ اس کے بعد وہ لڑکی کسبیوں سے میل جول رکھنے لگی۔ اسی عمر کی ایک اور لڑکی مقامی میلہ دیکھنے گئی۔ وہاں اس کا ہنڈولہ میں جھولنے کو دل چاہا۔ اس نے ہنڈولہ والے کو محض جھلانے کے عوض میں اپنی عصمت پیش کر دی۔ ایسا ہی ایک دوسری پندرہ سالہ لڑکی نے کیا۔

امریکہ کے ڈاکٹر ڈبلو ٹرویس جیب W. Travers Gibb نے ۱۹۰۷ء میں میڈیکل ریکارڈ Medical Record بابتہ ۲۰ اپریل ۱۹۰۷ء میں تحریر کیا ہے کہ چھوٹی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ "زنا بالجبر" کے جتنے واقعات ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جنہیں لڑکی کی رضامندی حاصل کر لی جاتی ہے۔

جسمانی خصوصیات سب سے زیادہ ظاہر اور جاذب نظر چیز انسان کا چہرہ ہے۔ فرانس میں تقریباً ایک ہزار کسبیوں کو

پانچ جماعتوں میں درجہ وار تقسیم کر کے ان کے چہروں پر غور کیا گیا۔ ان میں صرف چودہ فیصدی کسبیاں درجہ اوّل میں داخل ہو سکیں لیکن ان میں بھی کوئی ایسی نہ تھی جس کی نسبت یہ کہا جا سکے کہ وہ مست شباب یا صاحب حسن و جمال ہے اسی طرح ووڈس ہچنس (Woods Hatchinson) نے لندن، پیرس، وائنا، نیویارک، فلاڈلفیا اور شکاگو کی بیشمار کسبیوں کو بغور دیکھا لیکن وہاں بھی وہ اسی نتیجہ پر پہونچا کہ ذاتی کسبیوں میں خوبصورت یا کم از کم نظر فریب چہرہ شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ ان میں عام معیار حسن و جمال دوسری عورتوں کے مقابلہ میں بہت پست ہے۔

علاوہ اس کے اگر ان کے دیگر اعضاء جسمانی کا بغور معائنہ کیا جائے تو بہت سی اور خامیاں بھی نظر آئیں گی۔ چنانچہ ڈاکٹر پالائن تارنوسکی (Tarnowchy) نے روس میں ڈاکٹر بونہوفر نے جرمنی میں۔ فورناساری (Fornasari) آردو (Ardu) جوفریڈا روگیری (Giufrida Ruggeri) و آسکریلا (Aocorilla) نے اطالیہ میں اور ڈاکٹر سرجی (eri) الگزینڈر، ڈاکٹر ای۔ ایس ٹلیاف، و ڈاکٹر جے۔ جی۔ کیرنان نے امریکہ میں بہت سی کسبیوں کا معائنہ کیا تو حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:۔

(۱) برابر قد و قامت کی عورتوں سے ان میں وزن زیادہ ہوتا ہے (۲) ہاتھ بڑے بڑے ہوتے ہیں لیکن بازو چھوٹے (۳) ٹخنے چھوٹے پنڈلیاں

بڑی اور رانیں نسبتاً ان سے بھی بڑی ہوتی ہیں (۴) کھوپڑی کا قطر و محیط نہ صرف معزز عورتوں بلکہ عادی چوروں کے مقابلہ میں بھی کم ہوتا ہے (۵) جبڑے کی ہڈی نمایاں ہوتی ہے (۶) معزز عورتوں کے مقابلہ میں بال زیادہ سیاہ ہوتے ہیں (۷) نہ صرف سر پر بلکہ پیڑو پر بھی بال زیادہ ہوتے ہیں (۸) آنکھیں بھی زیادہ سیاہ ہوتی ہیں۔

قحبگی کا اخلاقی پہلو

دنیا میں ہمیشہ ایسے معلمین اخلاق رہے ہیں اور رہیں گے جن کی رائے نہایت صائب تصور کیجاتی ہے اور ادارۂ قحبگی کے متعلق جو خیالات انھوں نے ظاہر کئے ہیں وہ اس قابل ضرور ہیں کہ ان پر غور و خوض کیا جائے۔ ان لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اگر حفظان صحت کے متعلق ضروری انتظامات موجود ہوں تو کسبیوں کا مسئلہ زیادہ سخت نہیں رہتا۔ ان لوگوں کے نزدیک ان کا وجود ایک مصیبت ناگزیر ہے ایک مفید ادارہ ہے جو معزز گھرانوں کی عصمت و عفت کا پشتبان ہے اور وحدت ازدواج سے جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں انکی اصلاح کا ضامن ایک زبردست مصنف نے انکی شاعرانہ تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"کسبی اخلاق عامہ کی بد اخلاق نگران کار ہے۔"

ایک دوسرے مصنف کا قول ہے کہ:۔

"یہ ایک مجلسی معاشرتی مقصد کو پورا کرتی ہے اور وہ دوسری لڑکیوں کی

عصمت و عفت کی محافظ ہے۔"

اسی طرح بلزاک (Balzac) نے اپنی کتاب (Physiologie-Du-Marriage) میں ان کی نسبت لکھا ہے کہ:-

"وہ خود کو جمہوریت پر قربان کر دیتی ہیں اور اپنے جسموں کو معزز خاندانوں کا پشتیبان بنا دیتی ہیں۔"

اسی طرح شوپنہار (Schopenhaur) نے لکھا ہے کہ:-

"یہ وحدت ازدواج کی قربان گاہ پر انسانی قربانیاں ہیں۔"

اسی طرح لیکی (Lecky) نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ اخلاق یورپ" میں لکھا ہے کہ:-

"وہ ہر چند بدترین قسم کا گناہ ہے لیکن پاکدامنی اور نیکوکاری کا بڑا محافظ ہے اگر یہ نہ ہوتیں تو بے شمار شاد کام خاندانوں کی عصمت و عفت میں داغ لگ جاتا اور جو لوگ اپنی پارسائی و پاکدامنی کے غرور میں کسبیوں کو بہ نگاہ نفرت و حقارت دیکھتے ہیں انہیں خجالت کا منہ دیکھنا پڑتا۔"

قدیم یونانیوں میں فحاشی کے ادارے موجود تھے لیکن انھوں نے ان کو کبھی مضرت رساں صورت اختیار نہ کرنے دی۔ اسی لیے ان کے ہاں چکلے کے ادارے سرکاری طور پر قائم تھے لیکن رومی جو یونانیوں کے شاگرد تھے مگر کسی قدر زاہد خشک واقع ہوئے تھے ان اداروں کو بلا پس و پیش قبول کرنے کے لیے

پہلے تیار نہ تھے لیکن بعد کو وہ بھی اس نتیجہ پر پہونچے۔ چنانچہ ایک بار ان کے ایک مشہور مدبر و سیاست داں نے ایک شخص کو قحبہ خانہ سے نکلتے دیکھ کر اظہار مسرت کیا اور کہا کہ اگر قحبہ خانہ نہ ہوتا تو یہ شخص اپنے ہمسایہ کی بیوی کے ساتھ سوتا۔

جب دین مسیحی کا زور ہوا تو چونکہ جو شیلے عیسائیوں کو نفس کشی میں بحد غلو تھا اس لئے لازمی طور پر قحبگی کے اثرات اخلاقی پر نہایت توجہ ہونے لگی لیکن عوام کا رجحان طبع دیکھ کر یہ نا ممکن پایا گیا کہ اخلاقی لحاظ سے کسبیوں کے خلاف فتویٰ صادر کیا جا سکے چنانچہ دو جماعتیں ہو گئیں ایک وہ جو نفس کشی اور تجرد کے حامی تھے۔ دوسرے وہ جن کے شانوں پر دینی ذمہ داری کے علاوہ تدبر و سیاست کا بار گراں بھی پایا جاتا تھا اور یہ طبقہ فحاشی کے اخلاقی جواز کا بادل ناخواستہ قائل ہو گیا۔ اس کی بہترین مثال ہمیں مشہور و معروف مسیحی سان آگسٹین (Augustine) کی ہستی میں ملتی ہے جو پولس کے بعد تعمیر کلیسائیت کا سب سے بڑا ذمہ دار شخص تھا، اس نے اپنی ایک کتاب میں (جو ۳۸۶ء کی تصنیف ہے) لکھا ہے کہ :-

"جس طرح ایک جلاد خواہ اس کا پیشہ کتنا ہی قابل نفرت و حقارت ہو سوسائٹی کے لیے ناگزیر ہے اسی طرح کسبیاں جن کا پیشہ خواہ کتنا ہی ذلیل و نفرت انگیز ہو نظام معاشرت کے لیے ضروری ہیں۔ آج تم کسبیوں کو دور کر دو تو کل ہی تمام دنیا شہوات نفسانی سے تہ و بالا ہو جائے گی۔"

مشہور مفکر سان اکویناس (Aquinas) کی بھی یہی رائے تھی جو سان آگسٹین کی تھی۔ اس شخص کا قول تھا کہ "اگرچہ بدکاری گناہ کبیرہ ہے لیکن کسبیوں کا وجود اصلاحِ معاشرت کے لئے ناگزیر ہے۔"

لکوری (Liguori) جو زمانۂ حال کا سب سے زیادہ با اثر عالم دینیات تھا، یہی رائے رکھتا تھا۔

الغرض بعض لوگ تجگی کے خلاف تھے اور بعض اسے "معصیت ناگزیر" خیال کرتے تھے۔ ایک تیسرا طبقہ بھی تھا جس کا قول یہ تھا کہ بڑے بڑے شہروں میں اگر کسبیاں ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن صرف شہروں کے اندر۔ کسبیوں کے ساتھ تو خیر کلیسا بعض مراعات مدنظر رکھتا تھا، لیکن وہ مشاطہ عورتوں کا سخت مخالف تھا۔ چنانچہ الویرہ کی مسیحی مجلس نے فتویٰ دیا کہ اگر کوئی کسبی نکاح کر لے تو اسے بغیر کفارہ برادری میں شامل کیا جا سکتا ہے لیکن قرمساقوں کو مرتے دم تک یہ سعادت نصیب نہیں ہو سکتی۔

دنیا میں مقتدایانِ مذہب کا شعار ہمیشہ یہی رہا کہ انکی پبلک زندگی سے ان کی پرائیویٹ زندگی مختلف رہی ہے چنانچہ کیتھولک پادریوں کا بھی یہی حال تھا وہ فواحش کے خلاف "فتوی دیتے تھے لیکن خود اس کے مرتکب ہوتے تھے۔ چنانچہ "اصلاحِ مذہب" (Reformation) کے ایک صدی بعد انگلستان میں ایک شخص برٹن (Burton) نے انگلستان میں

پادریوں کے خلاف قلم اُٹھایا اور انھیں خوب ذلیل کیا۔ اس کے ایک صدی بعد انگلستان میں برنارڈ مینڈیوائل (Bernard manaeville) نے کسبیوں کی حمایت میں پھر قلم اُٹھایا۔ اور اس کے بعد سے تمام پروٹسٹنٹ ممالک میں قحبگی کے ادارے ہو گئے۔

وڈس ہاچنس (Woods Hutchinson) نے کسبیوں کی نسبت لکھا ہے کہ:-

"طبی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہیئتِ اجتماعی کے لیے ان کے خدمات نہایت قابلِ قدر ہیں یہ گویا ادارۂ ازدواج کے حق میں ایک سیفٹی والو (Safety valve) کا کام دیتی ہیں۔"

فحاشی کا اثر تمدن پر

اخلاقی لحاظ سے تو خیر جواز قحبگی کا فتویٰ دیا ہی جاتا ہے لیکن ایک دوسری صورت بھی ہے جو مفکرین نے اس کے جواز کے لئے سوچی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شب و روز زندگی کی یکسانیت سے انسان کا جی اکتا جاتا ہے۔ اس لئے اس کو پُرلطف بنانے کے لئے تنوع کی سخت ضرورت ہے۔

چونکہ شہری زندگی میں کسب معاش کا مقابلہ زندگی کو کسی قدر بدمزہ بنا دیتا ہے اور صبح سے شام تک مردوں کو یکساں کام کرنا ان کے قویٰ کو مضمحل کر دیتا ہے اس لئے قدرتاً ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ تفریح کا سامان بھی بہم پہنچے اور

کسبیوں کی وجہ سے مجلسی ربط وضبط کے مواقع بہت زیادہ حاصل ہو جاتے ہیں۔ علاوہ اسکے چونکہ شادی کے اسباب آسانی سے فراہم نہیں ہو سکتے اور شہری زندگی میں نکاح زیادہ عرصہ تک ملتوی رکھا جاتا ہے، اس لیے تقاضائے فطرت پورا کرنے کے ذرائع تلاش کرنا اور زیادہ ناگزیر ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ "ذرائع" سوائے کسبیوں کے اور کیا ہو سکتے ہیں؟

تفریح کا شوق

اس میں شک نہیں کہ تمدن کی پیچیدگی کی وجہ سے انسانی نشوونما کو بہت نامکمل مواقع حاصل ہیں اور یہی سبب ہے کہ عورتیں عارضی یا مستقل طور پر فحاشی کی زندگی اختیار کر لیتی ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قحبگی کے اسباب میں اقتصادیات کا حصہ بہت زیادہ نہیں ہے اور نہ یہ خیال کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ عورت شدت خواہش کی بنا پر ایسا کرتی ہے مگر بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی لامعلوم اور اندرونی تحریک کے باعث جس کی وہ توجیہ یا توضیح نہیں کر سکتیں لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد قحبگی پیشہ اختیار کر لیتی ہے۔

میرک (Merrick) نے لندن کی پانچ ہزار کسبیوں کی تحقیقات کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا کہ تقریباً ایک ثلث عورتوں نے خود بخود اپنا گھر "عیش کی زندگی" بسر کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

امریکہ میں ڈاکٹر سینجر (Sanger) نے یہ معلوم کیا کہ جو عورتیں

"طبعی رجحان" کے باعث کسبیاں بنیں ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور ووڈس ہچنس کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا بڑا سبب شوق نمائش، عیش پسندی اور تن آسانی ہے۔ بلجیم میں قحبگی اختیار کرنے کا سبب وہ یہ بتاتی ہیں کہ انہیں "کام سے نفرت" ہے یہی حال اطالیہ کا ہے۔ روس میں جب اس کی تحقیقات کی گئی تو دوسرا نمبر ان عورتوں کا تھا جنھوں نے شوقیہ یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔

لندن کے ایک بہت بڑے محقق نے ان کے حالات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اسباب قحبگی میں چہل پہل اور تفریح و دلچسپی کی خواہش کو بڑا دخل ہے کیونکہ عورت کا دل عام مشاغل و افکار سے گھبرا جاتا ہے اور اس کی طبیعت زندگی کے جھگڑوں سے بیزار ہو کر لطف و تفریح کی متمنی ہوتی ہے، چنانچہ بقول الف شیلر (F. Schiller) یہی سبب ہے کہ ترقی تمدن کے ساتھ کسبیوں کی تعداد ضرورت سے زیادہ بڑھتی جا رہی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ برلن میں چند سال کے اندر اگر عام آبادی کی تعداد دوگنی ہوئی تو ان کی تعداد چوگنی ہو گئی۔

چارلس بوتھ (Charles Booth) نے لکھا ہے کہ ایک کسبی سے کہا گیا کہ "تو یہ ذلیل پیشہ کیوں نہیں چھوڑ دیتی؟" تو اس نے نہایت صاف جواب دیا کہ:-

"سنئے جناب میرا چاہنے والا روز مجھے کہیں نہ کہیں ڈنر میں لیجاتا ہے اور

ڈنر سے فارغ ہو کر ہم کسی تماشہ گاہ میں جا کر تفریح کرتے ہیں، پھر فرمایئے میری کیا شامت آئی ہے جو میں ایسی پر لطف زندگی سے دستبردار ہو جاؤں"

خادمائیں کیوں اکثر پیشہ ور بن جاتی ہیں

ہم اس سے قبل لکھ چکے ہیں کہ کسبیوں میں زیادہ تر اضافہ اُن عورتوں سے ہوتا ہے جو شریف اور متمول گھرانوں میں پیش خدمت یا ماما کا کام کر چکی ہیں اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ کوئی خفیہ تحریک ضرور ایسی ہے جو عورتوں کو فحاشی اختیار کرنے پر مائل کر دیتی ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ عورتیں جو گھروں میں کام کرتی ہیں انھیں تنخواہ دار فرد سے زیادہ نہیں سمجھا جاتا۔ وہ گویا گھر کا کام کاج کرنے والی مشینیں ہیں۔ ہر خادمہ بہت صبح اپنے کام پر پہنچتی ہے اور رات گئے مالک کے گھر سے چھٹکارا ہوتا ہے۔ نیچے آتے جاتے اور ادھر اُدھر پھرتے ٹانگیں ورم کر جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں مالکہ کی بد مزاجی برداشت کرنا اور صلواتیں سننا بھی خدمت گاروں کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے اُن ہی باتوں سے یہ عورتیں تنگ آجاتی ہیں۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ وہ دوزخ اور جنت کے درمیانی طبقہ اعراف میں رہتی ہے یعنی وہ اپنے چاروں طرف عیش و آرام اور ہر قسم کا سامان تعیش دیکھتی ہے لیکن اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی۔ آخر وہ بھی انسان ہے۔ وہ بھی پہلو اور پہلو میں ایک حساس دل رکھتی ہے اس کا دل بھی عیش و آرام اور تفریح کا متمنی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرزانہ زندگی

کی بے لطفی اور یکسانیت سے اُکتا کر وہ پیشہ اختیار کر لیتی ہے جس میں اسکی تفریح بھی ہوتی ہے اور زندگی بھی عیش و آرام سے گزرتی ہے۔

عورتوں کی تخریب میں مردوں کا ہاتھ

بعض اوقات یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کسبیوں میں سابق خادماؤں اور پیشہ خدمتوں کی کثرت ہونے کا باعث یہ بھی ہے کہ ایسی لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جنھیں اوّل اوّل ان کے آقاؤں یا خاندان کے دیگر نوجوانوں نے خراب کیا اور اس طرح وہ کسبی بننے پر مجبور ہوئیں اس میں شک نہیں کہ اس میں مردوں کا بہت زیادہ ہاتھ ہے لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ ان عورتوں کے کسبی بننے کا خاص سبب یہی ہے بلکہ تجربہ بتاتا ہے کہ گھروں کے نوجوان ماماؤں کو خراب نہیں کرتے بلکہ وہ خود بعض برائی کی طرف مائل کرتی ہیں۔

ناجائز بچوں کے متعلق جو اعداد و شمار سرکاری طور پر رکھے جاتے ہیں ان سے بھی اس معاملہ پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے مثلاً برلن میں ایک سو اسّی ۱۸۰ عورتوں نے ناجائز بچے جنے جن میں ایک ثلث تعداد خادماؤں اور پیشہ خدمتوں کی تھی اور بقیہ میں زیادہ تر وہ لڑکیاں تھیں جو کسی کارخانہ یا دکان میں کام کیا کرتی تھیں ایک سو تئیس ۱۲۳ صورتوں میں ان بچوں کے باپوں کی بھی تحقیق ہو سکی۔ ان میں سب سے بڑی تعداد (یعنی تینتیس ۳۳) کاریگروں کی تھی، ان کے بعد کاروباری لوگوں کا نمبر تھا

(بائیس ۲۲) صرف تین ۲۰ یا پچیس ۲۵ آدمی ایسے تھے جنھیں "جنٹلمین" کہا جا سکتا تھا
انیس ۱۹ صورتیں ایسی تھیں جن میں بچوں کے باپ شادی شدہ تھے۔

محققین کا قول ہے کہ اکثر ممالک میں لڑکیاں عموماً پندرہ ۱۵ تا بیس ۲۰ سال کی عمر کے درمیان کسبیاں بنجاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی عصمت و عفت کا خاتمہ اس عمر سے بہت قبل ہو چکتا ہے اور اس آبروریزی میں زیادہ تر ان ہی لڑکیوں کے ہم مرتبہ و ہم طبقہ مردوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عام لڑکیوں کو عموماً عام آدمی ہی خراب کرتے ہیں۔

تمدن عمرانی کی کشش

فرانس کے شہر بورڈو میں ڈاکٹر جنیل (Jeanel) نے کسبیوں کی بہت کافی تحقیقات کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ یہ امر باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ دیہات کی لڑکیاں عموماً اس وجہ سے شہر میں نوکری کرنے جاتی ہیں کہ وہاں پہلے ہی خراب ہو چکی ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں دیہات میں جو طامع، سست اور کم عقل لڑکیاں ہوتی ہیں وہ عموماً شہروں میں نوکری کرنے بھیج دی جاتی ہیں۔

اڈنبرا میں ڈبلیو ٹیٹ (W. Tait) نے معلوم کیا کہ مردوں کے دیگر طبقات سے زیادہ فوجی سپاہی خصوصاً "گھاگرا پلٹن" (Highlander) کے جوان، عورتوں کو بھگا کر خراب کرتے ہیں اور یہی حالت دیگر ممالک کے

سپاہیوں کی ہے۔ مثلاً جرمنی میں مسلسل تحقیقات کر کے دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی تسلسلۂ چاند ماری یا نقلی جنگ دیہاتی علاقوں میں فوجیوں کا اجتماع ہو جاتا ہے تو حرامکاری کی بھی کثرت ہو جاتی ہے۔ یہی حال آسٹریلیا کا ہے، ڈاکٹر گروس ہافنجر (Gross Haffinger) نے لکھا ہے کہ اس ملک میں جتنے ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں کم از کم ایک ثلث کو ذمہ دار فوجی سپاہی ہوتے ہیں۔

اطالیہ میں مارو (Marro) نے بائیس کسبیوں کے متعلق تحقیقات کر کے لکھا ہے کہ ان میں سے دس لڑکیوں نے فوراً خود کو حوالہ کر دیا تھا اور دس ایسی تھیں جن سے شروع میں کسی مکار اور بیوفا عاشق نے شادی کر لینے کا جھوٹا وعدہ کیا اور عصمت دری کی۔ بقیہ دو لڑکیاں ایسی تھیں جن کی آبرو ریزی کی گئی تھی، ان نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ ازالۂ دوشیزگی کے بعد ہی لڑکی کی طبیعت میلان جنسی اختیار کر لیتی ہے جسے پورا ہونے کی صرف تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی شادی جس کا انجام پانا دقت طلب ہے دوم استلذاذ بالنفس یا بالمثل۔ سوم قحبگی۔ مؤخر الذکر صورت چونکہ زیادہ دل فریب ہے لہذا لڑکیاں زیادہ تر اسی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔

جزیرہ سارڈینیا میں اسے مانٹیگزا (Mantegaza) یا ادر سیو فو (S.E. Ciuffo) نے کسبیوں کی تحقیقات کر کے معلوم کیا کہ یہاں زیادہ تعداد ایسی لڑکیوں کی ہے جو دیہات کی رہنے والیاں ہیں اور

جنھیں شروع میں ان کے ہم طبقہ مردوں نے خراب کر دیا تھا۔

الغرض معاشرت عمرانی کی دلفریبی و دلکشی عیش و راحت کی طرف رغبت پر ہیجان تفریح کا ذوق۔ یہ سب مل کر دیہاتی لڑکیوں کو اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں اور کچھ دنوں اِدھر اُدھر خراب پھرنے کے بعد بالآخر کسبیاں بن جاتی ہیں۔

شہر کی لڑکیاں چونکہ اسی ماحول میں پیدا ہوتی اور پرورش پاتی ہیں اس لیے شہری تمدن سے ان کا دل سیر ہوتا ہے۔ وہ شہر کی دلچسپیوں اور تفریحات سے مسحور نہیں ہوتیں۔ علاوہ ازیں وہ اس قدر ہوشیار ہوتی ہیں کہ بمقابلہ دیہاتی لڑکیوں کے ان دل فریبیوں کی کشش سے محفوظ رہتی ہیں اور کسبیوں کی زندگی کے اصلی واقعات سے بھی ایسی قدر واقف ہو جاتی ہیں کہ تاوقتیکہ کوئی خارجی اثر نہ ہو ان کی طبیعت کبھی پیشہ کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ الغرض شہر کی لڑکی کسبیگی کے زہریلے اثر سے زیادہ محفوظ رہتی ہے۔

عموماً تمام بڑے بڑے شہروں میں دیکھا گیا ہے کہ آبادی کی بہت تعداد شہر سے باہر پیدا ہوتی ہے اس لیے تعجب کی بات نہیں کہ شہر کی کسبیوں میں بھی زیادہ تعداد باہر والیوں کی ہو۔ اسی سلسلہ میں میریک (Merrick) نے مل بینک جیل میں چودہ ہزار کسبیوں کی تحقیقات کر کے معلوم کیا کہ سب سے زیادہ تعداد اُن عورتوں کی تھی جو اضلاع میں پیدا ہوئی

تھیں، اسی طرح لندن میں سات ہزار عورتیں ایسی تھیں جو شہر سے باہر پیدا ہوئی تھیں اور کول چسٹر (Colchester)، جیسے لشکری مقامات اور پورٹسمتھ جیسے بندرگاہوں سے بھی پہونچ گئی تھیں۔

ڈاکٹر سینجر نے تحقیقات کر کے معلوم کیا کہ نیویارک کی دو ہزار پیشہ ور عورتوں میں ۱۲۳۸ باہر کی تھیں اور ۷۶۲ وہ ہیں جو ریاست نیویارک میں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ زیادہ تعداد شمالی ملکوں سے آتی ہے جہاں کی آب وہوا خراب و ناخوشگوار ہوتی ہے اور جہاں کے لوگ کارخانوں میں میکانیکی زندگی بسر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ریوس (Reuss) کا بیان ہے کہ پیرس کی تقریباً تمام پیشہ ور عورتیں باہر کی ہیں۔ بورڈو کی ایک ہزار عورتوں میں صرف ۴۶، ایسی تھیں جو شہر کی رہنے والی تھیں اور بقول ڈاکٹر پوٹن (Patton) شہر لائنس (Lyons) کی تقریباً چار ہزار ایسی عورتوں میں صرف ۳۷۶ شہر کی رہنے والیاں ہیں۔ اسی طرح سنہ ۱۸۱۳ء میں ڈاکٹر شرینک (Shrank) نے تحقیقات کر کے بیان کیا تھا کہ شہر وائنا کی ڈیڑھ ہزار پیشہ ور عورتوں میں سے صرف ۶۱۵ شہر میں پیدا ہوئی تھیں۔

واقعات بالا سے ثابت ہے کہ تمدن و شائستگی کے دلفریب مناظر ہی عورتوں کو فحبگی کی طرف زیادہ دعوت دیتے ہیں اور مرد بھی ان سے

بڑی حد تک متاثر ہوتے ہیں۔ عام اور جاہل لوگوں کا خیال ہے کہ پیشہ ور عورتوں کا وجود صرف اس لئے ہے کہ وہ نوجوان ناکتخدا مردوں اور اُن مردوں کے لئے جن کی بیویاں نہ ہوں سکوں کا باعث ہوں مگر عقلاء کے نزدیک یہ خیال بالکل مہمل ہے۔ کیونکہ اگر اس اندیشہ سے تمام نوجوان مردوں کی شادیاں صغر سنی میں کردی جایا کریں تو یہ علاج اصلی بیماری سے زیادہ مضرت رساں ہوگا۔

اب رہی یہ بات کہ جن مردوں کی بیویاں موجود ہیں کیوں فحاشی اختیار کرتے ہیں۔ اس کا جواب اس واقعہ سے دیا جا سکتا ہے جو یورپ کی ایک پیشہ ور عورت ہڈ ویگ ہارڈ (Hed Wig Hard) نے اپنی "آپ بیتی" میں بیان کیا ہے۔

جس شہر میں وہ رہتی تھی وہیں ایک اعلیٰ طبقہ کا شخص بھی تھا جو ایک مرتبہ اُس کے یہاں کسی سابق شناسا کے ساتھ آیا اور پھر اسے بار بار آنے کا شوق ہو گیا، محبت کے پینگ بڑھے اور دونوں میں نہایت گہرے تعلقات ہو گئے۔ اس مرد کی بیوی تھی اور دو خوبصورت بچے بھی تھے۔ دونوں میاں بیوی میں اسقدر اُلفت تھی کہ دیکھ کر لوگ متعجب ہوتے تھے۔ مرد بھی بڑا صاحب علم و فضل شخص تھا۔ ایک دن اس عورت نے دریافت کیا کہ:۔

"مجھے سخت حیرت ہے کہ باوجودیکہ تمہارے گھر میں اس قدر حسین و جمیل بیوی موجود ہے۔ دو پیارے پیارے بچے آگے کھیلتے ہیں پھر

تم کو میرے پاس آنے کا کیونکر حوصلہ ہوتا ہے۔"

یہ بات سُن کر وہ مرد ہنسا اور بولا :۔

"یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن اس بیوی کے حسن و جمال سے میرے دل کو تسکین نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا دل میرے لیے برف کا ایک ٹکڑا ہے علاوہ ازیں وہ سخت زبان دراز اور بدمزاج ہے۔ ماں باپ نے نازو نعمت میں پال کر اس کی عادتیں خراب کر دی ہیں اور وہ دنیا میں صرف اپنے لیے جیتی ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ مردوں کی بے راہ روی کی ذمہ داری بڑی حد تک بیویوں پر عائد ہوتی ہے جو مردوں کے مزاج و ذوق کا خیال نہ کر کے اپنی طرف سے انھیں بیزار کر دیتی ہیں۔ اگر شروع سے لڑکیوں کی فطرت میں اتنی لچک پیدا کر دی جائے کہ وہ ماحول کے مطابق اپنے عادات و خصائل میں پیدا کر سکیں تو مرد بڑی حد تک فحاشی سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

مردوں کی عجیب سائیکالوجی مرد جب ایک بار سیدھے راستہ سے ہٹ کر غلط راہ اختیار کر لیتا ہے تو اسکی گمراہیاں عجیب و غریب ہوتی ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ وہ دفعتاً انسان سے حیوان کیونکر بن گیا۔

مغرب کی ایک پیشہ ور عورت نے اپنی "زندگی کا کچا چٹھا" لکھا تھا۔ اسمیں سے مندرجہ ذیل اقتباس غالباً باعث دلچسپی ہوگا۔ وہ لکھتی ہے کہ :۔

"میں دیہات کی رہنے والی ہوں۔ ہمارے گاؤں میں کبھی کبھی ایک بڈھا دولتمند آیا کرتا تھا جو بالکل خوش غلاف ہو کر کڑا ہو جاتا تھا۔ اسوقت میری عمر تیرہ سال کی تھی بالآخر یہ شخص گرفتار ہو کر قید ہوا۔ لیڈ کو بنیے مردوں میں عجیب عجیب غریب شوق دیکھے مثلاً میرے یہاں ایک جوان کھیل کے لباس میں آتا اور اپنے ساتھ ایک ٹوکری میں بند کبوتروں کا ایک جوڑا بھی لاتا۔ اس جوان کے آنے کے بعد ہم دونوں بحالت عریانی ایک ایک کبوتر ہاتھ میں لے لیتے اور انکی گردنیں مروڑ کر زمین پر ڈال دیتے۔ وہ جوان ان کبوتروں کو تڑپتا دیکھا کرتا اور صرف اسی سے اسکے ذوق کو تسکین ہو جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ مجھے بازار میں ایک مرد ملا اور بولا کہ اگر آپ پسند کریں تو میرے ساتھ اس ہوٹل میں چلیں وہاں میں آپ کے بوٹ چاٹنا چاہتا ہوں۔ معاملہ طے ہو گیا ہم دونوں ایک ہوٹل میں گئے نصف پونڈ میں ایک کمرہ لیا میں میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ مرد میز کے نیچے گھس گیا اور اس نے میرے بوٹ جو کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے اپنی زبان سے خوب چاٹے اور چلا گیا۔ ایک صاحب کا شوق صرف اس طرح پورا ہو جاتا تھا کہ وہ منہ میں پیشاب کرا لیا کرتے تھے۔ ایک صاحب کو یہ شوق تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں ایک قمچی لاتے اور میری ساتھی عورت کو خوب پیٹتے حتیٰ کہ بیچاری کے خون تک نکل آتا۔ عورت کی یہ حالت دیکھ کر ان حضرت کو انتہائی لطف آتا۔"

استلذاذ بالمثل

استلذاذ کی مختلف صورتیں

حکماء کا قول ہے کہ جب انسان نشو ونما پاکر جوان ہوتا ہے تو اسکے قوائے جنسی میں تین اہم خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں (۱) استلذاذ بالنفس (۲) استلذاذ بالمثل (۳) استلذاذ بالضد۔

استلذاذ بالنفس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کا رحجان جنسی خود اپنی ہی ذات کی طرف ہو اور یہ کیفیت وحشی اقوام میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔

استلذاذ بالمثل سے مراد یہ ہے کہ مرد وعورت کا رحجان خود اپنی ہی جنس کی طرف ہو، جو زیادہ تر کمسنی میں پایا جاتا ہے۔ اور استلذاذ بالضد سے وہ فطری تعلق جنسی ہے جس سے ہر شخص واقف ہے۔

چھوٹی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو عموماً دوسری جنس سے رغبت نہیں ہوتی بلکہ نفرت سی ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ استلذاذ بالنفس کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جسے مساحقہ اور استمناء بالید وغیرہ کہتے ہیں پھر جب نشو ونما میں کچھ پختگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو استلذاذ بالمثل کا شوق پیدا ہوجاتا ہے اور جب پوری طرح پختگی ہوجاتی ہے تو استلذاذ بالضد کی منزل آتی ہے۔

بعض شخص ایسے ہوتے ہیں جو ذو جنسین ہوتے ہیں یعنی ان میں دونوں جنسوں کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔

جنسیات اور استلذاذ بالمثل افسوس ہے کہ دیگر فحاشیوں کی طرح اس نوع کی فحاشی نے بھی آغوش تہذیب میں نشو ونما پائی، یونانی قدیم کی خرافات میں لکھا ہے کہ:۔

"سب سے پہلے افرودیتہ دیوی (Aphrodite) بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئی تھی۔ کیونکہ یورینوس دیوتا نے اختلاط کے لیے اپنی ہی جنس کا ایک فرد پسند کیا تھا[1]۔ اس دیوتا کا جذبہ عشق و محبت مردانہ تھا۔ جس شخص کے دل میں یہ دیوتائی جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ استلذاذ بالمثل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔"

مشہور و معروف یونانی مورخ و سیاح ہیروڈوٹس نے سیتھین (Scythians) قوم کا حال لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ ان لوگوں میں استلذاذ بالمثل کی نمایاں خصوصیات موجود تھیں وہ لکھتا ہے کہ:۔

"اس قوم کے بعض مردوں میں نسائیت کا مادہ اس قدر پایا جاتا ہے کہ وہ عورتوں کا لباس پہنتے ہیں اور عورتوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

مورخ مذکور نے اسکی عجیب غریب توجیہ کی ہے کہ چونکہ ان لوگوں نے

(۱) افلاطون کی کتاب "ضیافت" Banquet باب ۸ و ۹

بمقام عسقلان، وینس دیوی (Venus) (زہرہ) کا مندر لوٹ لیا تھا اس لئے ان پر دیوی کا قہر نازل ہوا اور اس نے ان کو مرد سے عورت بنا دیا۔

بقراط (Hippocrates) چونکہ مافوق الفطرۃ باتوں کا معتقد نہیں تھا اس لئے اس نے قوم ستھین کی اس علت کا سبب ضعف رجولیت قرار دیا وہ لکھتا ہے کہ:۔

> "یہ قوم ضرورت سے زیادہ شہسواری کرنے کی وجہ سے ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے جس کا علاج کانوں کے پیچھے کی رگوں میں فصد کھلوا کر خون نکال دینا ہے اور اس خون کے نکل جانے کا نتیجہ ضعف رجولیت ہوتا ہے اور وہ افراد جو اس طرح اپنی قوت کھو بیٹھتے ہیں یا یوں لا علاج ہو کر عورتوں کا لباس پہن لیتے ہیں۔"

بعض محققین کا خیال یہ ہے کہ قدیم یونانیوں میں اس کا شوق اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھتی جاتی تھی اور اس کی روک تھام کے لیے وہ لوگ عورتوں سے بچنے لگے تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں یونان کے اندر ریاست ہائے بلدیہ کا رواج تھا، اور ایک شہر کے وسائل پیداوار چونکہ صرف محدود آبادی کے لیے کفایت کر سکتے تھے اس لیے ان لوگوں کو یہ فکر دامنگیر رہتی تھی کہ آبادی کی تعداد بڑھنے نہ دی جائے۔ یہی باعث تھا کہ حکیم ارسطو جیسے شخص نے بھی لوگوں کو یہی مشورہ دیا تھا کہ اپنی بیویوں کو چھوڑ دیں اور

استلذاذ بالمثل اختیار کریں۔ لطف یہ ہے کہ ارسطو سے بیشتر حکیم سقراط بھی اس حرکت کو فعل مستحسن قرار دے چکا تھا۔

دیوتیما نے حکیم سقراط کو عشق و محبت کا ایک روحانی اصول بتایا تھا جو استلذاذ بالمثل کے ذریعہ سے ایک اور اعلیٰ منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور خدا سے ملا دیتا ہے۔ چنانچہ دیوتیما کہتا ہے کہ:-

"جو مرد خواہشات نفسانی کے بندے ہوتے ہیں وہ عورتوں کے پیچھے دوڑتے ہیں لیکن وہ مرد جو اپنی روح کے وسیلہ سے عشق و محبت کرتا ہے اور جس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ نکوکاری اور فرہنگ و دانش کے ذریعہ سے ایک صاحب عظمت اور خوبصورت روح حاصل کرے اسکو چاہیے کہ پوری طرح اس کا تابع ہو جائے۔"

بظاہر تو یہ تعلیم نہایت پاک اور معصومانہ نظر آتی ہے لیکن یہ خیال کر لینا چاہیے کہ قدیم یونانیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ خوبصورت روح صرف مرد ہی کے اندر مل سکتی ہے۔ اب غالباً اس تعلیم کا اصلی مفہوم واضح ہو گیا ہو گا۔ یہی قول ڈاکٹر بیطر انس ایم نیکل کا بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:-

"صاحب عظمت اور خوبصورت "روح" صرف مردانہ صورت میں مل سکتی ہے۔ عورتیں حیوانات مطلق طبقہ سے متعلق ہیں جو مرد کی صرف خواہشات نفسانی پوری کرنے کے لیے وجود میں آئی ہیں۔"

جب قدیم یونانیوں نے عورتوں کی طرف سے غفلت برتنا شروع کر دی تو عورتوں میں بھی استلذاذ بالمثل کا رواج ہو گیا۔ چنانچہ جزیرہ لیسبوس، ایسی عورتوں کے لیے خاص طور پر مشہور ہو گیا تھا اور اسی تاریخی واقعہ سے انگریزی کی اصطلاح (Lesbian Love) "عشق لسبانی" نکلی ہے۔ سیفو (Sappho) جو بلبل لیسبوس کے نام سے مشہور تھی اور جس کا زمانہ ۶۰۰ ق۔م کے قریب گزرا ہے وہ اس فن کی بہت بڑی استاد تھی۔ چنانچہ انگریزی میں لفظ (Sapphism) کا مفہوم ہی عورتوں کا استلذاذ بالمثل ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے جذبات خصوصی کا اظہار اپنے اس قصیدہ میں کیا ہے جو وینس دیوی کی شان میں لکھا تھا وہ کہتی ہے :۔

"اے وہ جو پھولوں کے رنگ عظمت و جلال پر متمکن ہو کر حکومت کر رہی ہے، اے وہ جس کی پیدائش کف دریا سے ہوئی ہو عیارہ! اور بنت فیوس میں فریاد سن! او دیوی! تو مجھے سخت غم و الم اور درد دل سے ہلاک نہ ہونے دے۔"

یونانیوں کے نزدیک معیار حسن و جمال در حقیقت حسن مردانہ تھا اور اس حسن میں مادہ ذوجنسیت (Bisexuality) گویا سونے میں سہاگہ تھا یونان قدیم کے بتوں میں بھی یہی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اپالو اور دیونسوس کے بتوں میں زنانہ و مردانہ خصوصیات موجود ہوتی تھیں۔ زنانہ بتوں میں بھی

مردانہ حسن صورت اور مردانہ تناسب اعضا کا خیال رکھا جاتا تھا۔

دنیائے قدیم میں غیب دانی اور کہانت کا سب سے بڑا مرکز ڈیلفائی کا مندر تھا۔ اس میں سب سے بڑا بت اپالو تھا۔ اس بت کے حسن و جمال، تناسب اعضا اور خد و خال میں زنانہ اور مردانہ دونوں خصوصیات موجود تھیں۔ یہ بت فن موسیقی اور استلذاذ بالمثل کا خاص دیوتا تھا۔ کیونکہ دراصل یہ ڈورین (Dorian) قوم کا سب سے بڑا بت تھا اور یہی وہ قوم تھی جو خطہ یونان میں استلذاذ بالمثل کی وبا لائی تھی۔ اپالو کی نسبت یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ اس نے ایک اژدہے کو قتل کیا تھا جس کا خون جسم پر پڑنے سے وہ ناپاک ہو گیا تھا۔ یہ ناپاکی دور کرنے کی غرض سے وہ ایڈمیٹس (Admitus) شاہ فیرائی (Pherai) کا نو برس تک معشوق بنا رہا۔

میولر (Muller) نے ڈورین قوم کے ایک مذہبی تہوار کا حال بیان کیا ہے جس میں ایک خوبصورت لڑکا اپالو کا روپ بھرتا تھا اور جس طرح اپالو نے السستیس (Alcestis) کا غلام اور معشوق بن کر اس کی نہایت ذلیل خدمت انجام دی تھی اسی طرح یہ بھی کرتا تھا۔

ڈاکٹر بلاخ (Blach) کا خیال یہ ہے کہ چونکہ استلذاذ بالمثل قدیم زمانہ کی اقوام و ملل کے نزدیک ایک عجیب و ناقابل فہم بات تھی اسلیے مجبوراً لوگوں نے اس فعل مذموم کو بھی ایک قسم کا کراماتی فعل قرار دیدیا اور یہی باعث

تھا کہ جو عورت یا مرد اس کا شوقین ہوتا تھا اس کو یہ لوگ بہت بڑا صاحب کرامات یا مافوق الفطرۃ طاقتوں کا مالک سمجھتے تھے اور اسکی بیحد عزت و تکریم کرتے تھے۔

ایک جرمن فاضل ایڈولف باسچین (Adolf Bastion) کا نظریہ یہ ہے کہ قدیم اقوام و ملل کے پجاری جو قدرت کے قوائے ذو جنسین کے نمائندے تھے اپنے مندروں اور عبادت گاہوں میں استلذاذ بالمثل کی بھی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مرد فطرت کی قوت فاعلہ کی پوجا کرتے تھے اور عورتیں تخلیہ یا علیحدگی میں فطرت کے قوائے نسائیہ کی تقدیس و تمجید کیا کرتی تھیں اور چونکہ پجاریوں کو مرد و زن دونوں کی تالیف قلوب کرنی پڑتی تھی، اس لیے انھوں نے کمال ذو زوال جرم قمر سے تغیرات جنسی کا خیال حاصل کیا۔ چنانچہ جب وہ دیویوں کی خدمت کرتے تھے تو زنانہ لباس پہن لیتے تھے اور جب دیوتاؤں کی خدمت کا وقت آتا تھا تو مردانہ لباس میں کام کرتے تھے۔ ستم ظریفی یہ کہ انھوں نے زہرہ کا بت مع داڑھی کے بنا لیا اور ہرقلیس دیوتا کے ہاتھ میں چرخہ دیدیا۔ الغرض تقریباً تمام دیوتاؤں کو خصوصیات ذو جنسیت دیدی گئی تھیں۔ وینس اور آفرودیتہ کی پوجا بھی دونوں صورتوں میں کیجاتی تھی۔

فریزر نے اپنی کتاب ایڈونیس میں لکھا ہے کہ جزیرہ قبرص میں وینس کا ایک بت تھا جس کی وضع قطع تو ایک داڑھی مونچھ والے مرد کی تھی مگر اسے لباس زنانہ پہنایا گیا تھا۔ مرد زنانہ لباس میں اور عورتیں مردانہ بھیس میں اس بت کی پوجا کرتی تھیں اگرچہ بارینٹس و بروت دیویوں کی پوجا خاص طور پر ملک شام اور

جزیرہ قبرص میں ہوتی تھی لیکن قدیم مصریوں نے بھی آئسیز (Isis) دیبی کا ایک ایسا ہی بت بنا رکھا تھا جس کی گود میں ایک بچہ ہورس بھی تھا۔

قدیم یونانیوں کا صنم اکبر ذیوس تھا۔ اس کی شان میں جو بھجن گائے جاتے تھے ان میں بھی اس بت کی زنانہ اور مردانہ خصوصیات کا اظہار کیا جاتا تھا مثلاً۔ ذیوس! ہوالاول! ہوالآخر۔ چمکتی ہوئی بجلیوں کا مالک۔ وہی سر ہے وہی کمر ہے اور اسی کے اندر سے تمام مخلوقات عالم وجود میں آئیں۔ ذیوس ہی مرد ہے اور پھر ذیوس ہی عورت ہے۔ یعنی دوشیزۂ ازلی۔"

ایک دوسرے بھجن میں ایڈونیس کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے:۔

"اور بہت سے ناموں والے دیوتا، جو سب معبودوں میں بہترین ہے میری سن! اپنے پرستار کی سن! اے خوبصورت بال والے ایڈونیس! جو ایک جوان رعنا اور دوشیزۂ طناز دونوں ہے۔"

علماء و فضلاء کا خیال یہ ہے کہ یونان میں امرد پرستی کا شوق ڈورین قوم نے جاری کیا تھا کیونکہ زمانۂ قبل تاریخ (مثلاً ہومر کے زمانہ میں) اس کا ذوق وہاں نہ پایا جاتا تھا۔

یونان میں امرد پرستی کا شوق خاص خاص لوگوں تک محدود تھا یعنی صرف آزاد شہریوں اور بانکے شہسواروں کو اس کی اجازت تھی۔ غلام طبقہ اسکی جرات نہ کر سکتا تھا اور اگر کوئی فرد اس طبقہ کا ایسا کرتا تو اس کے لیے سزائے موت مقرر تھی

بڑھتے بڑھتے جب یہ شوق عام ہو گیا تو ایک معاشرتی ادارہ بن گیا اور حکومت نے بھی اس کی سرپرستی اختیار کر کے مختلف آئین قوانین وضع کیے۔

اسپارٹا میں ایسے لوگوں سے سخت بازپرس کی جاتی تھی اور اگر کسی لڑکے سے کوئی قابل شرم حرکت سرزد ہو جاتی تو اسے تو کچھ نہ کہا جاتا تھا لیکن اس کے اغوا کرنے والے کو سخت سزا دی جاتی تھی۔

جزیرہ کریٹا میں اس شوق نے اس قدر ترقی کی تھی کہ لڑکوں سے شادیاں کی جاتی تھیں۔ اگر کوئی مرد کسی لڑکے پہ مائل ہو جاتا تو اسکے والدین یا اعزہ کو آگاہ کر دیتا تھا۔ پھر اگر اس کے خاندان والے اس "رشتہ" یا تعلق کو پسند نہیں کرتے تھے تو وہ اس کی حفاظت کرتے تھے ورنہ پھر اس تعلق کو ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کیجاتی تھی۔ ایک عاشق جس قدر اعلیٰ مرتبہ کا ہوتا تھا اسی قدر لڑکے کے خاندان والے فخر و ناز کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ مع تحائف کے اپنے گھر بھیج دیا جاتا تھا۔

قدیم یونان کے طرز معاشرت میں امرد پرستی کا رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ اگر کسی لڑکے کو کوئی چاہنے والا بانکا شہسوار نہیں ملتا تھا تو اس کے لیے یہ بات باعث شرم و ذلت سمجھی جاتی تھی اور اگر کسی کے چاہنے والوں کی تعداد درجنوں تک پہنچ جاتی تھی تو باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ کریٹا، تھیبا اور تھیرہ میں تو لڑکوں کے ساتھ شادی کرنے کی رسم کو مذہبًا منظور کر لیا گیا تھا۔ شہر تھیبا سے قریب، سمندر کے کنارے اپالو کے مندر سے تقریبًا ۰۰،۷۰۰ گز کے فاصلہ پر وہ مقام ہے جو

خداوند ڈیوس کے نام سے منسوب ہے۔ یہاں حسب ذیل کتبہ پتھر پر منقوش ہے:۔

"اس مقدس و متبرک مقام پر زیر سایہ خداوند ڈیوس بادشاہ کریون نے بانقلیس کے بیٹے سے شادی کی اور اس نے اپنی حرکت کا دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ اعلان کر کے اسکی یادگار میں یہ کبھی نہ محو ہونے والا کتبہ قائم کیا اس کے ساتھ بہت سے اہل تھیرہ نے اور اس کے بعد بھی بہت سے لوگوں نے اسی مقدس مقام پر لڑکوں سے شادیاں کیں۔"

روم کے دور ملوکیت میں فحاشی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ان کو دیکھ کر خیال گزرتا تھا کہ شاید لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ اسی زمانہ کا حال قلمبند کرتے ہوئے بیل (Beale) نے لکھا ہے کہ:۔

"مرد و زن فحاشی میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے، فحبہ خانوں کی تعداد بے حد بڑھ گئی تھی اور امرد پرستی کا ذوق اس درجہ عام ہو گیا تھا کہ شہر روما میں عصمت فروش لڑکوں کی تعداد کسبیوں سے بھی زیادہ ہو گئی تھی لیکن اس کے بعد ایک نہ مانہ وہ بھی آیا جب امرد پرستی کے خلاف جہاد ہونے لگا اور شہنشاہ قسطنطین اور تھیوڈوسیس نے سخت سزائیں تجویز کیں یہاں تک کہ مرتکبین جرم کو زندہ جلا دیا جاتا تھا۔"

استلذاذ بالمثل اقوام و ملل قدیمہ میں

ڈاکٹر ڈبلیو۔ اے ہیمنڈ (Hammond) نے

اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ :-

"امریکہ کی ریاست "نیو میکسیکو" میں علاقہ "پیوبلو" (Pueblo) کے قدیم امریکن قبائل میں یہ رواج ہے کہ ان کا ہر قبیلہ اپنے ہاں ایک آدمی تیار کرتا ہے جسے ان کی اصطلاح میں مجیرادو (Mujerado) کہتے ہیں۔ یہ شخص فصل بہار کی مذہبی رسوم اور تہواروں میں نہایت اہم حصّہ لیتا ہے۔ ان تہواروں میں خوب رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں اور امرد پرستی کا بازار گرم ہوتا ہے۔"

یہ شخص یعنی "مجیرادو" اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ قبیلہ میں سے کوئی تندرست مرد چن لیا جاتا ہے۔ اس شخص کو گھوڑے کی سواری خوب کرائی جاتی ہے اور کثرت کے ساتھ استمنا بالید کی ترغیب دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بالکل بیکار ہو جاتا ہے اس کی ڈاڑھی مونچھ کے بال گرنے لگتے ہیں آواز کا مردانہ پن زائل ہو جاتا ہے اور مزاج میں نسائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسکے بعد "مجیرادو" کی جگہ مردوں میں نہیں رہتی۔ وہ عورتوں کے سے اوضاع و اطوار اختیار کر لیتا ہے لیکن بایں ہمہ تہواروں میں اسکی بڑی عزت کیجاتی ہے۔

ڈاکٹر ہیمنڈ کی چونکہ یہ قبائل بیحد عزت و توقیر کرتے تھے، اس لیے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو دو "مجیرادو" دیکھنے کا موقع دیا، ان میں ایک کی عمر ۳۵ سال کی تھی اور سات سال قبل اس کی قلب ماہیت ہو چکی تھی۔ پہلے وہ

بڑا طاقتور مرد تھا، جس وقت ڈاکٹر صاحب نے اس شخص کو دیکھا تھا تو وہ عورتوں میں شامل ہو چکا تھا اور اس میں اور عورتوں کے اطوار میں مطلق فرق نہ تھا قدرت کا قاعدہ ہے کہ جب انسان کی کسی خاص قوت میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے تو وہ دوسری طرف ظاہر ہونے لگتی ہے مثلاً اندھوں کا حافظہ قوی ہو جاتا ہے انکی قوت لامسہ اور خوش گلوئی میں ترقی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب اس شخص کی قوت مردمی زائل ہوئی تو سینہ پر چھاتیاں بھی ابھر آئیں، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کئی بچوں کی "ماں" ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ یہ بھی دعویٰ کرتا تھا کہ کئی بچوں کو جن کی مائیں فوت ہو گئی تھیں اس نے اپنا دودھ پلا کر پالا۔

دوسرے "مجیرادو" کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ اس پر دس برس ہوئے نسائیت طاری ہوئی تھی۔ لیکن اس کی چھاتیاں زیادہ نہ ابھری تھیں۔ آواز میں نسائیت اور جسم میں نرمی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔

کثرت کے ساتھ گھوڑے کی سواری کرنا مردمی کے لیے سخت مضر ہے، اور اس امر کی تائید بڑے بڑے ماہرین فن نے کی ہے۔ آباچہ اور نواجو قومیں اپنی عمر کا زیادہ حصہ گھوڑے کی پشت پر گزارتی ہیں۔ یہی باعث ہے کہ لوگ عموماً ضعیف الباہ ہوتے ہیں۔ کراپوتھ (Cnapsoth) اور چوٹومسکی (Chotomskci) نے لکھا ہے کہ:۔

" فی زمانہ تاتاریوں میں نامردی کی علت بہت زیادہ پائی جاتی ہے جبکہ

باعث یہی ہے کہ وہ لوگ کثرت سے ساتھ گھوڑوں کی سواری کرتے ہیں۔"

ویسٹر مارک (1) نے اپنی مشہور ویادگار کتاب "ابتدا اور ارتقاء تخیلات اخلاقیہ"

میں قوم کوریاس کا حال تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"کراشے نینی کاف (Krashi neni Koff) نے (Ki Ve) لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو مردوں کے پاس بطور حرم کے رہتے ہیں۔ موسیو موصوف بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ علاقہ بحرین (Behring Strait) کی قوم قمچادلہ (Kamchdala) کے ان لوگوں کے مانند ہیں، جنھیں ان کی اصطلاح میں کوئی قوق (Koi Keue) کہتے ہیں یعنی وہ مرد جنھیں عورت بنالیا گیا۔ کوئی قوق کو فن سحر وساحری اور تعبیر خواب کا بھی ماہر سمجھا جاتا ہے، یہ لوگ زنانہ لباس پہنتے ہیں، عورتوں کے کام کرتے ہیں اور مردوں کے ساتھ عورت کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

ایک اور جگہ شمالی امریکہ کے باشندوں کے متعلق ویسٹر مارک تحریر کرتے ہیں :-

"شمالی امریکہ کے اصلی باشندے ان لوگوں سے کسی قسم کی نفرت نہیں کرتے جو استلذاذ بالمثل کے عادی ہیں یا جنھوں نے زنانہ لباس اور زنانہ اوضاع اطوار اختیار کر لیے ہیں، بلکہ کا دیاک ایسے افراد پر فخر و ناز کرتے ہیں اور

(1) Wester marcks Origin and developement of the moralideas.

ان کو محبت و دوستی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

کپتان جیمس ولن نے ۱۷۹۶ء سے ۱۷۹۸ء تک جزائر بحر جنوبی کی سیر و سیاحت کی تھی اور وہاں انھوں نے ایسے مرد دیکھے جو زنانہ لباس پہنتے تھے اور لوگ ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

" مجھے یہ بات دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ یہاں کی عورتیں بھی ان لوگوں سے نفرت و حقارت نہیں کرتیں بلکہ دوستانہ تعلقات رکھتی ہیں۔"

ایک دوسرے سیاح اور مسیحی مبلغ جنھوں نے جزائر بحر جنوبی کی سیر کی تھی ولیم ایلس (Williams Ellis) ہیں۔ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان جزائر کے باشندوں کو استلذاذ بالمثل کی اجازت پوجاریوں کی طرف سے ہے اور بعض اوقات وہ اپنے دیوتاؤں کا سچا نمونہ بن جاتے ہیں۔

چین و جاپان نیز ملایا میں بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ مقتدایان مذہب کے پاس جنھیں بونزہ یا بونجہ (Bonzes) کہتے ہیں لڑکے ہوتے تھے جن کا تعلق مندر کی خدمت سے ہوتا ہے۔ ہر پروہت یا پجاری کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ایک چیلا رکھے تاکہ اسے تعلیم دے اور مذہبی رسوم ادا کرنا سکھائے اور یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ گرو اور چیلے دونوں میں بہت گہری محبت ہوتی ہے۔

فرانسیس زیویر جنھوں نے ۱۵۴۹ء میں جاپان کی سیاحت کی تھی انھوں نے بھی یہی حال بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ :۔

"بوبجہ لوگ خود اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ چیلوں سے ان کے تعلقات شہوانی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ فعل کوئی گناہ نہیں ہے ستم ظریفی یہ ہے کہ لڑکوں سے تعلق تو ان کے نزدیک کوئی گناہ نہیں مگر عورت سے تعلق رکھنا گناہ کبیرہ ہے جس کی سزا قتل ہے۔"

ایک روسی سیاح موسیو داویداڈ (Dawydow) نے ۱۸۰۰ء کے قریب یہ سفرنامہ لکھا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ شمالی امریکہ کے جزیرہ نمائے الاسکا (Alaska) کے متعلق کادیاک (Kadiak) نامی ایک جزیرہ ہے جس میں کونیاگا قوم رہتی ہے۔ اس قوم میں بعض مرد پائے جاتے ہیں جن کی ٹھوڑیاں گودی ہوئی ہیں اور جو زنانہ لباس پہنتے ہیں۔ عورتوں کی طرح ان کے شوہر بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض تو بجائے ایک کے دو خاوند رکھتے ہیں ان کو وہاں کی زبان میں اخنوتشیق (Achnutochisn) کہتے ہیں، قوم میں ان لوگوں کی سب سے زیادہ عزت و توقیر کی جاتی ہے اور لوگ عام طور پر انہیں جادوگر سمجھتے ہیں۔ جو مرد بجائے عورت کے کسی "اخنوتشیق" کو رکھتا ہے وہ قابل رشک خیال کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں جب کوئی بچہ صورت شکل میں زنانہ پیدا ہوتا ہے یا اس کے اوضاع و اطوار زنانہ ہوتے ہیں تو اس لڑکے کو اخنوتشیق بنا دیا جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر والدین کو لڑکی کی خواہش ہے اور بجائے لڑکی کے پیدا ہو گیا لڑکا تو اس لڑکے کو "اخنوتشیق" بنا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فریزر (Frazer) نے اپنی کتاب الموسومہ بہ ایڈونس آتیس واوسی ریز (Adonis Attis aseries) میں جزیرہ پیلو (Pelew) کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ پجاری لوگ جو زنانہ لباس پہنتے تھے اس کا باعث یہ بتایا جاتا تھا کہ دیوی اپنے پجاری اور بھگت کو عورت بنانا پسند کرتی ہیں۔ جب ایسا ہوتا تھا تو منظور نظر پجاری زنانہ لباس پہن لیتا تھا اور اسی روز سے اسے عورت سمجھا جاتا اور اس کے ساتھ عورتوں جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اکثر وحشی قبائل میں جو زنانے پائے جاتے ہیں اس کا باعث غالباً یہی عقیدہ ہے، ایسے لوگ عام طور پر بہت بڑے جادوگر اور طبیب خیال کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کے زنانے پجاری اور جادوگر بورنیو کی قوم دیاک (Dyaks) جنوبی سیلی بیز کی قوم برجی (Bugis) جنوبی امریکہ کے پاٹاگونیوں (Patagonions) اور جزیرہ مڈگاسکر میں پائے جاتے ہیں، یہ لوگ زنانہ لباس پہنتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ دیوتاؤں کی خدمت کرتے ہیں۔ افریقہ کی سلطنت کانگو (Congo) میں ایک بڑا پجاری تھا جو عموماً زنانہ لباس پہنتا تھا اور جب لوگ اسے "نانی اماں" کہتے تھے تو وہ بہت خوش ہوتا تھا۔

ممالک مشرق کی قدیم ترین کتابوں میں استلذاذ بالمثل کا ذکر بائبل میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو توریت صحیفہ پیدائش باب ۱۹۔ آیتہ ۴ لغایتہ ۸:—

"اور اس سے پہلے کہ وہ لیٹے شہر کے مردوں یعنی سدوم کے مردوں نے جوان سے لیکے بوڑھے تک سب لوگوں نے ہر طرف سے اسکے گھر کو گھیر لیا۔ اور انھوں نے لوط کو پکار کے کہا کہ وہ مرد جو آج کی رات تیرے یہاں آئے کدھر ہیں؟ انھیں ہمارے پاس باہر لا تاکہ ہم ان سے صحبت کریں۔ تب لوط انکے پاس باہر گیا اور کواڑ اپنے پیچھے بند کر لیا اور کہا کہ اے بھائیو! ایسا بڑا کام نہ کیجیو۔ اب دیکھو میری دو بیٹیاں ہیں جو مرد سے واقف نہیں مرضی ہو تو انکو تمہارے پاس نکال لاؤں، مگر ان مردوں سے کچھ کام نہ رکھو......"

اقتباس مندرجہ بالا سے دو باتیں معلوم ہوئیں جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اس زمانہ میں شہر سدوم (Sodom) استلذاذ کا زبردست مرکز تھا اسی لفظ سدوم سے انگریزی لفظ سوڈومی (Sodomy) نکلا ہے جس کے معنی استلذاذ بالمثل کے ہیں۔

(۲) لوط کے زمانہ میں امرد پرستی کا بیحد چرچا تھا، اسی سے الفاظ لوطی اور لواطت نکلے ہیں جو آج تک رائج ہیں۔

ابتدائے تاریخ سے اس وقت تک یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں اسکا شوق موجود رہا ہے اور اب بھی ہے اگرچہ وقتاً فوقتاً بانیان مذہب اور مصلحین ملت اس فعل مذموم کو جرم قرار دیتے رہے۔ وادی فرات و دجلہ میں خط پیکانی (Cuniform) کے جو کتبے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں

شہنشاہ آشوریہ حمورابی کے آئین و قوانین بھی درج ہیں ان کے مطالعہ سے
کہ کسی وقت ملک آشوریہ میں بھی یہ شوق موجود تھا۔

ملک مصر کے علاقہ کفیوم سے فلنڈرس پیٹری (Flinders Pet)
کو ایک قدیم مخطوطہ دستیاب ہوا تھا جس کا ترجمہ گرفیتھ نے کیا تھا۔ اسکے مطالعہ
سے معلوم ہوتا ہے کہ چار ہزار برس سے زیادہ گزرے کہ اسوقت بھی یہ فعل
بکثرت رائج تھا اور لوگ اسے اس قدر اچھا سمجھتے تھے کہ انھوں نے اس کو
اپنے دو مشہور معروف دیوتاؤں ہورس (Horus) اور سیت (Set)
کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ قدیم مصریوں کے نزدیک یہ فعل کوئی جرم یا گناہ نہ تھا
بلکہ وہ لوگ حسن مردانہ ہی کو معیار حسن جمال سمجھتے تھے اور ہرشفیلڈ (Herschefeld)
کا قول ہے کہ قدیم مصری عورتوں میں بھی استلذاذ بالمثل کا شوق موجود تھا۔ (1)

حکیم ارسطو نے بیان کیا ہے کہ جزیرہ کریٹا میں کثرت آبادی کم کرنے کی غرض
سے یہ مشغلہ قانوناً جائز قرار دیا تھا اور پروفیسر سیڈلن کا قول ہے کہ شمالی آسٹریلیا
اور نیوگنی کے جنوبی سواحل پر جو قومیں بستی ہیں ان میں بھی آبادی کی روک تھام کیلیے
اسکی تائید و حمایت کیجاتی ہے لیکن اس بات کی شہادتیں بہت کم ہیں۔

یہ مشغلہ زیادہ تر سپاہیوں اور جنگجو اقوام میں پایا جاتا ہے کیونکہ جنگ کے
زمانہ میں فطری ذرائع حاصل نہ ہونے کی وجہ سے سپاہی استلذاذ بالمثل کی طرف

---

(1) ملاحظہ ہو ہرشفیلڈ کی کتاب (Die Homaaruolital) صفحہ ۷۳۹

راغب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اہل قرطاجنہ، نارمنوں، ڈورین
(Dorians) سیتھون (Scythians) تاتاریوں اور قلطیوں (
(Celts) میں اسکا بکثرت رواج تھا اور نیو کالیڈونیا کے فوجیوں میں تو اسکی
ضرورت سرکاری طور پر تسلیم کی جاتی تھی اور اسکے متعلق قواعد و ضوابط بھی وضع کیے گئے تھے۔

ڈاکٹر ہان (Hahn) لکھتے ہیں کہ اہل البانیہ میں اس کا شوق بکثرت
پایا جاتا ہے(۱)۔ اس ملک میں یہ شوق اگرچہ مسلمانوں میں زیادہ پایا جاتا تھا لیکن البانوی
عیسائی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے بلکہ عیسائیوں میں تو یہ حالت تھی کہ پادری
صاحب گرجا کے اندر اس رابطۂ غیر فطری کو برکت دیتے تھے(۲)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل البانیہ اور قوم ڈورین دونوں ایک ہی نسل سے
ہیں۔ یونان میں اگرچہ اس کا شوق پہلے سے موجود تھا لیکن جب ڈورین قوم نے یونان
فتح کیا تو انھوں نے اس فعل مکروہ کو اپنی معاشرت میں باقاعدہ طور پر داخل کر لیا۔ یہ قوم
یونان کی شمالی مغربی سمت یعنی البانیہ سے آئی تھی، اور یونان فتح کرتے ہی تمام گرد و
نواح کے جزائر اور سواحل ایشیائے کوچک پر پھیل گئی۔ ڈاکٹر بیتھے (Bethe)
نے ڈورین قوم پر ایک گرانقدر کتاب تصنیف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

(1) Albonische Studiew, 1854 P. 166

(2) Naetis Jahrbuch for Serucelle Zwis Chenstufen Vol. IX 1908 P. 327

"یہ قوم غیر فطری شادی کرنا جائز سمجھتی تھی اور اس قسم کی "شادیوں" کے سلسلہ میں "مذہبی رسوم" بھی باقاعدہ ادا کی جاتی تھیں اور مقتدایان دین "میاں بیوی" کی طرح ان کو برکت دیتے تھے۔"

جزیرۂ کریٹ میں تو یہ حالت تھی کہ اگر کسی امرد کی طرف اس طرح کا میلان کرنے والا نہ ہوتا تھا تو اس کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ ایشیا کے اقصائے مشرق میں اقوام (Kamschatdals) اور (Tchuktsches) وغیرہ میں مردوں کے درمیان باقاعدہ شادیاں ہوتی تھیں۔ اور کبھی کبھی اس قسم کا "ازدواج" باہمد گر عورتوں میں بھی ہوتا تھا۔ "یہ شادیاں" پورے تزک و احتشام اور مذہبی رسوم کیساتھ ہوتی تھیں اور قوم کا ہر شخص انکی باقاعدگی کو تسلیم کرتا تھا۔

ڈاکٹر نیک (Naecke) کا بیان ہے کہ قسطنطنیہ میں بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے۔ اس طرح کے لڑکے وہاں کے حماموں میں اکثر پائے جاتے ہیں جو رات بھر کھلے رہتے ہیں۔ لیکن اب جدید ترکیہ میں یہ رواج تقریباً مفقود ہو گیا ہے۔(۱)

چین میں ایسے لوگوں کے خاص مکانات ہوتے ہیں اور جب کوئی دولتمند اپنے احباب کو مدعو کرتا ہے تو وہ عورتوں اور لڑکوں دونوں کے وفا کف طلب

(1) Russian Anthropological journal (Quoted in "Sexual Problem") for January 1913. P. 41.

کرتا ہے، لڑکے خوب ناچتے ہیں اور اپنی بذلہ سنجیوں اور حاضر جوابیوں سے مہمانوں کا دل خوش کرتے ہیں اور عورتیں کھانے کے وقت فن موسیقی کے کمالات دکھا کر غذائے روحانی بہم پہنچاتی ہیں۔ ان لڑکوں کو اس فن میں خاص طور پہ تربیت دیجاتی ہے جلسہ کے بعد یہ لڑکے معقول رقم لے کر چلے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر موراشے (Morache) ان عصمت فروش چینی لڑکوں کی نسبت لکھتے ہیں کہ:۔

"ان لڑکوں کے والدین ان کو چار پانچ برس کی عمر میں فروخت کر دیتے ہیں اور پھر ان کو خوب تعلیم و تربیت دیجاتی ہے اور گانا بجانا، نقاشی، بذلہ سنجی شعر گوئی و شعر خوانی سکھائی جاتی ہے چینی قہوہ خانوں کے خدمتگار ان لڑکوں کے اڈوں سے خوب واقف ہیں اور جو شخص انھیں طلب کرتا ہے تو یہ خدمتگار لادیتے ہیں جس طرح کسبیوں کے ساتھ عموماً ایک نائکہ ہوتی ہے اسی طرح انکے ساتھ بھی انکا سرپرست ہمراہ آتا ہے۔ ان کے اوضاع و اطوار سب زنانے ہوتے ہیں۔ شوخ رنگ اور تکلف لباس پہنتے ہیں اور عطریات میں بسے رہتے ہیں جب کسی جلسہ میں جاتے ہیں تو پیدل کبھی نہیں جاتے۔"(1)

(1) Morache. Article "Chine" Dictionnaire Encyclopedique Des Sciences Medicals.

شمالی چین اور خصوصاً ترکستان میں ایک جماعت عصمت فروش لڑکوں کی ہوتی ہے جو تعلیم یافتہ اور ماہر موسیقی ہوتے ہیں۔ اس ملعون ادارہ کے قیام کا باعث یہ بتایا جاتا ہے کہ ان ممالک میں صنفِ نازک کی قلت ہے۔ علاوہ ازیں کثرت ازدواج کے باعث عام مردوں کو عورتیں نہیں ملتیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہاں کی عورتیں عموماً جاہل بدسلیقہ اور بدمزاج ہوتی ہیں۔ مگر یہ لڑکے نہایت شائستہ اور نستعلیق ہوتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان ممالک میں یہ ادارہ مکروہ ایران سے آیا تھا(۱)

افغانستان، بلوچستان، سندھ اور دیگر ہمسایہ ممالک میں یہ بلا ضرور ایران سے پہنچی تھی۔ کیونکہ ہندوؤں میں تو اس شوق کا مطلق پتہ نہ تھا لیکن برٹن (Burton) نے اپنے ترجمہ "الف لیلہ" کے اختتامی مضمون میں لکھا ہے کہ:۔

"جب ۱۸۴۵ء میں سر چارلس نیپر (Napier) نے ملک سندھ فتح کیا تو معلوم ہوا کہ چھوٹے سے شہر کراچی میں زنانہ قحبہ خانوں کے علاوہ تین اڈے ایسے تھے جنہیں ہیجڑے لڑکے عصمت فروشی کیا کرتے تھے۔"

افغانستان میں بھی اسکا شوق عام ہے۔ چنانچہ برٹن صاحب نے لکھا ہے کہ:۔

(1) Herman, "Die Paderastis Bia Deu Sartan Sexual Problum June, 1914. (2) Langdwae-ffs Vayages and Travels 1814, Part II P. 47.

"ہر قافلہ جو افغانستان سے آتا ہے اس میں چند لڑکے ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کی آنکھوں میں سُرمہ، رخساروں پر غازہ ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی اور سر میں خوشبودار تیل اور زلفیں کھلی ہوتی ہیں، ان کا لباس زنانہ ہوتا ہے اور وہ آرام کے ساتھ اونٹوں کے شغدفوں میں بیٹھکر آتے ہیں۔"

لینگسڈارف (Langsdorff) نے شمالی امریکہ کے ملک الاسکا (Alaska) کا حال لکھا ہے اور اپنے سفرنامہ[1] میں تحریر کیا ہے کہ :-

"علاقہ اونالاشکا کی ایک قوم الیوٹ (Alaut) میں عجیب دستور ہے یعنی اگر ان میں کوئی خوبصورت لڑکا ہوتا ہے تو اکثر اسکی تربیت لڑکیوں کی طرح کرتے ہیں اور یہ اپنے ہاتھ اور پاؤں میں زیور پہنتے ہیں، سبزہ آغاز ہوتے ہی تمام بال مونچھ سے نوچ کر صاف کر دیتے ہیں اور انکی تھوڑی پر گودنا گودا جاتا ہے انکے بال عورتوں کی طرح سنوار کر جوڑے اور چوٹیاں باندھی جاتی ہیں۔ یہاں کی اصطلاح میں ان کا نام شیخوپان (Schoopans) ہے اور انکی وضع قطع دیکھ کر کوئی اجنبی شخص یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ یہ عورتیں ہیں یا لڑکے؟"

ڈاکٹر لسیانسکی[2] (Lisiansky) تحریر کرتے ہیں کہ "جن مکانوں میں

---

1. Langdwarffs Vayages and Travels 1814, Part II P. 47.
2. Lisiansky, Voyage, Eles London 1814, P. 189

کوئی سیجوپان رہتا ہے اس کو بہت مبارک خیال کیا جاتا ہے۔" سیاح موصوف نے اس ملک میں ایک سیجوپان کے دو خاوند دیکھے تھے، اسی طرح ڈاکٹر ہومبرگ[۵۱] (Holmberg) نے لکھا ہے کہ ان سے ڈیوڈ اف (Dauydoff) سیاح نے بیان کیا کہ "سیجوپان بنائے نہیں جاتے بلکہ ہمیشہ ایسے لڑکوں کو اس کام کیلیے چنا جاتا ہے جو ماں کے پیٹ سے نسائیت لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر انگلمان کا بیان ہے کہ انھوں نے ملک الاسکا کی اسکیمو (Ekimo) قوم میں جو پاس بیرو (Poiul Barrow) کے آس پاس آباد ہے، چھوٹی چھوٹی بستیوں کے اندر بھی پانچ پانچ چھ چھ سیجوپان دیکھے ہیں۔

ممالک لوئسیا، فلوریڈا، یوقاتان (Yocatan) وغیرہ میں بھی اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ برازیل میں جن لڑکوں کو اس کے لیے تیار کیا جاتا ہے انھیں قودینا (Cudinas) یعنی "خصی" کہتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے تمام شمالی مغربی علاقوں میں اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ مونتانا (Montana) قوم میں انھیں بوٹے (Bote) کہتے ہیں۔ یعنی "نہ مرد نہ عورت" علاقہ واشنگٹن کی امریکائی اقوام میں ان کا نام برداش (Burdash) ہے یعنی "نیم مرد و نیم عورت"۔[۵۲]

---

[۵۱] Ethnographische Mizzen, 1855, P. 121

[۵۲] Newyark Medical Journal, Dicr 17, 1871

جزیرہ تاہیٹی (Taheti) کے دیسی باشندوں میں بھی ایسا ہی ایک طبقہ پایا جاتا ہے جو کھلم کھلا یہ مکروہ پیشہ کرتا ہے۔ یہاں کی اصطلاح میں ان لوگوں کو ماہو (Mahoo) کہتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً عورتوں ہی کے ساتھ رہتے اور سینے پرونے، کپڑا اور چٹائیاں بننے کا کام کرتے ہیں مگر اس ملک میں یہ مکروہ فعل صرف قبائلی سرداروں تک محدود ہے۔[۱]

جزیرہ مڈگاسکر کی سقلاوی قوم (Sakalanes) میں بھی ایک خاص طبقہ پایا جاتا ہے جنہیں سقاترہ (Sakatra) کہتے ہیں۔ ان کے اطوار عورتوں جیسے ہوتے ہیں اور بلحاظ صورت و شکل زنجباری "زنانوں" سے ملتے جلتے ہیں یہ لوگ پیدائشی مخنث ہوتے ہیں، اسلئے زیادہ ذلیل نہیں سمجھے جاتے لیکن جو لڑکے طبعی حالت میں پیدا ہوکر یہ پیشہ اختیار کرتے ہیں انکو ذلیل سمجھا جاتا ہے۔[۲]

افریقہ کے ممالک یوگنڈا اور انیامویزی میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں اور بالائی کانگو میں بھی یہ فعل عام ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ وہ لوگ اپنے گھروں سے دور ہوں۔[۳]

[۱] Turn Bill, "Aueyage Round The World in The Year, 1800" Etc [۲] Annales D, Hygiened De medicine Colonial, 1899, P. 494, [۳] Oskar Baumann, Ucentrere Sexual Eras Chei-nungen Nie Die Neger Beuolkeaung Zanzibars.

جزیرہ نیوگنی کی پاپوا قوم میں بھی یہ شوق عام طور پر پایا جاتا ہے اور خلاف قانون نہیں سمجھا جاتا۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ان لوگوں میں نکاح دیر سے ہوتا ہے اور تمام لڑکے اور ناکتخدا مرد ایک ساتھ پنچایت خانوں میں رہتے ہیں[1]۔

اسی طرح مغربی آسٹریلیا کے علاقہ کمبرے میں جو قدیم اقوام میں بستی ہیں ان میں یہ دستور ہے کہ اگر کسی شخص کو بیوی میسر نہیں آتی تو وہ استلذاذ بالمثل کے آزاد ہوتا ہے۔

اسپنسر اور گلن کا بیان ہے کہ آسٹریلیا کے شمال مغربی سواحل پر جو قومیں آباد ہیں ان میں بھی اس کا رواج ہے، یہ لوگ تو اس قدر وحشی ہیں کہ مبرزہ انثیین کے درمیانی حصہ میں شگاف دیدیتے ہیں۔ ڈاکٹر کلاش (Klaatsch) کو بمقام نیول نیول (Nial Niol) وہاں کے پادریوں نے یہ حال بتایا تھا علاوہ ازیں ۱۹۰۶ء میں روتھ (Roth) نے بھی بمقام بولیا (Boulia) بتایا تھا کہ یہاں لڑکوں پر اسی قسم کا عمل جراحی کیا جاتا ہے۔

انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے مزدوری پیشہ اور کاریگر طبقوں میں اسکا رواج بہت پایا جاتا ہے۔ بہت سے لڑکے دن کو محنت مزدوری سے اور رات کو اس مشغلہ سے روپیہ کماتے ہیں۔ انگلستان کی طرح فرانس اور جرمنی کی فوجوں میں بھی اس کا رواج عام ہے۔ فرانسیسی سپاہیوں میں یہ علت الجزائر

[1] Maskowski, Zeitschrift für Ethenologie, 1911 (2) Heft 2. P. 339

(Algeria) جاکر پیدا ہوئی اور اب کوئی رجمنٹ فرانسیسی فوج کی ایسی باقی نہیں رہی جس میں یہ علت مکروہ نہ پھیل گئی ہو۔ فرانسیسی لجنۃ الاجنبیہ (Forei-gn Legion) کی نسبت جب تحقیقات کی گئی تو ایک سپاہی نے جو جرمن تھا بیان کیا کہ فوج میں فرانسیسی، ہسپانوی اور اطالوی نسلوں کے سپاہی تو عموماً "عاشق" ہوتے ہیں اور سوئس و جرمن سپاہی عموماً "معشوق" کا کام دیتے ہیں۔[1]

روس کا طبقہ عوام اس حرکت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ بقول ٹارنوسکی (Tarnowsky) عوام کا قول یہ ہے کہ یہ شوق امیروں کا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے کسانوں میں بھی شادی سے قبل جوانوں میں یہ شوق دیکھا گیا ہے۔

رومۃ الکبریٰ کے عہد ملوکیت میں بھی اس کا ذوق عام تھا اور روم کے اکثر شہنشاہ اس مرض میں مبتلا تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جولیس قیصر، آغسطس، تائبریس، کالیگا، کلاڈیوس، نیرو، گالبا، طیطس، ڈومیشین، نروا، تراجن، ہیڈرین، قومو ڈوس اور ہیلیوگابالوس شہنشاہان روم اور بہت سے دیگر امراء کا نام لیا جاتا ہے۔ جولیس کو تو لوگ طنزاً یہ کہا کرتے تھے کہ "یہ سب عورتوں کا

---

[1] Memnon, P. 27 See Also General Broo-ssiers Report Quoted By Burton in His Aracian Nights Vol X P. 251. (2) Shena-larl, Inversion Sexualle, P.D, 85-106

شوہر اور سب مردوں کی جورو ہے"۔ اس شہنشاہ کو اپنے حسن جمال پر بےحد ناز تھا۔
ہیڈرین کو اپنے غلام انطینوس (Antinous) سے اسقدر عشق تھا کہ یہ دونوں یورپ میں محمود و ایاز کی طرح مشہور ہیں۔[۱] اور ہیلوگابالوس تو عورتوں کا سا لباس پہنتا تھا اور جن مردوں سے اسے محبت ہوتی تھی انکی خدمت بیویوں کی طرح کیا کرتا تھا۔
قیدخانوں اور جیلوں میں بھی عام طور پر یہ مرض پایا جاتا ہے۔ تادیب خانہ المیرا (Elmira Reformatory) واقع نیویارک میں ڈاکٹر وے (Way) عرصہ دراز تک نگراں رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا ہے کہ :-

"قیدخانوں میں سب سے زیادہ تکلیف دہ مسئلہ اس شوق کے انسداد کا ہے جہاں تک میں خیال کر سکتا ہوں اسّی فی صدی آدمی اس علت مکروہ میں مبتلا ہیں۔ بہت سے قیدی ایسے ہیں جو خوبصورت اور نازک بدن ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس وضع کا قیدخانہ میں آجاتا ہے تو گویا قیامت آجاتی

---

[۱] J. A. Symonds Wrote an Interesting Essay On This Subject, See Also Kiefer, Jahrbuch, F. Sex. Zwischenstufen Vol. VIII 1906 [۲] L. Von Sheffler "Elaga Bad" Jahr Buch, F. Sex Swischenstufen Vol, III (1901)

ہے۔ نیویارک کے قیدخانہ سنگ سنگ میں بیس۲۰ فی صدی قیدی "عامل" اور اسی۸۰ فی صدی "معمول" ہیں۔

قیدخانوں کے علاوہ امریکہ اور یورپ کے آوارہ گرد فقیروں میں بھی یہ علت مکروہ بدرجہ غائت رائج ہے۔ ایک شخص مسمی جوشیا فلنٹ (Josiah Flint) آوارہ گرد فقیروں کے طبقہ میں بیس۲۰ پچیس۲۵ برس تک شامل رہا تھا۔ اس نے اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر ان لوگوں کے حالات میں لکھا ہے۔

"امریکہ میں دو قسم کے آوارہ گرد ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بوجہ بیکاری دریوزہ گری پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو پیشہ ور فقیر ہیں، مؤخرالذکر لوگوں کو وہاں کی اصطلاح میں "ہوبو" (Hoboes) کہتے ہیں اور ان میں ہر طبقہ کے مبتذل آدمی شریک ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اس مکروہ حرکت سے واقف نہ ہو۔ یہ لوگ اپنے شوق کے لیے لڑکوں کو مختلف طریقوں سے قبضہ میں لاتے ہیں۔ عام طریقہ یہ ہے کہ وہ اثنائے سفر میں جب کسی شہر یا قصبہ میں پہنچتے ہیں تو وہاں غریب طبقہ کے لڑکوں سے میل جول پیدا کر لیتے ہیں اور بالآخر جب کوئی لڑکا خوبصورت مل جاتا ہے تو اسے ساتھ لیکر غائب ہو جاتے ہیں۔ چند روز بعد اس غریب لڑکے کو اپنے مصرف کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ ان آوارہ گردوں کی اصطلاح میں لڑکے کو "پرویشن" (Prushun) اور اس کے محافظ کو "جاکر"

(Jockey ، چابک سوار) کہتے ہیں۔ لڑکے کی عمر عموماً دس اور پندرہ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ اس کو بھی ہر بستی میں بھیک مانگنا پڑتی ہے اور اگر وہ کسی قسم کی سستی دکھاتا ہو تو سخت سزا دی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں آٹھ دس آوارہ گردوں کی جماعت میں ریل کا سفر کر رہا تھا کہ گاڑی ایک اسٹیشن پہ ٹھہری وہاں ایک حبشی لڑکا ٹرین کے اسی ڈبہ میں داخل ہوا جس میں ہماری جماعت تھی جب اسٹیشن سے گاڑی چھوٹ گئی تو فوراً ان لوگوں نے اس حبشی بچہ کو دبوچ لیا۔ امریکہ میں اس قسم کے آوارہ گرد ساٹھ ہزار کے قریب ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ ساحل اسکاٹ لینڈ کے ایک چھوٹے سے بندر میں ایک میلہ کے موقع پر ہم دس بارہ آدمی مصروف جرعہ کشی تھے رات کا وقت تھا اسی اثناء میں ایک بوڑھا اندھا سارنگی نواز بوزہ خانہ میں پہنچا اس کے ساتھ سولہ سترہ برس کا ایک نہایت خوبصورت لڑکا تھا، جو اسکاٹ لینڈ کی وضع کا تہمد باندھے ہوئے تھا، اس کے سنہرے لمبے بال شانوں پہ پڑے ہوئے نہایت خوبصورت معلوم ہوتے تھے، سر پہ عورتوں کی وضع کی پرانی ٹوپی تھی۔ اور جسم پہ سیاہ مخمل کا زنانہ کوٹ تھا یہ لڑکا صورت شکل میں اس قدر جاذب نظر تھا کہ ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہو گیا، اسی اثناء میں ایک شرابی نے فقرہ کسا کہ یہ لڑکی معلوم ہوتا ہے لڑکے نے

یہ سنتے ہی کہا کہ میں لڑکی نہیں لڑکا ہوں اور یہ کہتے ہی وہ بالکل عریاں ہو گیا۔ اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ لوگوں نے اسے خوب شراب پلائی اسکے بعد وہ اندھا اپنا بیلا بجانے لگا اور لڑکے نے [illegible] ننگا ناچنا شروع کیا۔ اس وقت مجمع کے ہیجان کی حد نہ رہی اور آخر کار بےغیرتی اور بےحیائی کا یہ منظر ختم نہ ہوا تھا کہ مالک دوکان اٹھ کر آیا اور اس نے لیمپ گل کر دیا۔"

استلذاذ بالمثل کے مختلف نظریے

کیمپف (Kempf) کا خیال ہے کہ بعض مردوں میں عورت کی طرف سے ایک قسم کی نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور اس نفرت کا سبب درحقیقت عورت کا رعب یا خوف ہوتا ہے اور مرد یہ باور کر لیتا ہے کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ استلذاذ بالمثل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس کے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ مردوں یا عورتوں کو کچھ عرصہ تک ایسے مقامات میں اس طرح رہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ جنس مخالف سے کوئی واسطہ نہیں رہتا تو ان میں یہ مذموم عادت پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ فوجوں کے سپاہی اور جہازوں کے ملاح جنہیں عرصہ دراز تک عورتوں سے جدا رہنا پڑتا ہے وہ استلذاذ بالمثل کے عادی ہو جاتے ہیں۔ زمانہ حال کے بہت سے ماہرین جنسیات اس امر پر غور کرتے ہیں کہ اس عادت کے اسباب کیا ہیں۔ چنانچہ چند سال کے اندر اسکے متعلق کثیر مواد جمع ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر کرافٹ ایبنگ (Krafft Ebbing) ایسا شخص ہے جس کے اقوال کی بکثرت سند دی جاتی تھی اور اس کی تصنیفات کا اب بھی عوام پر بہت اثر ہے اس شخص کا قول یہ ہے کہ اس فعل کی عادت آبائی ہے یعنی بچہ کو والدین سے وراثتاً ملتی ہے لیکن مابعد کے محققین جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اس سے ڈاکٹر صاحب کے قول کی تائید نہیں ہوتی۔

کرافٹ ایبنگ کا قول یہ بھی ہے کہ بچپن میں جن بچوں کو استلذاذ بالنفس یعنی استمنار وغیرہ کی عادت ہو جاتی ہے وہی بڑے ہو کر استلذاذ بالمثل میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن یہ نظریہ درست نہیں کیونکہ بہت سے لوگ ایسے مل جائیں گے جنھوں نے طفولیت کی غلط کاری کو جوان ہو کر بالکل چھوڑ دیا، اور پھر کوئی غیر فطری طریقہ حظِ نفس کا اختیار نہیں کیا۔

کرافٹ ایبنگ کا بیان ہے کہ:۔

"استلذاذ بالنفس سے زیادہ مذموم کوئی عادت نہیں جو حسن و جمال کی تمام دلکشی و دلفریبی کو زائل کر کے انسان کے اخلاق و مزاج پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔"

لیکن ڈاکٹر اسٹیکل (Stackle) نے اس خیال کی تردید کی ہے وہ اپنی کتاب "اختلاط ذوالجنسین" میں تحریر کرتے ہیں:۔

"(کرافٹ ایبنگ کی) یہ دلیل قطعی غلط ہے جس قدر اصحاب فکر و ذہن میں نے استلذاذ بالنفس کے شائقین میں دیکھے ہیں اتنے کسی دوسرے

طبقہ میں نہیں دیکھے - میں نے نوجوان مصوروں، شعرا اور خصوصاً
ماہرین موسیقی میں شدید رجحانات اس کے دیکھے ہیں اور یہ واقعہ
اس نظریہ کے عین مطابق ہے کہ تمام مصور زود جنبشیں ہوتے ہیں
اس وضع کے نوجوان اکثر ایسے نازک طبع اور حساس ہوتے ہیں
کہ وہ استلذاذ بالضد میں ایک قسم کی "بہیمانہ بیرحمی" محسوس کرتے ہیں
اور وہ اپنی خواہشات نفسانی کو دنیا بھر سے چھپاتے ہیں - ان شائقین
استلذاذ بالنفس میں بڑے بڑے علمبرداران حق وصداقت بڑے بڑے
معلمین اخلاق اور بڑے بڑے ارباب فکر اور مصلحین شامل ہیں۔"

کرافٹ ایبنگ، ہرشفیلڈ اور بلاخ وغیرہ مشہور محققین اور مصنفین نے
استلذاذ بالمثل کے متعلق نظریے تو بہت قائم کیے لیکن افسوس ہے انھوں نے
ان نفسیاتی عناصر کو نظر انداز کر دیا جو اس فعل سے متعلق ہیں - ہر نوخیز بچہ غیر
شعوری طور پر اپنے اوضاع و اطوار کسی دوسرے شخص کے نمونہ پر تعمیر کرتا ہے -
مثلاً جب کسی لڑکے کی پرورش اور تربیت اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوضاع
و اطوار کا نمونہ اور اپنی سیرت کا سانچہ اپنی ماں کو بنائے تو اس میں خود بخود
نسائیت پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ خود بخود بلا ارادہ نسوانی طور و طریق کی تقلید
کرنے لگتا ہے اور سرگرمی عمل کے تقریباً ہر میدان میں خواہ وہ شہوانی ہو یا کاروباری
اس کا تمام رنگ ڈھنگ نسوانی ہو جاتا ہے اور چونکہ وہ اس طرح نفسیاتی لحاظ

رفتہ رفتہ "عورت" بن جاتا ہے اور فطری یا طبعی طور پر عورتوں کو اپنی جنس کی طرف شہوانی رغبت نہیں ہوتی بلکہ مردوں کی طرف ہوتی ہے اس لیے وہ لڑکا بھی مردوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اگر ماں یا کسی دیگر سرپرست کے رجحانات طبع استلذاذ بالمثل کی طرف ہوتے ہیں تو وہ لڑکا بھی ویسا ہی کرنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر اسٹیکل کا بھی یہی نظریہ ہے وہ کہتے ہیں کہ :-

"جب کوئی لڑکا نسوانی رنگ ڈھنگ اختیار کر لے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ بات اس کے اندر فطری طور پر ہے بلکہ یہ خیال کرنا چاہیے کہ وہ اپنی سیرت، اپنی ماں یا بہن یا کسی دوسری عزیز قریب عورت کے نمونہ پر تعمیر کر رہا ہے۔"

ڈاکٹر سیڈگر (Sedger) نے مندرجہ ذیل اسباب بتائے ہیں :-

(۱) استلذاذ بالمثل کا شوق حُبِ نفسی (Self, Erotism) سے پیدا ہوتا ہے۔

(۲) ایسے شخص کے نصب العین میں نہ صرف سابق عورتوں اور مردوں کے اعمال و افعال شہوانی موجود ہوتے ہیں بلکہ وہ اس میں اپنی ذات کی طرف سے بھی کوئی پہلو شامل کر لیتا ہے۔

(۳) جب لڑکے کی پرورش اور تربیت خالص نسوانی ماحول میں ہوتی ہے تو اس میں نسائیت پیدا ہو کر انفعالی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے

اور عموماً دیکھا گیا ہے کہ اکلوتا بیٹا اکثر استلذاذ بالمثل کا شائق ہو کر بعد میں معمول بن جاتا ہے۔

(۴) ناقص تربیت سے بھی اس طرف میلان پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اکثر دیکھا گیا ہے کہ مائیں اپنے لڑکوں کو لڑکیوں میں کھیلنے نہیں دیتیں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ لڑکوں میں کھیلتا ہے اور وہ لڑکیوں کی بجائے اسے لڑکوں سے رغبت ہو جاتی ہے اور یہی استلذاذ بالمثل کی ابتدا ہے۔

الفریڈ ایڈلر (Alfred Adler) کا نظریہ بھی اسی اصول کے مطابق ہے۔ اس نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ جب اٹھان کے وقت لڑکوں کے سامنے کوئی نسوانی نمونہ ہوتا ہے تو ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ "وہ کامل عورت" بن جائیں اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اپنی شخصیت کی طاقت کو بڑھائیں اور چونکہ "وہ پوری عورت" نہیں ہو سکتے اس لیے وہ اپنی ذلت کے خوف سے عورتوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ ایسے اشخاص عورت سے ڈر لگتا ہے اور خوف، نفرت، شرم اور حقارت وہ جذبات ہیں جن کے باعث ایسا شخص دوسری جنس سے الگ رہتا ہے۔

ہنوور (جرمنی) میں ایک فاضل قانون داں گزرا ہے جن کا نام کارل ہنریچ اولرچ تھا۔ ان حضرت نے کئی برس تک استلذاذ بالمثل کی حمایت و تلقین کی، وہ خود بھی اس علت میں مبتلا تھے اور انھوں نے اس امر

کی بیحد کوشش کی کہ جرمنی کے اندر اسکی قانونی اجازت حاصل ہو جائے۔

محققین کے نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے ڈاکٹر اسٹیکل کا یہ نظریہ زیادہ صحیح اور معقول معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں تمام آدمیوں کے اندر ذو جنسیت (Bi-Sexuality) موجود ہوتی ہے اور یہ کیفیت سن بلوغ تک باقی رہتی ہے۔ اس کے بعد بعض آدمی اپنے شوق استلذاذ بالمثل کو دبا لیتے ہیں اور طبعی طور پر جنس مخالف کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ بعض آدمیوں کی طبیعت پر دوسرا شوق غالب رہتا ہے اور وہ صرف استلذاذ بالمثل سے رغبت رکھتے ہیں اور بعض میں دونوں شوق موجود رہتے ہیں۔

انسان درحقیقت حیوان مطلق کی ہی ترقی یافتہ صورت ہے پہلے حشرات پیدا ہوئے، یہ ترقی پاکر مینڈک، مگرمچھ، کچھوا وغیرہ بنے اور انھیں آبی جانوروں میں سے قانون ارتقاء نے پرندے بنا دیے (چنانچہ اب تک اڑنے والی اور درختوں پر چڑھنے والی مچھلیاں پائی جاتی ہیں) پرندوں سے ترقی پاکر چرپائے پیدا ہوئے۔ چنانچہ آسٹریلیا میں ابھی تک ایک چرپایہ جانور ایسا پایا جاتا ہے جو دریا میں رہتا ہے۔ اس کا نام انگریزی زبان میں ڈک بل "(Duck Bill) ہے یہ انڈے دے کر بچے نکالتا ہے لیکن انھیں دودھ پلا کر پالتا ہے۔ الغرض انسان جانوروں کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ یہی باعث ہے کہ بہت سی باتیں جو جانوروں میں پائی جاتی ہیں وہ حضرت انسان

میں بھی موجود ہیں۔ یا یہ سمجھ لیجیے کہ انسان نے بہت سی باتیں حیوانات سے سیکھی ہیں پھر چونکہ بعض حیوانات میں استلذاذ بالمثل کا شوق دیکھا جاتا ہے، اسلیے بہت ممکن ہے کہ انسان نے بھی یہ فعل مکروہ جانوروں ہی سے سیکھا ہو یا ورثہ میں ان سے ملا ہو۔

مشہور و معروف جرمن ماہر علم الحیوانات پروفیسر کارش (Carsh) کا قول ہے کہ پلے ہوئے یا مقید جانوروں میں استلذاذ بالمثل کا شوق پیدا ہو جاتا ہے جس کا باعث یہ ہے کہ جنس ثانی موجود نہیں ہوتی۔ قدیم زمانہ کے لوگوں کو اس بات کا علم تھا۔ چنانچہ قدیم مصریوں میں دو نر تیتروں کو استلذاذ بالمثل کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ارسطو نے بھی لکھا ہے کہ:۔

"اگر نر موجود نہیں ہوتا تو مستی میں آکر دو کبوتریاں ایک دوسرے پر بیٹھنے لگتی ہیں۔"

فرانس کے مشہور ماہر علم حیوانات کاونٹ ڈی بوفن (Buffoon) نے اپنی کتاب میں جانوروں خصوصاً پرندوں کی بہت سی مثالیں استلذاذ بالمثل کی لکھی ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ اگر بہت سی قسم کے صرف نر یا صرف مادہ پرند مثلاً تیتر، بٹیر، مرغے، مرغیاں، فاختہ وغیرہ ایک جگہ بند کر دیے جائیں تو ان میں بہت جلد استلذاذ بالمثل کا شوق شروع ہو جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ بمقابلہ مادہ کے نر میں یہ کیفیت جلد پیدا ہوتی ہے اور فرانسیسی محقق سینٹ کلیر ڈی ویلی (St. Clais De Velli) نے لکھا ہے کہ:۔

"اگر مینڈھوں، بکروں، کتوں، سانڈ بیلوں وغیرہ کو الگ بند کر دیا جائے تو ان میں بھی یہی شوق پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی مادہ ان کو مل جاتی ہے تو وہ پھر طبعی حالت پر آجاتے ہیں۔"

بوم بارڈا (Bom Baarda) ساکن شہر لزبن کا قول ہے کہ:-

"ملک پرتگال میں ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ سانڈ بیلوں کے غول میں ہمیشہ ایک بیل ایسا رہتا ہے جو اپنے ساتھی بیلوں کے اس شوق کی تسکین کرتا رہتا ہے اور گائے بکری میں تو یہ حرکت اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔"

استیناخ (Steinach) کا مشاہدہ یہ ہے کہ سفید چوہوں میں یہ عادت ہے کہ جب ان کے تجربے سے مادہ دور کر دی جاتی ہے تو وہ آپس میں یہ حرکت کرنے لگتے ہیں، مول (Moll) نے بندروں اور گدھوں کو بھی یہ حرکت کرتے دیکھا ہے۔

استلذاذ بالمثل اور بعض مشہور افراد تاریخی

ایسے مشہور و معروف تاریخی آدمیوں کے سلسلہ میں

ڈاکٹر رافالوچ (Raffalovitsche) نے اپنی کتاب یورانسم (Uranisme) میں اسکندر اعظم (۱)، ایپامنانداس (۲) (Epaminondas) ورجیل (۳) سکانڈسے اعظم (۴) اور شہزادہ یوجین (۵) کو بھی شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر ہرشفیلڈ

(Ker Shhefeld) نے اپنی مبسوط کتاب الموسوم بہ
مطبوعہ سنہ ۱۹۱۳ء میں صفحہ ۶۵۰ لغایتہ ۶۷۴ قدیم و جدید مشہور آدمیوں کی دو فہرستیں

(فٹ نوٹ صفحہ ۲۲۴) (۱) اسکندر اعظم (۳۵۶ لغایتہ ۳۲۳ ق م) فیلقوس (Philip) شاہ مقدونیہ کا بیٹا تھا سنہ ۳۳۶ ق م میں اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اس بادشاہ میں اوائل ہی سے روح عسکریت نمایاں تھی۔ اس نے تمام یونان، ایشیائے کوچک شام فینیقیہ، فلسطین، مصر کو فتح کیا۔ بعد ازاں ایران پر حملہ کرکے دارا شہنشاہ ایران کو قتل کیا اور تمام ملک فتح کر لیا اسکی فتوحات ممالک باختر و ہندوستان تک پہنچی تھیں۔ ہندوستان سے وہ براہ سمندر واپس ہوا اور شہر بابل میں گیارہ روز بیمار رہ کر فوت ہوا۔

(۲) اپیا منڈاس۔ یونان کا زبردست شاعر تھا، طبقہ مقتدایان دین سے تعلق رکھتا تھا۔ بلکہ اپنی عقل و دانش کے باعث بعض اوقات وہ یونان کے "سات رشیوں" میں بھی شمار ہوتا تھا۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں جزیرہ کریٹا میں پیدا ہوا، ایک روایت کے مطابق وہ ستاون برس تک سوتا رہا اور اسی خواب شیریں میں اسے دیوتاؤں کی طرف سے الہام ہوا جس کے مطابق اس نے اپنی آئندہ زندگی بسر کی۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص ۲۹۹ برس کی عمر تک جیا۔

(۳) ورجل (Virgil) ۷۰ لغایتہ ۱۹ ق م۔ روم کا مشہور آفاق شاعر تھا شہر مانتوا میں پیدا ہوا۔ اول اول زراعت پیشگی کرتا تھا بعد میں دربار تک رسائی ہو گئی تو امیر کبیر ہو گیا منجملہ دیگر تصانیف کے اسکی نظم (اینیڈ) Aenied بہت مشہور ہے جس کے بارہ حصے ہیں۔

(۴) کانڈے اعظم (Great Gande) سنہ ۱۶۲۱ء لغایتہ سنہ ۱۶۸۶ء ایک مشہور

درج کی ہیں جن میں تین سو آدمیوں کے نام ہیں۔ خاص خاص نام ملاحظہ ہوں
جولیس قیصر(۱)، اگسٹس(۲)، تائبریس(۳)، کالیگا(۴)، کلاڈیس(۵)، نیرو(۶)، ٹیٹوس(۷)

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲۵) کا بہت بڑا جرنل تھا لیکن بعد ازاں دربار ہسپانیہ میں ملازم ہو گیا۔ سنہ ۱۶۵۹ء میں دربار فرانس سے اسکی صلح ہو گئی اور وہ صوبہ برگنڈی کا گورنر بنا دیا گیا۔

(۵) پرنس یوجین سنہ ۱۶۶۳ء لغایۃ سنہ ۱۷۳۶ء۔ آسٹریلیا کا بہت بڑا مدبر جرنل تھا جنگ ہسپانیہ میں اس نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔

---

(۱) (Julius Caesar) سنہ ۱۰۰ء لغایۃ سنہ ۴۴ ق م، اوّل اوّل بحیثیت ایک فاتح رومی جرنل کے شہرت حاصل کی بعد ازاں اپنی سحر بیانی اور خطابات کے ذریعہ سے رومیوں پر اپنا زبردست اثر قائم کیا، اپنی طاقت فوجی اور اثر کی بدولت شہنشاہ روم بن گیا لیکن امرا کا طبقہ اس سے برافروختہ ہو گیا، ایک جماعت نے سازش کرکے تاجپوشی سے ایک ماہ بعد برسرِ عام قتل کر ڈالا۔

(۲) (Caius Octavius Augustus) سنہ ۶۳ لغایۃ سنہ ۱۴ ق م۔ روم کا پہلا شہنشاہ ہوا، ۴۵ برس تک سلطنت کی۔ اس کا عہد امن صلح اور فارغ البالی کیلئے مشہور ہے۔

(۳) (Tiberius) روم کا دوسرا شہنشاہ تھا۔ سنہ ۴۲ ق م میں پیدا ہوا اور سنہ ۳۷ میں فوت ہوا، غیر محدود قابلیتوں کا آدمی تھا لیکن خانگی امور میں سخت بدنام تھا۔

(۴) (Caligula) روم کا تیسرا شہنشاہ تھا۔ ابتدا میں اچھی سلطنت کی لیکن بعد میں اسکی شہوت رانیوں اور بدمستیوں سے لوگوں نے عاجز آکر سنہ ۴۱ء میں قتل کر دیا۔

(۵) (Claudius) کالیگا کے بعد شہنشاہ روم ہوا لیکن اپنی عیش پرستیوں کے باعث

ڈومیشین (۱)، نروا (۲)، تراجن (۳)، ہیڈرین (۴)، فریڈریک (۵) اعظم۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۶) وہ اپنے مصاحبوں کے پھندے میں ایسا پھنسا کہ اسکی بیوی اگرپینا (Agrippina) نے زہر دے کر قتل کر دیا۔

(۶) (Nero) سنہ ۳۷ لغایۃ سنہ ۶۸ روم کا سخت بدنام شہنشاہ تھا، بیحد عیش پرست اور بیحد سفاک شخص تھا، بالآخر قتل کیا گیا۔

(۷) (Titus) سنہ ۴۰ لغایۃ سنہ ۸۱ء روم کا شہنشاہ تھا، اسی شخص نے سب سے پہلے یروشلم فتح کیا جسکی یادگار میں اب تک "محراب ٹیٹوس" مشہور ہے۔ بیحد فحاش اور ظالم شخص تھا۔

(۱) (Domitian) شہنشاہ روم۔ سفاکی اور بدکاری میں رسوائے عام تھا، سنہ ۹۶ء میں قتل کر دیا گیا۔

(۲) (Nerva) سنہ ۹۶ء سے سنہ ۹۸ء تک شہنشاہ روم رہا۔

(۳) (Trajan) اپنے باپ کی جگہ سنہ ۹۸ء میں روم کا شہنشاہ ہوا اور سنہ ۱۱۷ء تک سلطنت کی۔

(۴) (Hadrian) اپنے چچا تراجن کے بعد شہنشاہ روم ہوا اور سنہ ۱۳۸ء تک سلطنت کی، شہنشاہان روم میں سب سے بڑا شمار کیا جاتا ہے۔

(۵) (Frederick ii) سنہ ۱۷۱۲ء لغایۃ سنہ ۱۷۸۶ء جرمنی کی ریاست پروشیا کا بادشاہ تھا، سنہ ۱۷۴۰ء میں تخت نشین ہوا، اپنی قابلیت اور فوجی فتوحات سے اپنی ریاست کی شان کو چار چاند لگا دیے حتیٰ کہ وہ یورپ کی بہت بڑی طاقت بن گئی، یہ بادشاہ عالم فاضل و علم دوست تھا، اس کی تصنیف کردہ کتب کی تعداد تیس ۳۰ سے زیادہ ہے۔

شعرائے انگلستان میں مارلو، شیکسپیر، سوفٹ، جان فلیچر، شیلے
بائرن اور ٹینی سن کی نسبت بھی لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انھیں اس کا شوق تھا۔
مؤخرالذکر کے محبوب کا نام آرتھر ہیلم (Arthur Hallam) تھا،
ایڈورڈ کارپنٹر (Edward Carpenter) کا قول ہے کہ اس شوق کے
مرد ملک کو جنگ و جدال سے نفرت ہوتی ہے اور اس کی شائق عورتیں خانہ داری سے
گھبراتی ہیں اس لیے ان کے قوائے ذہنی کا رجحان دیگر تر امن مشاغل خصوصًا
علم و فضل کی طرف ہو جاتا ہے اور یہی باعث ہے کہ ان لوگوں میں اکثر صاحب
کمال، موجد و مخترع، شاعر، کاریگر، جوتشی، رمال، کاہن، ساحر، ڈاکٹر اور مقتدایانِ
دین پیدا ہوئے ہیں یورپ کے عہد نہضت پر غور کر کے دیکھا جاتا ہے تو اس زمانہ
میں اس قسم کے بہت سے لوگ ملتے ہیں جو صاحب کمال تھے۔ مثلاً:-

میورے (Muret) عہد نہضت میں علم مجلسی، اخلاق و ادب کا
زبردست ماہر تھا۔ اپنے زمانہ میں بوجہ علم و فضل اور فصاحت و بلاغت بہت
شہرت حاصل کی تھی لیکن یہی شخص ۱۵۵۳ء میں استلذاذ بالمثل کے الزام میں
قید ہوا، بلکہ جان کے لالے پڑ گئے کسی نہ کسی طرح اس کی رہائی ہوئی اور وہ شہر
طولوز (Toulouse) میں رہنے لگا لیکن دو سال بعد پھر وہ اس جرم میں
متہم ہو کر فرانس سے فرار ہوا اور شہر پیڈوہ میں رہنے لگا لیکن چار برس بعد یہاں
پھر وہ اسی جرم میں ماخوذ ہوا۔

ایرازمس (Erasmus) جو لحاظ علم وفضل مور سے بھی بلند درجہ رکھتا تھا شہر اسٹین (Stin) کی خانقاہ میں رہتا تھا وہاں ایک دوسرے راہب پر عاشق ہو گیا اور اسے عاشقانہ خطوط لکھے جو پکڑے گئے اور بھید کھل گیا۔

عہد نہضت میں جوں جوں علم وفضل کی ترقی ہوتی گئی لوگوں میں اس مشغلہ کا شوق زیادہ پیدا ہوتا گیا چنانچہ پولیز یانو (1) (Polizianus) اور آرٹینو (2) (Aritino) بھی شائق تھے اور یہی عیب پاپائے اعظم جولیس (3) میں بھی پایا جاتا

(۱) اینجلو پولیز یانو سنہ ۱۴۵۴ء تا سنہ ۱۴۹۴ء۔ لاطینی، اطالین اور یونانی زبانوں کا زبردست ماہر تھا، جب اس نے یونانی ملک الشعراء ہومر کی کتاب ایلیڈ (Elaid) کا ترجمہ کیا تو تمام یورپ میں دھوم مچ گئی۔ پرنس لورنزو ڈی میڈیسیا ئی نے اس کی سرپرستی کی اور "ملک الافاضل اطالیہ" بنا دیا، علاوہ ازیں وہ فلورنس یونیورسٹی میں السنہ یونانی و لاطینیہ کا پروفیسر مقرر ہوا جب پرنس لانزو نے اسے اپنے دو لڑکوں کا اتالیق مقرر کیا تو شہزادہ کی بیوی نے اعتراض کیا کیونکہ وہ کافی بدنام ہو چکا تھا۔

(۲) آرٹینو (Aretino) سولھویں صدی میں اطالیہ کا مشہور شاعر اور ظریف تھا سنہ ۱۴۹۲ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۵۵۶ء میں ایک تپائی پر سے گر کر ہلاک ہوا، اپنے غیر فطری ذوق کی وجہ سے وہ جگہ جگہ سے نکالا گیا۔

(۳) جولیس دوم۔ بمقام البزولا سنہ ۱۴۴۳ء میں پیدا اور سنہ ۱۵۱۳ء میں فوت ہوا۔

تھا، حتیٰ کہ ارسطو شاعر و ادیب تک نے پاپائے موصوف پر حملے کیے تھے اور تاسو[1] (Tasso) کی بھی انفعالی کیفیت بہت مشہور تھی۔

فرانس کا مشہور نقاش و مصور لیونارڈو ڈاونسی[2] (Leonardo Da Vinci) بھی اس مشغلہ کی وجہ سے بدنام تھا۔ ۱۴۷۶ء میں جب اسکی عمر ۲۴ سال کی تھی تو اسے فلورنس کی عدالت میں اس الزام پر مقدمہ چلا۔ اسی طرح وہ کئی بار ماخوذ ہوا اور قید کر دیا گیا۔ تمام عمر اسکے گرد خوبصورت لڑکے جمع رہے اور عورت کی طرف کبھی ملتفت نہ ہوا۔

اسی طرح دورِ نہضت کا مشہور و معروف آرٹسٹ مائیکل اینجلو[3] (Michael Angelo) بھی اس طرف بہت مائل تھا۔ اس کے خطوط اور نظمیں جذبات غیر فطری سے مملو ہیں۔

مائیکل اینجلو کا ہمعصر مصور بزّی[4] (Bazzi) اس علت مذموم میں

(۱) تاسو (Torquato Tasso) اطالیہ کا مشہور عالم اور شاعر تھا مقام سورنٹو ۱۵۴۴ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۵۹۵ء میں فوت ہوا۔

(2) S. Freud, Eine Kindheitserinnerung Deleonardo Da Vinci 1910,

(3) J. A. Symonds, Life of Michaelangelo.

(4) R. H. Hobartcust, Giovanni Antonio Bazzi.

اس قدر مشہور تھا کہ لوگوں نے اس کا نام ہی سوڈوما (Sodoma) رکھ دیا
سلینی (Cellini) بھی اس کا شوقین تھا۔ یہ شخص اپنے زمانہ کا
مشہور سنگ تراش اور بت ساز تھا۔ خلاف وضع فطری کے جرم میں اس
شخص کو سزا بھی ہو گئی تھی۔(۱)

ملک فلینڈرس کے مشہور و معروف سنگتراش و مجسمہ ساز جیروم
ڈوکیسری (Jerome Duquesnoy) کو اس قدر شوق تھا کہ اسی جرم میں
قتل کیا گیا۔ اس کی آخری حرکت یہ تھی کہ وہ شہر گھنٹ (Ghant) کے بڑے
گرجا میں بھی وہ اس حرکت سے باز نہ آیا اور آخر کار گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔(۲)

تیرھویں صدی میں فرانس کے اندر یہ علت اس قدر وبا کی طرح پھیلی
کہ پیرس کی کونسل نے ۱۲۱۲ء میں اور روٹین کی کونسل ۱۲۱۴ء میں اسکی سزا
قتل قرار دی اور اس قدر غلو کیا گیا کہ اگر کوئی عورت کسی مرد کی طرف راغب ہوتی
اور وہ مرد اس کی طرف توجہ نہ کرتا تو اسے اسی مشغلہ کا عادی قرار دیکر سزا دیتے تھے۔

فرانس کے اندر چودھویں صدی میں بھی یہ علت بہت پھیلی ہوئی تھی اور
بانکوں (Knights) کے طبقہ ٹمپلرس (Templars) میں

(1) J. A. Symoud's Life Of Celline
(2) Eckhond's Account of Duquesnoy
(Jahrbuch Für sexuelle Zwischepistupen
1899

خاص طور پر پائی جاتی تھی جن کی نسبت خیال تھا کہ وہ اس علت مذموم کو ممالک مشرق سے لائے ہیں۔ علاوہ ازیں اطالوی بلکہ کیتھرائن دی میڈیسائی کے (Catherine De Medis) کا دربار اس قسم کے شوقینوں سے اس قدر معمور تھا کہ وہ دنیا بھر میں رسوا ہو گئی۔ باینہمہ مرتکبین جرم کو وقتاً فوقتاً سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ مثلاً ۱۵۸۶ء میں پیرس یونیورسٹی کے ریکٹر (Rector) دادون (Dadon) نے جب یہ مذموم حرکت کی تو بھانڈا پھوٹ گیا اور سزا یہ ملی کہ پھانسی پر لٹکا دیے گئے اور لاش کو پھونک دیا گیا۔(۱)

اٹھارویں صدی کے فرانس میں بھی اس کا چرچا اس قدر پایا جاتا تھا کہ اس زمانہ میں مادام نے جو نوعمر بادشاہ کی طرف سے نائب السلطنت کے فرائض انجام دے رہی تھی اس شوق مذموم کی اپنے خطوط میں بار بار شکایت کی۔ اس کا شوہر بھی اسی قسم کا آدمی تھا۔ اس زمانہ میں چونکہ بدچلن لوگوں کو چھانٹ چھانٹ کر پیرس کے مشہور قید خانہ بسٹیل (Bastille) میں بھر دیا گیا تھا اس لیے یہ محبس اس قسم کی مذموم عادت کا مرکز بن گیا تھا۔ سنہ ۱۷۰۲ء میں بسٹیل کے اندر ایک نہایت حسین اور متناسب الاعضاء نوجوان لیبل (Lebel) تھا۔ پہلے یہ لڑکا ادھر ادھر خدمت گاری کیا کرتا تھا لیکن خود کو بہت شریف زادہ اور اونچے

(1) P. del' Estoile Memaries Journaux, Vol II P. 326

طبقہ کا اظہار کرتا تھا۔ جب اس کی عمر دس سال کی ہوئی تو دوپلیشیس (Duplessis) نے اس کے اخلاق خراب کر دیے، اس کے بعد یہ بڑے بڑے فوجی افسروں، نواب زادوں اور پادری صاحبان کے پاس رہا۔ جب تحقیقات ہوئی تو بہت سے آدمی جو اس سے ملوث تھے زندہ جلا دیے گئے۔ بعض نے ذلت و رسوائی سے بچنے کے لیے اپنا گلا خود کاٹ لیا، کچھ چھوڑ دیے گئے اور کچھ قید خانہ میں ڈال دیے گئے۔

جرمنی میں قدیم الایام سے اس کا شوق چلا آتا ہے۔ امانیس مارسلینس (Ammianus Marcellinus) نے لکھا ہے کہ:-

"سلطنت روم کے آخری عہد میں بعض جرمن قبائل کے اندر یہ مذموم عادت پائی جاتی تھی۔ قرون وسطیٰ میں بھی یہ شوق موجود تھا، جرمن خاندان شہنشاہی کے بہت سے شہزادے آپس میں یہی تعلقات رکھتے تھے۔"

جرمنی کے مشہور شاعر ہنری فان کلیسٹ (Henrich von Kleist) کو اس کا بہت شوق تھا۔ اس کا خاص محبوب ارنسٹ فان فیوئل (Ernst Von Fuel) تھا جو بعد میں پروشیا کا وزیر جنگ ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے تعلقات کا اندازہ اس خط سے کیا جا سکتا ہے جو کلیسٹ نے ۱۸۰۵ء میں یعنی ۲۸ سال کی عمر میں لکھا تھا، لکھتا ہے کہ:-

"تم نے میرے لیے یونانیوں کا دور قدیم پیدا کر دیا ہے میں تمہارا احاطہ کیے ہوئے ہوں جب تم تھون (Thun) کی جھیل میں

نہاتے تھے تو میں تمہارے خوبصورت جسم کو تکا کرتا تھا...... آؤ میرے ساتھ انسپاخ (Anspach) چلو اور عشق و محبت کے لطف اٹھاؤ .... میں کبھی شادی نہ کروں گا۔"

انیسویں صدی کی جرمنی کے اندر ہر طبقہ میں بعض نہایت مشہور لوگ اس ذوق کے پیدا ہوئے۔ چنانچہ ایک طرف ہم کو ایک اعلیٰ صاحب علم و فضل اور عالی دماغ شخص الگزینڈر فان ہمبولٹ (Alexander Van Homboldt) نظر آتا ہے اور دوسری طرف الیف۔ اے کرپ (F. A. Krupp) جیسے شخص کو دیکھتے ہیں یہ وہی شخص ہے جس نے بمقام ایسین (Essen) جرمنی کا مشہور کارخانہ آہن سازی قائم کیا تھا، اس شخص کی نسبت لکھا ہے کہ "وہ جزیرہ کیپری (Capri) کی تفریح گاہ میں خوب رنگ رلیاں منایا کرتا تھا ہر وقت خوبصورت لڑکے اسے گھیرے رہتے تھے اور یہ ان پر پانی کی طرح روپیہ بہاتا تھا، بالآخر حد درجہ بدنام ہو گیا۔" مشہور جرمن اخبار وورواڑٹس (Vor Wiarts) نے کیپری کے متعلق کرپ کی زندگی کے حالات شائع کیے جس پر خاندان کرپ نے برافروختہ ہو کر اخبار مذکور پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیا لیکن فوراً ہی بعد کو کرپ نے خودکشی کر لی اور وہ مقدمہ اٹھا لیا گیا۔

اہل قلم جرمنوں میں منجملہ ان لوگوں کے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے پلیٹن (Platen) کے بی۔ مارٹز (M. B. marie) اور آفلینڈ (Offland)

کا نام بھی اسی سلسلہ میں لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مول (Moll) کا قول ہے کہ خاص شہر برلن میں چھ سات سو اشخاص ایسے دیکھے ہیں جنہیں اس کا شوق ہے اور ڈاکٹر ہرشفیلڈ بیان کرتے ہیں کہ وہ برلن میں دس ہزار سے زیادہ ایسے لوگوں کو جانتے ہیں۔ برلن میں بعض بڑے بڑے ہوٹل ایسے ہیں جہاں عموماً اس کے شائق جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہاں بہت سے نیپن (Kneipen) یعنی کھانے پینے کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں جہاں خوبصورت لڑکے بطور خدمتگار ملازم ہوتے ہیں۔ برلن کی پولیس اگرچہ ان رازوں سے آگاہ ہے لیکن کوئی دخل نہیں دیتی۔

جرمنی ہی دنیا بھر میں ایسا ملک ہے جہاں کھلم کھلا اس کی تحریک پائی جاتی اور اس کے متعلق جتنی کتابیں جرمنی سے شائع ہوئی ہیں اتنی دنیا کے کسی ملک سے شائع نہیں ہوئیں۔

قدیم ٹیوٹانک (Teutonic) زمانہ میں جرمنی کے اندر اس فعل کی کوئی سزا مقرر نہ تھی لیکن جب قوم عیسائی ہو گئی اور کلیسا کا زور ہوا تو یہ فعل جرم قرار دیا گیا۔ شاہ الاریق دوئم کا فرمان جاری ہوا کہ ایسے شخص کو زندہ جلا دیا جائے۔ بعد ازاں ساتویں صدی میں شاہ چنداس دنڈ (Chindas Dind) نے فرمان جاری کیا کہ جو شخص یہ حرکت کرے اس کو خصی کر دیا جائے اور تیرھویں اور چودھویں صدی میں زندہ جلانے کی سزا مقرر ہوئی۔

عورتیں اور استلذاذ بالمثل

حکیم افلاطون یونانی کی "سمپوزیم" (Symposium) یعنی "بزم نشاط" میں رجحانات جنسی کا جو نظریہ ارسطوفانیس(۱) (Aristophanes) نے قائم کیا ہے، اسمیں عورت و مرد کا درجہ مساوی رکھا ہے۔

ایک کیتھولک پادری نے ہیولاک ایلیس(۲) (Havelock Ellis) سے بیان کیا کہ چار میں ایک مرد اور تین عورتیں اس شوق کا اقرار کرتی ہیں یعنی یہ شوق بہ نسبت لڑکوں کے لڑکیوں میں زیادہ پایا جاتا ہے، کیونکہ اسکولوں، کالجوں اور خانقاہوں میں ان کو اس کا بہت موقع ملتا ہے۔

اس شوق کا سب سے پہلا واقعہ جو مفصل طور پر قلمبند کیا گیا، اس میں ایک عورت ہی ملوث تھی، اس کا نام (Catherine Margretha Linckan) تھا۔ اس نے مرد بن کر ایک دوسری عورت سے "شادی" کی۔ بالآخر بھانڈا پھوٹا، گرفتار ہوئی۔ اور سنہ ۱۷۲۱ء میں بسزائے موت دی گئی۔(۳)

(۱) ارسطوفانیس (۴۴۸ لغایۃ ۳۸۰ ق۔م) یونان کا مشہور ڈرامہ نویس و ظریف شاعر تھا۔

(2) Havelock Ellis Sexual Inuersion P. 195

(بقیہ صفحہ ۲۳۷ پر)

عورت کے اس شوق کے متعلق خاص واقعہ وہ ہے جو ہنگری کی (Countess Sarolta) پر چلایا گیا تھا، یہ عورت ہمیشہ مردانہ لباس میں رہتی تھی۔ اس نے ایک لڑکی سے "شادی" کرلی جب یہ مقدمہ چلا لیکن ملزمہ عدالت سے بری ہوگئی اور اسے مردانہ لباس پہننے کی اجازت مل گئی۔(۱)

ایک عجیب بات یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ جس طرح اس ذوق کے مردوں میں اکثر صاحب کمال ہوتے ہیں اسی طرح اس ذوق کی عورتوں میں بھی کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ جن عورتوں کو اس کا شوق ہوتا ہے ان میں کوئی مردانہ خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ مگر ہم اس قول سے متفق نہیں، کیونکہ دنیا کی تاریخ ایسی بہادر عورتوں سے بھری پڑی ہے جن میں یہ مذموم عادت نہیں پائی جاتی تھی مثلاً مصر کی ملکہ ہتشپسو (Hatshep..sooo) کو لیجیے جس کی نسبت ایک مورخ کا قول ہے کہ "وہ تاریخ میں سب سے پہلی صاحب عظمت و جلال عورت تھی"۔ اس ملکہ میں زبردست مردانہ خصوصیات تھیں، وہ ہمیشہ اپنی یادگار مردانہ لباس میں قائم کرتی تھی، حتیٰ کہ بعض اوقات مصنوعی داڑھی بھی لگا لیتی تھی، اسی طرح آشوریہ کی ملکہ سیمی رامیس (Semi Rames)

---

(3) (فٹ نوٹ صفحہ ۲۳۶) F.C. Muller Ein Weiterer Fall Won Contrarer Sexual Emp Finding.

---

(1) H. Rafet-Ebing Psychpathia Sexualis.

ہندوستان کی ملکہ رضیہ سلطانہ، چاند سلطانہ، نور جہاں بیگم، تارا بائی وغیرہ شجاعت تدبیر و سیاست میں مردوں سے کم نہ تھیں لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کو اس حرکت کا شوق تھا مگر عہد قدیم و جدید میں بعض عورتیں ضرور ایسی گزری ہیں جو کسی خصوصیت خاصہ کی مالک تھیں اور ان میں یہ ذوق بھی پایا جاتا تھا، چنانچہ کیتھرائن دوم، ملکہ روس اور سویڈن کی ملکہ کرسٹینا (Christina) مردانہ جرات و بہادری کے ساتھ استلذاذ بالمثل کی بھی عادی تھیں، بعض بڑی بڑی ماہر جنسیات اور معلمہ اخلاق عورتیں مثلاً مادام بلاوٹسکی (Blavatsky) اور لوئسی مائکل (Louisi Michel) بھی یہ ذوق رکھتی تھیں۔

اٹھارویں صدی سے اب تک بعض بڑی مشہور ایکٹریسیں اور دیگر فنون کی اعلیٰ ماہر عورتیں کسی نہ کسی صورت میں اسکی شائق پائی گئی ہیں۔ سیفو (Sappho) جو اپنے زمانہ کی بڑی زبردست شاعرہ مانی جاتی تھی اور جس کا نام نہایت ادب و احترام کے ساتھ شعرائے یونان کے بابا آدم ہومر کے ساتھ لیا جاتا تھا اس عادت میں مبتلا تھی۔ ایک لڑکی فاؤن (Phaon) کے عشق میں وہ اس قدر شدت سے مبتلا ہوئی کہ جان دینے کے لیے سمندر میں کود پڑی۔ وہ اپنی سہیلیوں کو اسی ذوق و شوق کے خطوط لکھا کرتی تھی جیسا الکائیس (Alcaeus) اپنے محبوب لڑکوں کو لکھا کرتا تھا[1]۔ اس زمانہ کی حالا

(۱) سیفو (Sappho) کی اس بدنامی کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ انگریزی زبان میں لفظ "Sapphism" کا مفہوم ہی "خلاف فطرت فعل" ہو گیا۔

سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے اندر یہ شوق قدیم زمانہ سے چلا آتا تھا اور اس فن میں اسپارٹا (Sparta) لزبوس (Lasbos) اور ملیطوس (Miletus) کی عورتیں زیادہ مشہور تھیں۔

یہ عرض کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ لٹریچر میں بمقابلہ مردوں کے ایسی عورتوں کا ذکر زیادہ آتا ہے۔ چنانچہ آریوسٹو (Ariosto) نے عورتوں کے اس قسم کے رجحانات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ دانڈ رو (Diderod) کا مشہور ناول لا ریلیجیس (La Religieuse) جب اوّل اوّل شائع ہوا تو عام خیال یہ ہوا کہ یہ ناول درحقیقت کسی کلیسہ کی کنواری (Num) کا لکھا ہوا ہے جس نے ان مظالم کا حال بیان کیا ہے جو دیر کی راہبہ (Albess) نے بسلسلۂ استلذاذ بالمثل اس پر کیے تھے۔ عوام کا خیال یہ بھی ہوا کہ مصنف نے راہبہ کے پردے میں درحقیقت (Albess of Challes) کا خاکہ اڑایا ہے جو نائب السلطنت کی لڑکی اور شاہی خاندان کی ایک رکن تھی۔

اسی طرح ایک فرانسیسی ڈرامہ بنام "لی پلیزر دو کلاسٹر" (La Plaisiro Ducloitre) یعنی راہبہ خانہ کا "عیش و عشرت" ۱۷۷۳ء میں لکھا گیا اس میں بھی ایک سین اس ذوق کا دکھایا گیا ہے۔

۱۸۳۵ء میں گاتیے (Gautier) نے اس قسم کی ایک عجیب غریب دلچسپ حکایت "مادموزیل دی ماپین" (Mademaiselle

(Da manpsier) کے نام سے لکھی۔ اس میں ہیروئن مردانہ لباس پہن کر زندگی بسر کرتی ہے
کبھی عورتوں کو پٹہ بازی سکھاتی ہے اور کبھی کسی تھیٹر میں مغنیہ بن جاتی ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ فرانس کے مشہور اور ہر دلعزیز فسانہ نگار موسیو اے بیلو (A. Belat) نے ایک دلچسپ ناول موسوم بہ "مادموزیل جیراد ما فمہ"
(Madamoiselle Giraud maf emma.)
شائع کیا جس سے عوام کو بہت دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے شادی کی تھی مگر اس کی بیوی پاس نہیں آنے دیتی تھی کیونکہ وہ اپنی پرانی سہیلیوں سے بہت مانوس تھی۔ الغرض اسی قسم کے بہت سے ڈرامے، بہت سے ناول اور بہت سی نظمیں ہیں جن میں مختلف مصنفین نے عورتوں کے اس شوق کا ذکر کیا ہے۔

ایک امر اور بھی قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ اس شوق کے سلسلہ میں قتل کے جس قدر جرائم سرزد ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر عورتیں ملوث پائی جاتی ہیں۔ اس ذوق کے مرد بوجہ اپنی نسائی خصوصیات کے کسی کو زدوکوب یا قتل کرنے کے مرتکب نہیں ہوتے لیکن عورتیں ان جرائم سے بھی نہیں چوکتیں۔

اس قسم کا سب سے پہلا تاریخی مقدمہ وہ ہے جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اندر سنہ ۱۸۹۲ء میں ہوا اور جسے عرف عام میں ممفس کیس (Memphis case) کہتے ہیں۔ واقعات مقدمہ یہ تھے کہ ایک عورت ایلائس مائچل

(Ellice Mitchelle) نے مردانہ لباس اور نام اختیار کر کے ایک بھولی بھالی لڑکی فریڈا وارڈ (Frida Wood) کو بہکا کر اس سے شادی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب یہ راز فریڈا کی بہن کو معلوم ہوا تو کامیابی نہ ہوئی۔ ایلائس مائیچل کے دل کو اس واقعہ سے اس قدر صدمہ گزرا کہ اس نے اپنی معشوقہ فریڈا ہی کا گلا کاٹ ڈالا، مقدمہ چلا لیکن عدالت نے ملزمہ کو فاتر العقل قرار دے کر چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر جے۔ جی کیرنان (Kirnan) نے شہر شکاگو کی دو بہنوں کی نسبت بیان کیا جو عام طور سے "ملر خواہران" (Miller Sisters) کے نام سے مشہور تھیں، دونوں بہنیں ادنیٰ درجہ کے تھیٹروں میں کام کیا کرتی تھیں، نسل کے لحاظ سے ان میں یورپین اور حبشی خون ملا ہوا تھا۔ کہنے اور دیکھنے کو تو یہ دونوں عورتیں "بہنیں" تھیں۔ لیکن فی الحقیقت "میاں بیوی" کی طرح رہتی تھیں۔ ایک کو فطرتاً اس فعل سے رغبت تھی اور دوسری کو نفرت۔ چنانچہ جب اس کا تعلق کسی مرد سے ہو گیا تو اس نے اپنی بہن کو چھوڑ دیا، اس بہن کو آتش رقابت نے اس قدر جلایا کہ جب رات کو وہ دونوں کمرہ میں پڑے سو رہے تھے تو یہ چپ چاپ اس کمرہ میں گھس گئی اور مرد کو گولی مار دی، ملزمہ گرفتار ہوئی، مقدمہ چلایا گیا اور حبس دوام کی سزا دی گئی۔

ایسا ہی ایک واقعہ جو شکاگو میں گزرا تھا ماہ جون سنہ ۱۸۹۹ء کے مجلہ

"میڈیسن" (Medicine) میں شائع ہوا تھا۔ ایک سند یافتہ نرس (Nurse) دوسری جوان عورت کے ساتھ چودہ برس تک رہی اسی دوران میں وہ عورت چار مرتبہ اسے چھوڑ کر چلی گئی لیکن ہر مرتبہ کہنے سننے سے واپس آگئی۔ آخر کار پانچویں مرتبہ جا کر اس نے ایک مرد سے شادی کر لی نتیجہ یہ ہوا کہ اس نرس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس نے اس مرد کو گولی کا نشانہ بنا دیا خوش قسمتی سے زخم مہلک نہ تھا اور مرد کی جان بچ گئی۔ ملزمہ گرفتار ہوئی، مقدمہ چلا لیکن عدالت نے صرف سزائے جرمانہ دینے پر اکتفا کی اس نے دو مرتبہ شادی کی لیکن دونوں شوہروں کو چھوڑ بھاگی۔

شکاگو میں ایک اور واقعہ ایسا ہی گزرا جس میں ایک روسی لڑکی انارو بینووچ (Annaru Binowitch) نے ایک دوسری روسی لڑکی کو محض رشک حسد کی بناء پر گولی مار دی، انا اس لڑکی کو بچپن سے چاہتی تھی۔ معشوقہ کو گولی مار کر انا نے اپنے بھی گولی مار لی اور اس طرح دونوں کا خاتمہ ہو گیا، بات یہ ہوئی کہ انا کی معشوقہ ایک مرد سے ملنے لگی۔ اس پر آتش رقابت بھڑکی جس نے "عاشق و معشوق" دونوں کا خاتمہ کر دیا۔

جن عورتوں کو اس کا شوق ہوتا ہے وہ کبھی کبھی دل شکستہ ہو کر خودکشی بھی کر لیتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۰۱ء میں امریکہ کی ریاست مساچوسٹیس (Massachusettes) میں اسی قسم کا مہلک واقعہ رونما ہوا اکیس سالہ

کی ایک لڑکی بیمار پڑی جس کی تیمارداری ایک شوہردار عورت نے کی، یہ عورت اس لڑکی سے عمر میں چودہ سال بڑی تھی۔ دونوں میں محبت پیدا ہو گئی۔ اور اس قدر بڑھی کہ عشق کے درجہ تک پہنچ گئی۔ لیکن لڑکی کی ماں اور عورت کے شوہر کو یہ ضرورت سے زیادہ "گہری محبت" ناگوار معلوم ہوئی اور انھوں نے روک تھام کرنا چاہی، چنانچہ لڑکی کو ایک دور دراز مقام پہ بھیج دیا گیا۔ مگر بایں ہمہ دونوں میں چوری چھپے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان ملاقاتوں کا راز افشا ہو گیا تو اور زیادہ سختی ہونے لگی۔ بالآخر مجبور ہو کر نوجوان لڑکی نے ریوالور لیا اور اپنی ماں کے سامنے اپنی کنپٹی میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ ۱۹۰۵ء میں بمقام نیویارک گزرا۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ ایک بہت پرانا جہازراں جو سالہا سال یورپ اور امریکہ کے درمیان آنے جانے والے جہازوں کی ناخدائی کر چکا تھا بیمار پڑا۔ اور "دار ملاح خانہ" (Sailors Home) میں داخل کر لیا گیا۔ اس کا نام جان ویڈ (John Weed) تھا۔ چند روز بعد دل شکستہ ہو کر اس کپتان نے اپنا گلا کاٹ لیا۔ مرنے کے بعد معلوم ہوا کہ "کپتان ویڈ" درحقیقت ایک عورت تھی اور یہ بھی تفتیش سے ثابت ہوا کہ خودکشی کا باعث اپنی "معشوقہ" سے جدائی تھی۔

نوجوان لڑکیاں بسا اوقات خوبصورت ایکٹرسوں پر ایسی عاشق ہو جاتی ہیں کہ انھیں دین و دنیا تک کی خبر نہیں ہوتی اور اکثر اس یک طرفہ عشق کا نتیجہ

مایوسی اور پھر خودکشی ہوتا ہے۔ مثلاً چند سال ہوئے فلاڈلفیا میں ایک انیس سال کی نوجوان لڑکی جو ایک متمول اور عالی مرتبہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور خود بھی نہایت حسین و جمیل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ مس میری گارڈن ایکٹرلیس پر عاشق ہو گئی، دونوں کو ایک دوسرے سے ملاقات کرنا کبھی نصیب نہ ہوا نوجوان عاشق زار لڑکی ایکٹرلیس کی تصویر کے سامنے دوزانو بیٹھ جاتی اور اس کی پوجا کیا کرتی اور پھر اس خیال سے کہ شاید اسے کبھی میرن گارڈن کی مشاطگی کی مسرت نصیب ہو۔ نوجوان لڑکی نے بال اور ناخن بنانا بھی سیکھے۔ اور آخر کار دل شکستہ ہو کر ریوالور سے خودکشی کر لی۔

یہ شوق صرف قدیم یونانی عورتوں ہی میں نہیں تھا بلکہ قدیم انگلو سیکسین (Anglo Saxons) قوم میں بھی تھا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ ساتویں صدی میں تھیوڈور کی کتاب "الکفارہ" (Theodores Penitential) رائج تھی جس میں اس فعل کے شائق مردوں اور عورتوں کے لیے بطور کفارہ علیحدہ علیحدہ ریاضتیں درج تھیں۔ مرد کے لیے مدت ریاضت اگرچہ زیادہ تھی لیکن عورت کے لیے صرف تین سال کی ریاضت مقرر کی گئی تھی۔

دنیا کی تمام وحشی قوموں کی عورتوں میں یہ شوق مردوں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مورنہاٹ (Moerenhout) سیاح کا قول ہے کہ نیوزیلینڈ کی عورتوں کو اس کا بہت شوق ہے۔ یہی حال برازیل کی عورتوں کا ہے

ڈاکٹر گنڈارو (Gandaro) نے اقوام برازیل کی نسبت تحریر کیا ہے۔

"یہاں کے اصلی باشندوں میں عورتوں کا ایک خاص طبقہ ہے جنہوں نے
تمام عمر پاکدامن رہنے اور کسی مرد کی صورت نہ دیکھنے کا عہد کر لیا ہے
یہ عورتیں تمام زنانہ مشاغل ترک کر دیتی ہیں۔ تمام کام مردوں جیسے کرتی
ہیں بال بھی ترشوا کر مردوں جیسے رکھتی ہیں، یہ عورتیں تیر و کمان سے
مسلح ہو کر مردوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں جاتی اور لڑتی ہیں۔
ہر عورت کے ساتھ ایک دوسری عورت ہوتی ہے جو اسکی ہر طرح خدمت کرتی ہے۔"(۱)

امریکہ کے اصلی باشندوں میں اس طرح کی عورتیں بکثرت پائی جاتی ہیں اور
روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں یہ شوق زمانہ قبل تاریخ سے
چلا آتا ہے، چنانچہ برطانوی کولمبیا (Columbia) کی قدیم قوم سالش
(Salish) میں اس قسم کی روایتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔(۲)

کناڈا اور مونتانا کی قوم الیشینی بوئین (Aosini Boini) اور
آئووا (Iowa) کی قوم "فاکس" (Fox) میں بھی قدیم روایات اس طرح کی

(1) Gandoua Quoted By Lamacco Arch-inio-Per-i-Authropalogic, 1889

(2) Journal Anthropological Institute July-Decr, 1904. P. 342.

پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے ہم دو روایتیں ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

ایک روایت یہ ہے کہ ایک شخص کی بیوی اپنی نند کی محبت میں اس قدر مبتلا ہوئی کہ دونوں نند بھاوج گھر سے بھاگ گئیں۔ ان دونوں کے تعلق سے ایک بچہ پیدا ہوا جو گوشت کا لوتھڑا تھا۔ مرد نے ان دونوں کا تعاقب کر کے ڈھونڈھ نکالا اور اپنی بیوی اور اس مضغۂ گوشت لڑکے کو مار ڈالا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ عرصہ ہوا کسی زمانہ میں دو جوان عورتیں آپس میں بہت محبت کرتی تھیں اور اسی طرح دو جوان مرد آپس میں بہت دوست تھے دونوں مرد ان عورتوں میں سے ایک ایک پر فریفتہ تھے۔ لیکن وہ عورتیں ان سے بات تک نہ کرتی تھیں۔ چند روز تک تو ان جوانوں نے صبر و ضبط سے کام لیا مگر پھر انھیں ان عورتوں کی طرف سے کچھ شک پیدا ہوا۔ بالآخر ایک دن موسم گرما میں جب وہ دونوں عورتیں باہم مل کر جنگل میں لکڑیاں توڑنے گئیں تو وہ دونوں جوان بھی چھپ کر ان کے پیچھے گئے اور ایک مقام پر خاموشی کے ساتھ چھپ کر کھڑے ہوگئے، کچھ دیر تک تو وہ دونوں عورتیں لکڑیاں توڑنے میں مصروف رہیں لیکن بعد میں ان کی آواز آنا بند ہوگئی۔ جب یہ حالت ہوئی تو وہ دونوں جوان چھپے چھپے دبے پاؤں اس طرف گئے جہاں وہ عورتیں تھیں اور وہاں جو کچھ دیکھا وہ ناقابل بیان ہے۔

بقول مسٹر جیکبس (Jacobus) جن کا قول پلاس و بارٹلیس

(Ploss & Bartels) نے بھی نقل کیا ہے جزیرہ بالی (Bali) کے مردوں میں جتنا شوق اس حرکت کا پایا جاتا ہے اسیقدر وہاں کی عورتوں کو بھی ہے۔

ڈاکٹر بامین (Baumann) سیاح جنھوں نے جزیرہ زنجبار وغیرہ کی خوب سیر و سیاحت کی ہے فرماتے ہیں کہ مردوں میں تو یہاں یہ شوق خیر پایا ہی جاتا ہے لیکن یہاں کی عورتیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ یہ لکھتے ہیں کہ :-

"اگرچہ مشرقی رسم و رواج کی وجہ سے یہ عورتیں کھلم کھلا مردانہ لباس نہیں پہن سکتیں لیکن پرائیوٹ طور پر محلوں میں وہ ایسا ضرور کرتی ہیں اس قسم کی عورتوں کی چال ڈھال تمام مردانہ ہوتی ہے اور خوبصورت عورتوں کو سبز باغ دکھا کر اپنے پھندے میں پھانس لیتی ہیں"

ڈاکٹر کوچر (Kocher) لکھتے ہیں کہ :-

"اگرچہ عرب کے مردوں میں یہ شوق بہت عام ہے لیکن ان عورتوں میں یہ شوق اس قدر زیادہ نہیں ہے"

مصر کے متعلق ڈاکٹر گووارڈ کوچر (Gouerd Kocher) لکھتے ہیں کہ:-

"اس ملک کی عورتوں میں یہ شوق فیشن بن گیا ہے۔ حتّیٰ کہ حرم سرا کی ہر عورت اپنے لیے ایک "دوگانہ" رکھتی ہے"

کہتے ہیں کہ ترکی کی عورتوں میں یہ شوق بہت شاذ پایا جاتا ہے البتہ سولھویں صدی میں بقول برانٹومی (Brantome) ترک عورتوں کا

شوق وہاں کے حماموں میں نظر آتا تھا اور اسی صدی میں لیوا فریقانوس (Leo Africanus) نے بیان کیا تھا کہ مراکش کی عورتیں اس میں اس قدر مبتلا ہیں کہ وہاں دارالخلافہ شہر فاس (Fez) میں ایسی عورتوں کے باقاعدہ اڈے موجود ہیں۔ شہر اماسیہ میں ایک ترک شاعرہ کی قبر ہے جس کا نام مہری خانم تھا اور اس شوق میں سیفو سے کم شہرت نہ رکھتی تھی۔

ڈاکٹر کورسے (Corre) کا بیان ہے کہ فرانس کے افریقی مقبوضات کی عورتوں میں بھی یہ شوق لبشدت پایا جاتا ہے۔ یہ لکھتے ہیں کہ:۔

"میں ایک خوبصورت اور شریف یوروپین عورت سے واقف ہوں جو کئی بچوں کی ماں ہے۔ یہ شریف عورت ڈر کے مارے بازار نہیں جاتی کیونکہ وہاں کی عورتیں اس سے گستاخانہ طور پر اظہار عشق کرنے لگتی ہیں اور ایسے ایسے اشارے کنایے کرتی ہیں جیسے کوئی شریف زادی گوارا نہیں کر سکتی"

انہی ڈاکٹر صاحب نے کئی واقعات ایسے بیان کیے ہیں کہ بعض دیسی عورتوں نے کمسن لڑکیوں کو پکڑ کر زبردستی ان کو اپنا معمول بنایا۔

بقول ڈاکٹر لوریاں (Lorion) چین وماچین کی عورتوں میں اس شوق کا پتہ نہیں لیکن ہندوستان کے زن ومرد میں یہ شوق موجود ہے۔

ہندوستان کی عورتوں میں اس کے شائق ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستانی زبان میں اس شوق کے متعلق کم از کم پانچ اصطلاحیں پائی جاتی ہیں۔

یعنی (۱) دوگانہ (۲) زناخی (۳) سعتر (۴) چپٹ ہائی (۵) چپٹ باز۔

ہندوستانی شعراء نظیر، رنگین و جان صاحب نے اپنے کلام میں اس شوق کی نسبت بکثرت اشارے کیے ہیں۔ بلکہ جان صاحب نے تو تمام کارروائی کھلم کھلا بیان کر دی ہے۔ عورتوں کی اصطلاح میں اس فعل کو "چپٹ" یا "چپٹی" کہتے ہیں اور ایسی عورتوں کی اصطلاح میں "ساتھ رہنے" کو "جدا رہنا" کہتے ہیں۔

ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب (Sexual Inversion) میں ہندوستان کے بعض واقعات بیان کیے ہیں:۔ مثلاً:۔

"شہر ...... کے جیل خانہ میں سپرنٹنڈنٹ نے عورتوں کے احاطہ سے متعدد آلات برآمد کیے جو چکنی مٹی سے بنا کر دھوپ میں سکھا لیے گئے تھے ان کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں کام میں لایا گیا ہے۔"

"شہر کے قید خانہ میں ایک مردنما عورت تھی جو اوائل عمر سے خراب ہو کر کسبی بن گئی تھی۔ اس عورت کی "بیوی" ایک ذلیل سی عورت تھی لیکن اس میں عنصر نسائیت زیادہ غالب تھا، یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک روز وہ عورت مقامی پنڈت جی کے پاس گئی اور ان سے ملتجی ہو کر درخواست کی کہ وہ دیوتا سے کہہ سن کر ایسا کر دیں کہ اسکی "بیوی" حاملہ ہو جائے۔"

واضح ہو کہ سنسکرت کی کتب طب مثلاً چرک و سشرت میں اس امر کا امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ دو عورتوں کے اس تعلق سے حمل قرار پا کر ایک

مضغۂ گوشت بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو آریوں کی علم طب کی مختصر تاریخ۔
(History of Aryan Medical Scirce)

"شہر...... میں دو عورتیں "جدا جدا رہتی تھیں" ان میں ایک برہمنی تھی اور
دوسری گڈریہ۔ دونوں آپس میں "میاں بیوی" تھیں اسی طرح ایک
مسلمان عورت کو دیکھا گیا جس نے اس کا اقرار کیا ایک اور مسلمان
عورت نے بیان کیا کہ اسے یہ شغل بارہ برس کی عمر میں ایک پڑوسن نے
سکھایا تھا۔ اسی طرح مالن کی دو بیوہ لڑکیاں تھیں جو اسکی شائق تھیں"۔

ہندوستان کے جیل خانوں میں عورتوں کا جو حال ہے وہی یورپ کے جیل خانوں میں ہے۔ بلکہ تحقیق کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کے قیدیوں میں مردوں کے اندر استلذاذ بالمثل کی علت اسقدر زیادہ نہیں جسقدر عورتوں میں ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور بات بھی بہت دلچسپ ہے یعنی پیشہ ور عورتوں میں بھی جنھیں مردوں کی کوئی کمی نہیں، اس کا شوق ہوتا ہے۔ برلن میں ۲۵ فی صدی پیشہ ور عورتیں یہ شوق رکھتی ہیں اور بقول پیرنٹ دوشاتلے (Parent Dechatlets) پیرس میں بھی یہی نسبت ہے لیکن ڈاکٹر بورنوائل (Bournuille) کا قول ہے کہ "پیرس کے شفاخانوں میں جس قدر عورتیں زنانہ امراض کے سلسلہ میں زیر علاج ہیں ان میں ۷۵ فیصدی ایسی ہیں جو اسکی عادی تھیں۔ ڈاکٹر ہیمر کا قول ہے کہ جرمنی کی اندر منجملہ ۶۶ کے ۴۱۔ اسکی شائق پائی گئیں۔

ہیولاک ایلیس (Havelock Ellis) کے ایک دوست نے بیان کیا کہ پیرس کی پیشہ ور عورتوں میں اس کا شوق بے حد رائج ہے۔

لومبروزو اور فریرو (Lombroso & Ferrero) نے اپنی کتاب "نسبت اخلاق عورت" (La-Douna Delinquente) میں پیشہ ور عورتوں میں اس شوق کے پائے جانے کے اسباب حسب ذیل تحریر کیے ہیں:۔

(۱) ضرورت سے زیادہ ہیجان نفس۔

(۲) عرصہ تک مرد سے دور کسی جگہ مقید رہنا۔

(۳) ہر وقت عورتوں ہی کی صحبت میں رہنا جیسا قحبہ خانوں میں اکثر ہوتا ہے۔

(۴) بڑھاپے کے ساتھ خواہش نفسانی کی زیادتی۔

(۵) پیشہ کرتے کرتے جنس مقابل سے جی بھر جانا۔

(۶) آنے جانے والوں کے ساتھ محبت کا نہ ہونا۔

یہ شوق خصوصیت کے ساتھ ان عورتوں میں زیادہ نظر آتا ہے جو اپنے مشاغل زندگی کے لحاظ سے زیادہ وقت مردوں سے علیٰحدہ بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں، چنانچہ کلیسا کی کنواریوں (Nuns) میں اور بڑے بڑے ہوٹلوں کی خادمہ عورتوں میں اسی سبب سے یہ عادت پائی جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں سوئزرلینڈ کا ایک واقعہ بیان کر دینا خالی از لطف نہ ہوگا۔ ایک انگریز نے معہ اپنی بیوی کے وہاں بود و باش اختیار کی اور بیوی کے لیے ایک خوبصورت لڑکی

بطور پیش خدمت ملازم رکھی گئی، جسے رات دن یہیں رہنا پڑتا تھا، کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ اپنے ساتھ رات کے وقت سونے کے لیے اور نئی نئی عورتیں لاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ عورت پہلے ایک بڑے ہوٹل میں کام کیا کرتی تھی وہیں اُسے یہ شوق پیدا ہوا تھا۔

اسی طرح بڑی بڑی دوکانوں، کوٹھیوں اور کارخانوں میں جو لڑکیاں یا عورتیں عرصہ تک ساتھ رہتی ہیں بلکہ جنھیں ایک ہی جگہ سونے کا موقع ملتا ہے ان میں یہ شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ایک کمرے میں صرف دو عورتیں ہوں۔ روما کے کارخانوں میں ناکسفورد (Nice Shoo ...) نے عورتوں کے متعلق زبردست تحقیقات کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ :-

"قوم کی "نیک بچیاں" جن کی عمر بارہ چودہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی اور جو بغل میں بقچہ دبائے، نگاہیں نیچی کیے نہایت معصومانہ انداز سے گزر جاتی ہیں، اپنے دلوں میں کیسے طوفانی جذبات رکھتی ہیں، سلائی کے کارخانوں میں جا کر دیکھیے کہ جس وقت کوئی نگراں موجود نہیں ہوتا تو ان لڑکیوں میں باہمدگر کس قسم کی شہوت انگیز باتیں ہوتی ہیں۔ بلکہ بسا اوقات وہ نگراں کی موجودگی میں بھی معمہ کے اندر باتیں کر لیتی ہیں۔ الغرض ان کارخانوں میں ہر وقت ایک پُر ہیجان فضا طاری رہتی ہے جس سے متاثر ہو کر اکثر لڑکیاں "خیالی استلذاذ" (Psychic Onanism) کرتی

رہتی ہیں یا بعض اوقات کسی اور طریقہ سے عملاً استلذاذ کر لیتی ہیں۔
موسم گرما میں صورت حالات اور زیادہ موافق ہو جاتی ہے کیونکہ کمروں کے
اندر لڑکیاں زیر جامہ نہیں پہنتیں بلکہ اکثر اپنے شلوکوں کے بٹن بھی کھول
دیتی ہیں، ران پہ ران رکھ کر کام کرتی ہیں جس سے ان کا بدن کم و بیش عریاں
ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اکثر لڑکیاں قریب کھسک کر ایک دوسرے
کو عریاں دیکھتی ہیں، بعض اپنی گداز رانوں کی تعریف کرتی ہیں بعض کو اپنے
سڈول سرینوں پہ ناز ہوتا ہے اور اس مشغلہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ
آہستہ تمام حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ دوپہر سے دو بجے دن تک جبکہ
سخت گرمی ہوتی ہے، یہ منظر اور بھی زیادہ ہیجان انگیز ہو جاتا ہے۔
اسوقت کارخانہ کی مالکہ تو اپنے کمرے میں جا کر سو جاتی ہے، میدان خالی
ہوتا ہے اور تمام لڑکیاں بلا استثنا استلذاذ غیر فطری میں مشغول ہو جاتی ہیں۔"(۱)

مندرجہ بالا واقعات کا تعلق چونکہ نوعمر لڑکیوں سے ہے اس لیے ممکن ہے
ان کے شغل کو بچپن کا کھیل خیال کیا جائے لیکن بڑی عمر کی عورتوں میں تو اس
قسم کے واقعات دیکھے گئے ہیں جن کی نوبت جبر تک پہنچتی ہے ہسپانیہ کے
سگار سازی کے کارخانوں میں بھی عورتوں کے اندر یہ شوق دیکھا گیا ہے فصل گرما

(1) Nice Foro Il-Gergo Cap VI 1897 Torian.

میں یہ تقریباً عریاں ہو کر کام کرتی ہیں اور اس لیے جب کارخانہ کے اندر کوئی غیر شخص آتا ہو تو اطلاع کے لیے پہلے سے گھنٹی بجا دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنا اپنا لباس پہن لیں۔

اشبیلیہ کے ایک ایسے ہی کارخانہ کا مندرجہ ذیل واقعہ قابل غور ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کی عورتوں میں رشک و حسد کے جذبات بھی نہایت سختی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں:۔

"ایک صبح جب کارخانہ میں داخل ہو کر کاریگر عورتیں اپنا صاف ستھرا لباس اُتار کر کام کرنے کے کپڑے پہن رہی تھیں، ایک عورت نے اپنی شال کے نیچے سے چھرا نکال کر دوسری عورت پر اچانک حملہ کیا اور اس کے چہرہ گردن پر جلد جلد چھ سات زخم لگائے اور دھمکی دی کہ اگر کسی نے دخل دیا تو وہ اُسے بھی قتل کر ڈالے گی۔ یہ دونوں عورتیں اس کارخانہ میں عرصہ سے کام کیا کرتی تھیں اور آشنائیوں میں داخل تھیں، ایک کی عمر ۴۸ سال تھی جس میں کسی قدر مردانہ پن تھا اور دوسری کی عمر ۲۰ سال تھی جس میں نسوانی خصوصیات کا غلبہ تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں عورتیں آپس میں ناجائز تعلق رکھتی تھیں لیکن چند روز سے کم عمر عورت کسی اور عورت سے "ملنے" لگی تھیں۔ اس لیے پہلی عورت کے دل میں جذبات رشک حسد بھڑک اُٹھے اور اس نے دونوں کو قتل کر ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔"

تھیلٹروں میں بھی عورتوں کا عموماً یہی حال دیکھا گیا ہے کیونکہ ایکٹرسوں کو

بار بار برہنہ ہو کر نیا نیا لباس بدلنا پڑتا ہے اور بعض اوقات کسی خاص پارٹ کے لیے علیحدہ کمرے میں گھنٹوں بیٹھا رہنا پڑتا ہے، ان باتوں سے ایکٹرسوں کی طبیعت استلذاذ بالمثل کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔

سنِ شعور تک پہنچنے سے پہلے ہی اسکولوں اور کالجوں کے لڑکوں اور لڑکیوں میں بھی اس کا شوق پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ بورڈنگ ہاؤس میں جب دو لڑکیاں ایک کمرہ میں رہتی ہیں تو دونوں میں عموماً الفت پیدا ہو جاتی ہے اور یہیں سے استلذاذ بالمثل کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب (Sex Inversion) میں ایک عورت کی تحریر درج کی ہے جس میں اس نے ظاہر کیا ہے کہ:-

"اسکولوں کی اکثر لڑکیوں کی طرح مجھے بھی وہیں کی ایک لڑکی نے اس طرف راغب کیا اور پھر میں نے دو اور لڑکیوں کو اس کا عادی بنایا۔"

لڑکیوں میں اس کا شوق پیدا ہونے کے اسباب عموماً حسبِ ذیل ہوتے ہیں:-

(۱) لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت آزادی سے مل سکتی ہیں اور لڑکے ایسا نہیں کر سکتے۔

(۲) لڑکیوں میں محبت اور خلوص کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔

(۳) معاشرتی رواج کے موافق کوئی لڑکی کسی جوان مرد سے مخلی بالطبع ہو کر نہیں مل سکتی لیکن جوان لڑکیاں آپس میں مل سکتی ہیں۔

(۴) رواجاً جوان لڑکیوں کا آپس میں بے تکلف ہو کر ملنا برا نہیں سمجھا جاتا۔

اس امر کی شائق عورتوں میں کسی قدر مردانگی پائی جاتی ہے اور وہ اکثر لباس مردانہ کر لیتی ہیں۔ بعض مثالیں اس قسم کی ہم پیش کر چکے ہیں بعض اور دلچسپ تاریخی واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

پادری جوزف لابڈیل (Labdell) جس کا اصلی نام لیوسی تھا۔ عورت ہی تھی لیکن مردانہ لباس میں رہتی تھی۔ جوانی میں ایک مرد سے شادی کی۔ ایک بچہ بھی پیدا ہوا لیکن شوہر سے موافقت نہ ہوئی اور وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ بالآخر لیوسی نے مردانہ لباس اختیار کیا اور اپنا نام پادری لابڈیل رکھا وہ اعلیٰ درجہ کی قادر انداز تھی۔ رائفل سے بال باندھا نشانہ مارتی تھی۔ بسر اوقات کے لئے اس نے شکاری کا پیشہ اختیار کر لیا اور امریکہ کے اصلی باشندوں میں لانگ اڈی کی شکاری عورت (Female Hunter of Longeddy) کے نام سے مشہور ہوئی۔ فن شکار پر اس نے ایک کتاب بھی لکھی جو کافی مقبول ہوئی۔ اس اثنا میں وہ ایک نوجوان تعلیمیافتہ عورت پر فریفتہ ہو گئی۔ اس عورت کا خاوند بھی اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ بالآخر دونوں نے "شادی" کر لی لیکن چند روز بعد بھانڈا پھوٹ گیا اور حکومت نے لیوسی کو بعلت آوارہ گردی قید کر دیا۔ لیکن جب دوسری عورت نے عرضیاں دے دے کر حکومت کا ناک میں دم کر دیا تو اس کو چھوڑ دیا گیا۔ اس سے بھی زیادہ پُر لطف ایک اور واقعہ ہے جو مجلہ "دی لینسٹ" (Lancet) بابت ماہ فروری ۱۸۸۴ء میں درج ہے:۔

"بندرگاہ بلفاسٹ میں ایک مزدور جان کولٹر (John Coulter) بارہ سال سے ملازم تھا، ایک روز وہ اتفاقاً زینہ سے گر کر مرگیا، معائنہ کے وقت یہ راز کھلا کہ متوفی جس کی عمر اس وقت پچاس برس کی تھی درحقیقت عورت تھا اس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بحیثیت مرد بسر کیا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں اور اوضاع و اطوار بالکل مردانہ تھے - یہ بھی معلوم ہوا کہ جب وہ "جوان" تھا تو ایک کسان کے یہاں مزدور کی حیثیت سے کام کیا کرتا تھا اس وقت اس نے اپنے مالک کی لڑکی سے باقاعدہ "شادی" کر لی تھی - "دونوں میاں بیوی" انتیس ۲۹ برس تک اہلی زندگی بسر کرتے رہے لیکن پچھلے چھ سال سے دونوں میں علیحدگی ہوگئی تھی جس کا باعث اس کی کثرت شراب خواری تھی۔"

ذیل کا واقعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے جو ویکلی اسکاٹس مین (Weekly Scotsman) بابتہ ماہ فروری ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا:-

"میری اینڈرسن (Mary Anderson) عرف "مری ہال" (Mary Hall) جس کا ۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا۔ اسکاٹ لینڈ میں بمقام گووان (Govan) پیدا ہوئی، اوائل عمر ہی میں یتیم ہوگئی اور جب اس کا بھائی بھی مرگیا تو وہ اس کے کپڑے پہن کر بحیثیت مزدور اڈنبرا چلی گئی لیکن ایک مرتبہ جب وہ بیمار ہوئی تو

اس کا راز فاش ہو گیا۔ اسکاٹ لینڈ سے بھاگ کر امریکہ پہنچی جہاں وہ مردانہ لباس مشاغل میں تیس ۳۰ برس تک زندہ رہی اور اسی دوران میں اس نے کافی دولت جمع کر لی وہ اکثر سیاسیات میں بھی حصہ لیتی تھی اور بزم ہائے نشاط میں بھی شرکت کرتی تھی، وہ شراب خوب پیتی اور شراب پی کر خوب فحش گیت گاتی تھی، مردوں کی طرح گھونسہ بازی بھی کرتی تھی اس نے دو مرتبہ "شادی" کی۔ پہلی شادی کے بعد "خلع" ہو گیا لیکن دوسری بیوی بیس برس تک زندہ رہی، اس کے علاوہ دوسری نوجوان لڑکیوں سے اختلاط کرتی رہتی تھی۔ مرنے کے بعد اسکی جنسیت کا راز فاش ہوا"

ایک اور واقعہ جو لندن کے اخباروں میں شائع ہوا تھا، کیتھرائن کوم (Catherine Coome) کا ہے جو چالیس برس تک کامیابی کے ساتھ مرد بنی رہی، اس نے مردوں کی تمام باتیں اختیار کر لی تھیں، یہاں تک کہ اس نے ایک اور عورت سے "شادی" بھی کر لی تھی۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں تختۂ جہاز پر ایک عورت مس کیرولائن ہال (Caroline Hall) ساکن بوسٹن کی موت واقع ہوئی جو عرصہ تک شہر میلان میں مصوری کرتی رہی تھی۔ یہ عورت مردانہ لباس پہنتی تھی اور ایک اطالوی لیڈی کے "شوہر" کی حیثیت سے رہتی تھی۔ وہ اپنا نام ہمیشہ "مسٹر ہال" بتاتی تھی اس کے اوضاع اطوار تمام مردانہ تھے۔ وہ رائفل سے نہایت اچھا نشانہ لگاتی تھی اور تمام مردانہ

کھیلوں میں شرکت کرتی تھی۔ مرض دق میں مبتلا ہو کر فوت ہوئی۔

سب سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ شہر اشبیلیہ کے ایک پولیس مین کا ہے جو تیس برس تک حاکم شہر کا اردلی رہا۔ ایک اتفاقی حادثہ میں مضروب ہو کر وہ اسپتال پہنچا جہاں یہ راز فاش ہوا کہ زخمی پولیس مین مرد نہیں بلکہ دراصل ایک سن رسیدہ عورت ہے۔ اس نے اپنا نام فرنینڈو میکنزی (Feruan do anoenactaM) رکھا تھا اور اگرچہ اس نے عرصہ دراز تک پولیس کی ملازمت کی لیکن اس کا راز کسی طرح فاش نہ ہو سکا، یہ عورت سنہ ۱۸۳۶ء میں بمقام پیرس پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ انگریز اور ماں ہسپانوی تھی، اس نے اوائل عمر ہی سے مردانہ لباس اختیار کر لیا تھا اور فرانسیسی فوج میں بطور سپاہی ملازم ہو گئی تھی، مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد وہ ۳۵ سال کی عمر میں ہسپانیہ میں آکر رہنے لگی اور یہاں بھی اس نے جوڑ توڑ لگا کر محکمہ پولیس میں نوکری کر لی۔ میڈرڈ میں اس نے ایک عورت سے "شادی" کر لی۔ اس عورت کے پہلے خاوند سے ایک لڑکا بھی تھا جسے وہ ہمیشہ اپنا لڑکا بتایا کرتی تھی۔ میڈرڈ سے وہ اشبیلیہ تبدیل ہوئی جہاں وہ شہر کے گورنر کی خدمت میں بحیثیت باورچی اور اردلی تعینات کی گئی۔ اسی طرح وہ یکے بعد دیگرے سات گورنروں کی ماتحتی میں رہی لیکن جب اس کا راز فاش ہو گیا تو اسے ملازمت بغیر پنشن کے علیحدہ کر دیا گیا، دو سال پیشتر اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا جس کا جنازہ اس نے بہت دھوم دھام سے اٹھایا تھا۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں بمقام شکاگو، روسی قونصل کے معتمد خصوصی نکولس ڈی ریلان (Nicholas De Raylan) کا بعمر ۳۳ سال انتقال ہوگیا۔ تجہیز و تکفین کے وقت معلوم ہوا کہ وہ دراصل "عورت" ہے۔ وہ ہمیشہ مردانہ لباس پہنتی تھی امریکہ میں اس نے دو مرتبہ شادی کی لیکن پہلی "بیوی" نے دس برس کے بعد طلاق لے لی اور شکایت یہ کی کہ اس کا "شوہر" ظلم کرتا ہے اور تھیٹر کی ایکٹرسوں کی صحبت میں رہتا ہے۔ بعد ازاں اس نے ایک دوسری عورت سے جو تھیٹر میں ناچتی تھی "شادی" کی۔ یہ عورت اپنے "شوہر" کی بڑی وفادار و خدمت گزار تھی، دونوں بیویوں کو کامل یقین تھا کہ ان کا "شوہر" مرد کامل ہے۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں بمقام سینٹ لوئی (St: Louis) ایک بائیس ۲۲ سالہ نوجوان عورت کا راز فاش ہوا۔ جو نو سال تک مرد بنی رہی تھی۔ اس نے مردانہ بھیس میں مختلف جگہ محنت مزدوری کی، اصطبلوں میں سائیسی کی اور لوہار کے ہاں گھن چلایا۔ ایک مرتبہ اسے ایک آدمی نے متبنیٰ کر لیا جس کے چند لڑکیاں بھی تھیں اس نے ان لڑکیوں کو بھی دھوکا دیا اور خود کو مرد بتایا۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں وہ بمقام سینٹ لوئی آگئی اور ایک کارخانہ میں بید کی کرسیاں اور ٹوکریاں وغیرہ بنانے لگی۔ تمام کاریگروں سے مردوں کی طرح بے رجھک ملتی جلتی تھی، ایک خصوصیت اس میں اور بھی تھی یعنی وہ ہمیشہ مشکل کام کرنا پسند کرتی تھی اور سخت سے سخت محنت سے نہیں گھبراتی تھی۔ وہ مردوں کی طرح شراب پیتی، مردوں کی طرح گالی

بکتی، لڑکیوں سے محبت کرتی تھی، سگار کھیلاتی، مچھلیاں پکڑتی اور جب کبھی کوئی جھگڑا ہو جاتا تو آستینیں چڑھا کر لڑنے کو تیار ہو جاتی، اس کا جسم ورزشی ہو گیا تھا، فٹ بال وہ کھیلتی تھی، کرکٹ وہ کھیلتی تھی، اکھاڑہ میں کشتیاں وہ لڑتی تھی اور اچھے اچھے طاقتور پٹھوں کو پچھاڑ دیتی تھی۔

۱۹۱۲ء میں بمقام لندن ایک ۲۳ سالہ خادمہ ایکٹن (Acton) کی عدالت فوجداری میں پیش ہوئی، وہ ہمیشہ مردانہ لباس میں رہتی تھی، اور ایک دوسری خوبصورت عورت کے ساتھ جو اس سے کمسن تھی بحیثیت شوہر کے رہتی تھی لیکن عدالت نے دونوں عورتوں کو ان کے اعزہ کے سپرد کر دیا۔ بلکہ ان کے لیے نوکری کی بھی فکر کر دی اور چونکہ ان دونوں میں اس قدر محبت تھی کہ وہ ہرگز جدا نہ رہ سکتی تھیں۔ اس لیے مجبوراً دونوں کو ساتھ رہنے کی اجازت دے دی گئی۔

ایسی ہی ایک اور عورت کورا اینڈرسن (Cora Andarson) تھی۔ یہ عورت تیرہ برس تک مرد بنی رہی اور دو عورتوں کو بیوی کی حیثیت سے اپنے پاس رکھا۔

جزیرہ نمائے بلقان کی جنوبی سلافی قوم کی عورتوں میں استلذاذ بالمثل کا طریقہ عام طور پر رائج ہے لیکن سب سے زیادہ عام طریقہ وہ ہے جس میں ایک مصنوعی آلہ یا "صبورہ" سے کام لیا جاتا ہے مصنوعی آلہ کے استعمال کا طریقہ قدیم یونان میں بھی رائج تھا جیسا کہ ہیروڈاس (Heron das) نے بیان کیا ہے اور

سوئیداس (Suidas) کا قول ہے کہ اسکی ایجاد ملیطس (Miletus) کی عورتوں نے کی تھی اور ارسطوفانیس (Aristo Phanis) نے اپنی کتاب لائسسٹریٹہ (Lysistrata) میں لکھا ہے کہ مصنوعی آلہ بنانے کی خاص جگہ ملیطوس تھی ۔ یورپ میں بزمانہ قرون وسطیٰ بھی اس کا رواج موجود تھا چنانچہ بارھویں صدی میں شہر وارمس کے اسقف برچارڈ (Burchard) نے اس کا ذکر کیا ہے ۔ اسی طرح اٹھارھویں صدی کے اوائل میں مارغراطیہ لنکن (Marghanetha Lincelu) نے جرمنی میں اس کی مدد سے ایک عورت کے ساتھ شادی کی تھی ۔

سولھویں صدی میں فرانس کے اندر بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہوا تھا ۔ مقام شاموں (Shammoul) کی چھ سات لڑکیوں نے یہ ارادہ کیا کہ مردوں کا لباس پہنیں اور مردوں جیسے کام کریں ۔ ان میں سے ایک لڑکی مقام وتری (Vitry) پہنچی اور ایک لڑکی پر عاشق ہو کر اس سے شادی کر لی لیکن بدقسمتی سے شاموں کے ایک شخص نے اسے پہچان کر راز فاش کر دیا ۔ پکڑی گئی مقدمہ چلایا گیا اور عدالت نے پھانسی کی سزا دے دی [1]

(1) Moutaigues Journal Due Voy-ageen - Italian - 1850

استلذاذ بالوحوش

(ZOROASTRA)

استلذاذ بالوحوش کے متعلق سب سے پہلا تاریخی ثبوت مشہور و معروف یونانی مورخ و سیاح ہیرودوطس (Herodotus) کا بیان ہے جس نے منڈیس (Mendes) کے متعلق لکھا ہے کہ :-

" یہاں ایک مقدس بکرا ہے جس کی لوگ بیحد عزت و تکریم کرتے ہیں ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مقدس بکرا دراصل حقیقت پان دیوتا (Pan) کا اوتار ہے اور لطف یہ ہے کہ یہاں کی عورتیں اولاد حاصل کرنے کی خواہش میں اسکی مدد حاصل کرتی ہیں (۱) "

اسی طرح مصر قدیم کی عورتوں کے متعلق دولاری (Dulare) نے لکھا ہے :- (۲)

شت پتھو برہمن میں جس کا ترجمہ انگریزی "کتب مقدسہ مشرقیہ" کی

(1) Herodotus, Book II, Chapter, 46.

(2) Dulare (Des Divinities Gene-ral Rices, Chapter II)

جلد یازدہم صفحہ ۳۲۵ پر موجود ہے اور جس کا اقتباس بھی میکڈانلڈ ایم اے ڈی۔ڈی نے اپنی کتاب الموسوم بہ "ویدوں کے برہمن" صفحہ ۲۶ پر دیا ہے۔ حسب ذیل روایت لکھی ہے:-

"پہلے پرجاپتی اکیلا ہی تھا۔اس نے چاہا کہ دنیا کو پیدا کرے۔چنانچہ اس نے اگنی، دایو، آدتیہ وغیرہ دیوتاؤں کو پیدا کیا۔بعدازاں اس نے اپنے منھ کی پھونک سے گائے کو پیدا کیا۔اگنی دیوتا نے جب گائے کو دیکھا تو اس کا دل للچایا اور اس نے چاہا کہ میں اس گائے کے ساتھ التفات کروں۔چنانچہ وہ ایسا کر گزرا۔"

سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی مشہور کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں صفحہ ۳۲۴ پر تحریر فرمایا ہے:-

"سنتے ہیں کہ اس ملک میں گورکھپور کا ایک راجہ تھا۔پوپوں نے یگیہ کرایا اور اسکی پیاری رانی کا سماگم گھوڑے کے ساتھ کرایا جس سے وہ مرگئی۔"

قدیم خرافیات یونان میں بھی اس قسم کی اکثر روایات موجود ہیں جن میں کسی دیوی یا دیوتا کا بہ صورت انسان جانوروں سے حظ حاصل کرنا ثابت ہوتا ہے۔ان میں آدکر (Io) اور رساندڑ بیل اور لیڈا (Leda) اور ہنس کی روایات زیادہ مشہور رہیں۔

بائبل مقدس کے مطالعہ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اب سے چار پانچ

ہزار برس بیشتر ملک فلسطین اور قریب کے ممالک میں بھی استلذاذ بالوحوش کا شوق لوگوں میں موجود تھا، چنانچہ توریت میں ایسے شخص کے لیے حسب ذیل سزا مقرر ہے:۔

"جو کوئی چارپایہ کے ساتھ لیٹے گا وہ جان سے مار ڈالا جائے گا (خروج باب ۲۲ آیۃ ۱۹) اگر کوئی مرد کسی چوپایہ سے شہوانی لطف حاصل کریگا وہ جان سے مارا جائیگا اور جانور بھی ہلاک کیا جائیگا (Leviticus باب ۲۰ آیۃ ۱۵)

سیاحوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں قدیم باشندوں کے اندر اس کا شوق موجود تھا، متمدن دنیا میں یہ شوق عموماً دیہات میں پایا جاتا ہے جس کے اسباب حسب ذیل ہیں:۔

(۱) حیات انسانی کے متعلق قدیم خیالات جن میں انسان اور حیوان کے اندر کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

(۲) دیہاتیوں اور اُن کے جانوروں کا ہر وقت ساتھ رہنا۔

(۳) عورت کا میسر نہ آنا۔

(۴) بعض قدیم روایات جن کا مطلب یہ ہے کہ اس سے بعض بیماریوں کو شفا ہوتی ہے۔

بعض قدیم اور پست قوموں کا اعتقاد ہے کہ مرنے کے بعد بعض آدمی جانور اور بعض جانور آدمی بن جاتے ہیں۔ لہذا انسان اور جانوروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ اسی لیے جانوروں سے استلذاذ کوئی ذلت اور شرم کی بات نہیں ہے بعض لوگوں کا

خیال ہے کہ جانور درحقیقت آدمی ہی ہوتے ہیں صرف "چولا" بدلا ہوا ہے - مذہبی کھیلوں
تماشوں اور لیلاؤں میں بعض جانوروں کا روپ غالباً اسی خیال سے اختیار کیا جاتا ہے -

مختلف ممالک میں مختلف زمانوں کے اندر مختلف جانوروں کا ذکر پایا جاتا ہے -
لیکن زیادہ تر انھیں جانوروں کا نام آتا ہے جو گھروں میں پالے جاتے ہیں - مثلاً گائے
گھوڑی، بھینس، بھیڑ، بکری، گدھی وغیرہ - بعض حالات میں کتوں، بلیوں،
خرگوشوں، لطخوں اور راج ہنسوں کا بھی نام لیا جاتا ہے - قدیم رومی عورتوں کی
نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بعض اوقات اس کام کے لیے سانپ پالتی تھیں، اسی
سلسلہ میں ریچھوں، بندروں، حتیٰ کہ مگرمچھوں کا نام بھی لیا جاتا ہے -

ڈاکٹر کوچر (Kocher) کا بیان ہے کہ عرب میں بھیڑوں، بکریوں،
اور گھوڑیوں سے استلذاذ کا رواج پایا جاتا ہے اور فرانسیسی ڈاکٹر مونڈیری
(Mondiere) کا بیان ہے کہ انام میں سوریا اور کتوں سے کام لیا جاتا
ہے اور جزیرہ سیلون کی سنگھالی قوم میں بکریوں اور گائے سے -

اس سلسلہ میں مسٹر ہاورڈ، ڈاکٹر جی - ایف - لڈسٹن، ڈاکٹر کرافٹ
ایبنگ اور ڈاکٹر مول نے عجیب و غریب واقعات درج کیے ہیں جن کا ذکر کرنا
اس جگہ ہم مناسب نہیں سمجھتے -

دیہاتیوں میں استلذاذ بالوحوش کا شوق محض اس سبب سے نہیں ہے کہ انکی
طبیعت میں نفاست نہیں ہوتی یا انھیں عورتیں میسر نہیں آتیں بلکہ سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ

ہر وقت جانوروں میں بستے ہیں اور خود بھی رفتہ رفتہ حیوان بن جاتے ہیں۔

مرابو (Mirabeau) نے قوم باسق (Basque) کے پادریوں سے اٹھارویں صدی میں معلوم کیا تھا کہ کوہستان پیری نیز کے تمام گڈریئے اپنی بھیڑ، بکریوں سے لذت اندوز ہوتے تھے۔ یہی حالت اطالیہ میں بھی ہے۔ جنوبی اطالیہ اور جزیرہ صقلیہ (Sicily) کے چرواہوں، گڈریوں اور کسانوں کے یہاں تو یہ شغل ایک قومی رواج یا دستور بن گیا ہے۔ شمالی یورپ میں بجائے بھیڑ بکری اور گائے وغیرہ کے ہرنی کام دیتی ہے۔

مانٹی گازہ (Mante Gazza) نے اپنی کتاب (Amoridegli Uomini) کے باب پنجم میں لکھا ہے کہ :-

"مقام رمینی (Rimini) میں انکی ملاقات کوہستان پیری نیز کے ایک گڈریئے سے ہوئی جو بری طرح ضعف اعصاب میں مبتلا تھا اس نے بتایا کہ اس تکلیف کا باعث صرف یہی شوق تھا۔"

گسینٹ (Guttceet) نے کتاب ("Dreissigg Ah sparscis") کے صفحہ ۲۱۰ پر لکھا ہے کہ :-

"بعض روسی افسروں نے جو سنہ ۱۸۲۸ع کی جنگ روم و روس میں شریک تھے اپنے اس فعل کا اعتراف کیا۔ پھر جس طرح بعض مردوں میں یہ ذوق پایا جاتا ہے اسی طرح بعض عورتیں بھی اس میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔"

چنانچہ ڈاکٹر بلاخ نے لکھا ہے کہ بعض قحبہ خانوں میں پیشہ ور عورتیں اس قسم کے تماشے لوگوں کو دکھاتی ہیں۔ ماسچکا (Moschatta) نے بھی بیان کیا ہے کہ انھوں نے پیرس میں ایک عورت کو دیکھا تھا جو لوگوں سے فیس لیکر یہ تماشہ دکھایا کرتی تھی۔

ڈاکٹر روشہ (Rossa) نے واشنگٹن کی ایک ناکتخدا جوان عورت کا حال بیان کیا ہے جو اس شوق کی بدولت آخر مر گئی۔

ان ہی ڈاکٹر روشہ (Rossa) نے ورجینا میڈیکل منتھلی (Virginia Medical monthly) بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۸۸۲ء کے صفحہ ۳۷۹ پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ یورپ میں ایک عورت اس طرح تماشہ دکھایا کرتی تھی۔

ڈاکٹر کراؤش (Krausso) نے لکھا ہے کہ :-

"ملک بوسنیہ (Bosnia) کی عورتوں میں بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے اور اگر وہ خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتے تو انھیں ہرگز یقین نہ آتا۔"

شکاگو کے ڈاکٹر کیرنان (Keirnan) نے بھی اپنے ایک پرائیوٹ خط میں ڈاکٹر روشہ کے بیانات کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ :-

"جو حالت ڈاکٹر روشہ نے سان فرانسسکو کی لکھی ہے وہ قریب قریب ہر بڑے شہر میں پائی جاتی ہے۔"

مسوری (Missouri) واقع امریکہ میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان لڑکی

علاج کے لیے آئی اور جب اسکے جسم کو پچکاری لگا کر دھویا گیا تو معلوم ہوا کہ اندر تین جگہ زخم ہیں جو اس شوق کی بدولت پیدا ہو گئے تھے۔

ملک برازیل میں دریائے امیزان کے قریب کیسٹلناڈ (Castelnau۔) سیّاح نے ایک عورت کے دروازے پر بہت بڑا بندر بندھا دیکھا سیّاح مذکور کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے خرید لینا چاہا۔ چنانچہ اس کے متعلق سیّاح نے ایک دوسری عورت سے جو وہاں موجود تھی بہت بڑی رقم کے بالعوض سودا کرنا چاہا۔ یہ سن کر وہ عورت ہنسی اور کہا کہ :-

"آپ کی کوشش فضول ہے کیونکہ یہ بندر اس عورت کا "شوہر" ہے۔

علاوہ ازیں بعض لوگوں میں استلذاذ کی عجیب غریب عادتیں پڑ جاتی ہیں۔ مثلاً بعض کو یہ شوق ہوتا ہے کہ وہ جانوروں کی خوش فعلیوں اور مستیوں سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ استمنا بالید پر مجبور ہو جاتے ہیں بعض ایسے ہوتے ہیں جنھیں جانوروں کا جسم چھیڑنے میں لطف آتا ہے۔ ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب "اروٹک سمبلزم" (Erotic Symbolism) میں اسی قسم کے چند واقعات لکھے ہیں۔

ایک واقعہ اس کو کسی پادری نے لکھ کر بھیجا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے :-

"آئرلینڈ میں میرے والد کا مکان وہاں کے پادری کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں میری عمر بیس سال کی تھی اور میری طبیعت پر ہر وقت مذہب کا رعب غالب تھا، پادری کی دو بیٹیاں تھیں اور دونوں لڑکیوں

کی پرورش نہایت سخت مذہبی فضا میں ہوئی تھی، دونوں مکانوں کے
اصطبل ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے لیکن درمیان میں ایک دروازہ
تھا جس میں تختے جڑ دیئے گئے تھے۔ ایک رات مجھے باغبانی کا ایک اوزار
لانے کے لیے اصطبل میں جانے کی ضرورت پڑی۔ میں نے پادری صاحب
کے اصطبل کا دروازہ کھلا پایا اور درمیانی تختوں کی درز سے روشنی
نظر آئی۔ میں حیران ہوا کہ اس وقت اصطبل میں کون شخص آیا ہے لہذا میں نے
جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ پادری صاحب کی ایک صاحبزادی گھوڑی
کے جسم کو چھو رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی دہنی آستین چڑھائی اور
کہنی تک اپنا ہاتھ آلودہ کر لیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس لڑکی کو اپنی اس عجیب
غریب حرکت سے بے حد لطف آ رہا ہے اور فرط لذت سے بار بار اپنے ہونٹ چبا رہی ہے
لڑکی کا یہ واقعہ دیکھ کر مجھے بھی اس کا شوق پیدا ہوا اور میں نے بھی بارہا یہ عمل کیا۔"
ڈاکٹر نیک (Naicht) نے بھی "Psychiatrischeen Neu
rologisch Bladen" ۲ مطبوعہ سنہ ۱۸۹۹ء میں ایسے ہی ایک شخص کا
حال لکھا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر گلیرو (Guillereau) نے (Journal De
Medicine Veterinairect De Zoo Technie)
بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۸۹۹ء میں ایک لڑکے کا حال لکھا ہے جو یہی عمل گایوں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔
آبرے (Aubray) نے لکھا ہے کہ سر فلپ سڈنی کی بہن کاؤنٹس

پمبرڈک نے لذت اندوزی کا عجیب طریقہ نکالا تھا، یہ عورت حد درجہ کی شہوت پرست تھی اور دریچہ میں بیٹھ کر گھوڑوں کی مستی کا تماشہ دیکھا کرتی تھی۔

اسی طرح برچارڈ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ پوپ الگزینڈر ششم اور انکی صاحبزادی لکریزیا (Lucrezia) دونوں اس قسم کے تماشے دیکھا کرتے تھے۔ بلٹروڈ اور مرسیر (Balltrud & Mercier) نے ایک مضمون بعنوان (Perversion De Instinct Genisique) مجلہ "صحت عامہ" (Annales d' Hygiene Publique) بابتہ ماہ جون سنہ ۱۹۰۳ء میں ایک نوجوان شخص کا حال لکھا ہے جو گورکن تھا، یہ اس بات کا عادی تھا کہ جوان لڑکیوں و عورتوں کی لاش نکال کر ان سے آلودہ ہوتا تھا۔

استلذاذ بالوحوش کا فعل دنیا کی مہذب سائٹی میں ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ہر زمانہ، ہر قوم اور ہر ملک میں اس کے لیے سزا مقرر رہی ہے بعض اوقات تو صرف سزائے جرمانہ دے کر مجرم چھوڑ دیا گیا اور بعض اوقات مجرم اور جانور دونوں کو زندہ جلا دیا گیا قرون وسطی میں بھی یورپ کے اندر یہ شوق بکثرت پایا جاتا تھا جسکا ثبوت یہ ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی کے مسیحی مبلغین و واعظین اپنے خطبات میں ہمیشہ اس فعل مکروہ کی برائیوں پر زور دیتے تھے۔ دین مسیحی کی کتاب الکفارہ میں اس کے لیے تعزیرات موجود ہیں۔

کتاب الکفارہ ایگبرٹ (Egbert's Penistentials) میں جو نویں و دسویں صدی کی چیز ہے۔ استلذاذ بالوحوش کے لیے دو سال سے لیکر دس سال تک کی سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔

اسی زمانہ کی ایک اور کتاب الکفارہ کتھیوڈور میں ایسے لوگوں کے لیے دس برس کی سزا مقرر تھی۔

"پینی ٹینشل سوڈو رومانم" (Penitentiale Peseupo Romanum-) کی رو سے ایک سال کی سزا معقول خیال کی گئی تھی اور اگر ملزم کے بیوی ہوتی تھی تو رحم کھا کر اس کی سزا نصف کر دی جاتی تھی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اتنی ہی سزا کسی بیوہ عورت یا دوشیزہ سے مباشرت ہونے پر بھی دی جاتی تھی، گویا ان کے نزدیک دوشیزہ، بیوہ اور جانور ایک ہی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح فلبرٹ (Fullbert) کی کتاب الکفارہ میں استلذاذ بالوحوش کے لیے دس سال کی سزا مقرر تھی۔

قرون وسطیٰ کے یورپ خصوصاً فرانس میں اس کے لیے یہی سزا مقرر تھی جو شریعت موسوی میں تجویز کی گئی تھی یعنی دونوں کو زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ شہر طولوز (Toulouse) میں ایک عورت اور کتا دونوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

علاوہ ازیں قرون وسطیٰ میں جب پادری لوگ اپنے معتقدین سے ہفتہ کے روز اقرار معصیت لینے بیٹھتے تھے تو تمام یورپ خصوصاً جنوبی اطالیہ، فرانس اور جرمنی میں کسانوں اور مویشی پالنے والوں سے یہ بات خصوصیت کے ساتھ دریافت کی جاتی تھی کہ وہ اس ہفتہ میں اپنی گائے، گھوڑی، بھیڑ، بکری، گدھی اور سوریا سے تو آلودہ نہیں ہوئے۔ کیتھولک ممالک میں یہ دستور آج تک چلا آتا ہے۔

استلذاذ بالنفس!

Auto-Erotism

استلذاذ بالنفس جانوروں میں کہتے ہیں کہ استلذاذ بالنفس کا طریقہ بھی انسان نے جانوروں ہی سے سیکھا ہے۔ جانوروں میں خصوصاً بحالت اسیری جبکہ انھیں خواہش نفسانی پوری کرنے کے لیے مادہ نہیں ملتی تو استلذاذ بالنفس کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔

ہیولاک ایلیس نے اپنی کتاب "ماڈسٹی اینڈ آٹو اِرٹوزم" وغیرہ (Modesty Auto - Erotismetc.) میں لکھا ہے کہ ملک ویلز کے ٹٹو اس حالت میں اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور سخت ہیجان کا اظہار کرتے ہیں۔

مخصوص موسم میں بارہ سنگھے بھی مستی کے عالم میں اپنا بدن کسی چکنے درخت سے رگڑنے لگتے ہیں، اسی طرح بھیڑیں اور اونٹنیاں بھی اپنا بدن رگڑ رگڑ کر لذت حاصل کرتی ہیں۔ ہاتھی کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ مست ہوتا ہے تو وہ اپنی پچھلی ٹانگیں سکوڑ کر اپنی بیتابی کا اظہار کرتا ہے۔ یہی مشاہدہ ٹیو منباخ (Blumenbatch) کا ریچھ کے متعلق بھی ہے اور پلاش و بارٹل نے بجوؤں کو بھی

اسی عالم میں دیکھا ہے اور بہ زرخصوصیت کے ساتھ اس میں مبتلا پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مول (Moll) نے اپنی کتاب "Libido Sexualis" میں لکھا ہے کہ بعض طوطے جب قفس میں بند ہوتے ہیں تو وہ اپنے جسم کا پچھلا حصّہ کسی چیز سے رگڑ کر لذّت حاصل کرتے ہیں۔

استلذاذ بالنفس انسانوں میں عالم انسانی میں اس کا شوق صرف مہذب متمدن دنیا تک محدود نہیں ہے، بلکہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں یہ کسی نہ کسی صورت میں نہ پایا جاتا ہو اور اسکے لیے کوئی نہ کوئی اصطلاح مقرر نہ ہو۔

آسٹریلیا کے قدیم باشندوں خصوصاً نیو ساؤتھ ویلز کے رہنے والوں میں یہ شوق زیادہ پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر راتھ (Roth) کا بیان ہے کہ شمالی کوئنسلینڈ (North Queensland) اور دیگر علاقوں کے مرد جب وہ گھر سے دور ہوتے ہیں ایسا کرنا معیوب نہیں جانتے۔

ڈاکٹر نارتھ کوٹ کا بیان ہے کہ نیوزیلینڈ کی ماوری اور رارو ٹونگا (Maori & Rarotonga) اقوام میں یہ شوق نہیں ہے۔ بلکہ جزیرہ کوک (Cook Island) کے باشندے اور دیگر جزائر قرب جوار کی قومیں اس کو "خلاف مردی" سمجھتی ہیں اور ان لوگوں میں اس کے متعلق ایک طنزیہ جملہ بولا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "مرد کا خود کو عورت بنا لینا"۔

افریقہ کی ہاٹنٹوٹ (Hotentots) نسل کی ناما (Nama) قوم

میں نوجوان عورتوں کے اندر یہ شوق اس قدر عام ہے کہ علانیہ اس کو پورا کرلیتی ہیں۔ بلکہ ان لوگوں کی کہانیوں اور قدیم روایتوں میں اس کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے گویا کہ وہ حوادثِ زندگی کی نہایت معمولی بات ہے۔ یہی حال قوم بسوتو اور کافر (Basuto & Kaffirs) کا ہے۔

جب اہلِ ہسپانیہ جزائر فلپائن کے مقام وزکایا (Vizcaya) میں پہنچے تو انھوں نے وہاں کے تمام مردوزن میں عام طور پر اس کا رواج دیکھا۔ جزیرہ بالی (Bali) کے متعلق جیکب سیاح نے لکھا ہے کہ اس جزیرہ میں یہ شوق عام ہے۔ ڈاکٹر ایرام (Eram) کا بیان ہے کہ ممالک مشرق کی نوجوان عورتوں میں اس کا شوق دیکھا گیا ہے اور حسب بیان ڈاکٹر سونینی (Son noni) مصر میں تو یہ شوق فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔

ہندوستان قدیم میں بھی اس کے رواج کا پتہ یوں چلتا ہے کہ بعض عمارتوں کی دیواروں پر اُبھری ہوئی تصویریں بنی ہوئی ہیں جن میں عورتیں اور مرد اس شغل میں مصروف نظر آتے ہیں۔

جزیرہ سیلان کی تامل قوم میں بھی یہ شوق بکثرت موجود ہے اور ماچین میں یہ شغل صرف شادی شدہ عورتیں کرتی ہیں۔

لیکن جاپان کی عورتوں نے اس فن کو بدرجہ کمال پہنچا دیا ہے۔ یہ عورتیں پیتل کی باریک چادر کی دو خالی گیندیں بناتی ہیں۔ جو قدوقامت میں

کبوتر کے انڈے کے برابر ہوتی ہیں۔ ایک گیند بالکل خالی رکھی جاتی ہے اور دوسری گیند میں سیسہ کی گولی یا پارہ بھر کر اس کا منھ بند کر دیا جاتا ہے پہلے وہ خالی گیند اندرون جسم تک پہنچادی جاتی ہے پھر وہ پارہ والی گیند داخل کی جاتی ہے اور اس کے بعد ڈاٹ لگا کر دونوں کو حرکت دی جاتی ہے ان دونوں گیندوں کا نام جاپانی اصطلاح میں "رین۔ نو۔ تامہ" (Rin-No-Tama) ہے۔ ڈاکٹر جوئسٹ (Joest) کا بیان ہے کہ اگرچہ جاپان کی تمام عورتیں اس آلہ سے آگاہ ہیں لیکن پیشہ ور عورتوں میں خصوصیت کے ساتھ اس کا رواج زیادہ ہے۔ جاپان کی عورتیں ایک اور مصنوعی آلہ بھی استعمال کرتی ہیں۔ جسے ان کی اصطلاح میں "انیگی" (Engi) کہتے ہیں۔

استلذاذ بالنفس کی قدیم تاریخ

بابل و آشوریہ کے قدیم کھنڈر میں جو سنگین محلات اور مندر دریافت ہوئے ہیں ان پر صبورہ کی تصویریں پائی جاتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ متمدن دنیا میں اس کا شوق تقریباً پانچ چھ ہزار برس قبل مسیح موجود تھا۔ ان مذہبی کتب میں جو الہامی ہونے کی دعویدار ہیں۔ صبورہ کی طرف (مثلاً صحیفہ حزقی ایل) اشارہ کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو صحیفہ مذکور باب ۱۶ آیتہ ۱۷)

"نیز تو نے وہ زیور جو میرے دیے ہوئے سونے اور چاندی کے بنے ہوئے تھے لے لیے اور تو اس مردوں کے بت بناتی ہے اور ان سے مباشرت کرتی ہے۔"

برٹش میوزیم میں ایک قدیم یونانی گلدان موجود ہے جس پر ایک قدیم یونانی کسبی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہ عورت اپنے ہاتھ میں صبورہ لیے بیٹھی ہے اسی قسم کا ایک دوسرا قدیمی گلدان ہے جو شہر پومپیائی کے کھنڈرات سے برآمد ہوا تھا۔ یہ گلدان شہر نیپلز کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔

یورپ کے اندر قرون وسطیٰ میں یہ شغل عام طور پر پایا جاتا تھا کیونکہ پادری لوگ اس کے خلاف مسلسل وعظ کہا کرتے تھے اور پندرھویں صدی میں تو صبورہ کا ذکر کھلم کھلا اور پوری تفصیل کے ساتھ ہونے لگا تھا سولھویں صدی میں مشہور ناول نویس فورٹینی (Forteni) نے بھی اپنی کتاب (Novelle Die Nouze) میں ''اس آلہ بلورین'' کا ذکر کیا ہے جس کا استعمال زنان کلیسہ کیا کرتی تھیں۔

انگلستان میں بھی بعہد ملکہ الزبیتھ مصنوعی آلات سے کام لیا جاتا تھا، چنانچہ مارسٹن (Marsten) نے لکھا ہے کہ کس طرح لوسیا (Lucea) اپنے شوہر کے نرم و گرم بستر پر ایک آلہ بلورین کو ترجیح دیتی تھی۔

اس مصنوعی آلہ کو ہندوستان میں صبورہ کہتے ہیں۔ قدیم یونانی عورتوں میں اس کا نام اولسبوس (Olisbus) تھا۔ لاطینی زبان میں اس کا نام فلس (Phallus) پاسینم (Pascinum) ہے۔ فرانسیسی زبان میں اسے گادمیشہ (Godemicha) کہتے ہیں اور جرمنی میں

سمتھاؤسے (Samthause) اطالوی زبان میں اس کا نام پاستا ٹیمپو اور ڈیلیٹو (Pana a Tempa & Dilleto) ہے۔ موخرالذکر سے انگریزی اصطلاح ڈلڈو (Dildo) نکلی ہے۔ مردوں کے لیے جو مصنوعی چیز بنائی جاتی ہے اسے انگریزی اصطلاح میں مرکن (Merkin) کہتے ہیں۔

اٹھارویں صدی میں بقول دوہرن (Duhren) جرمنی کی امرا زادیوں میں اس کا خاص شوق پایا جاتا تھا اور اسی زمانہ میں انگلستان کے اندر بھی ڈلڈو (Dildo) کا استعمال عام ہو گیا تھا۔ آر چھولز (Archenholtz) کا بیان ہے کہ اگرچہ اس زمانہ میں پیرس کے اندر مصنوعی آلات کی فروخت مخفی طور پر ہوتی تھی لیکن لندن میں ایک عورت مسز فلپس اپنی دوکان میں جو بمقام جوک لیسٹر واقع تھی ان کی تجارت کھلم کھلا بہت وسیع پیمانہ پر کیا کرتی تھی۔ ۱۸۳۵ء میں جان بی (John Bee) نے لکھا ہے کہ انگریزی میں اس کا نام اول "دلدول" تھا۔

اٹھارویں صدی میں فرانس میں ایک بہت بڑی آبرو باختہ عورت مادام گوردان (Gourdan) تھی جو ان آلات کی وسیع پیمانہ پر تجارت کرتی تھی۔ ان دنوں فرانسیسی زبان میں اس کو "کنسولیٹر" (Consolateurs) یعنی "تسکین دینے والا" کہتے تھے۔ ہندوستان میں غالباً

اسی فرانسیسی "کنسولیٹیر" کا ترجمہ "صبورہ" کیا ہے۔ ڈاکٹر ڈوہرتن (Duhrsen) نے اسی مادام گوردان گوردان کی نسبت تحریر کیا ہے کہ جب یہ عورت مرگئی تو خانقاہوں کی راہبہ عورتوں اور کلیسہ کی کنواریوں کے بے شمار خطوط اس کے مکان سے برآمد ہوئے جن میں انھوں نے "صبورے" طلب کیے تھے۔

مسیحی دنیا کی طرح ممالک اسلامیہ میں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے اور ترکی عورتیں اس کا استعمال کرتی ہیں۔ ڈاکٹر بامن (Baumann) کا قول ہے کہ زنجبار کی حرم سراؤں میں پردہ نشین عورتیں اسکا استعمال بکثرت کرتی ہیں۔

ڈاکٹر بی راسٹرن (B. Stern) نے اپنی کتاب (Modi Gimin Der Turkei) میں لکھا ہے کہ ترکی اور مصر کی عورتیں بعض اوقات کیلے اور کھیرے بھی استعمال کرتی ہیں۔ عہد عباسیہ کے تمدن و تہذیب کے متعلق الف لیلہ سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے اس میں "نوادر فرنگی" کا ایک قصہ ہے جس کے اندر ایک نظم بھی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:-

"اے کیلے! ملائم اور چکنی جلد والے کیلے! اسے دیکھ کر جوان عورتوں کی آنکھیں پھیل جاتی ہیں .... اے کیلے! تمام پھلوں میں تو ہی ایک ایسا پھل ہے جس کا دل نرم اور ہمدرد ہے اے کیلے! تو ہی بیوہ اور مطلقہ عورتوں کو تسکین دیتا ہے۔"

اسی طرح جزائر ہوائی (Hawaii) کے علم الاصنام میں بعض

روایتیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بیویوں نے کیلے سے کام لیا۔

صرف کیلے ہی پر منحصر نہیں بلکہ کھیروں، گاجروں، بیگنوں، مولیوں سے بھی کام نکالا گیا ہے اور بعض نے پنسلیں، مُہر لگانے کی لاکھ کی بتی، سوت کی ریل، بالوں کی سلائیاں، بُننے کی سلائیاں، بوتلوں کی ڈاٹیں، موم بتیاں وغیرہ بھی استعمال کی ہیں۔

ڈاکٹر میرابو (Mirabeau) نے اپنی کتاب اروٹیکا ببلیون (Erotika Biblion) میں ان چیزوں کی بہت بڑی فہرست دی ہے جنہیں کلیسا کی "اچھوتیاں" استعمال کیا کرتی تھیں۔

سوئٹزرلینڈ کے پروفیسر ریورڈین (Reverden) نے چار عورتوں کا حال بیان کیا ہے جنہوں نے اس کا اقرار کیا۔ ان میں ایک عورت جس کی عمر ۲۲ سال تھی ایک مدرس کی بیوی تھی۔ اس عورت نے بلاپس وپیش اور بغیر شرم ولحاظ کے اپنے شوہر کے بالمواجہہ اقرار کیا کہ وہ بالوں میں لگانے کی سلائی سے عادتاً لطف حاصل کر لیتی تھی، دوسری عورت ۴۲ سال کی ایک مجرد عورت تھی جو ایک ڈاکٹر کے یہاں ملازم تھی اس کا بھی مشغلہ یہی تھا تیسری عورت ایک سترہ سالہ انگریز لڑکی تھی اور چوتھی ایک دوازدہ سالہ لڑکی جس نے اس کا اعتراف کیا۔

بعض عورتوں کو اس کی ایسی بُری عادت پڑ جاتی ہے کہ بغیر اس کے انھیں تسکین ہی نہیں ہوتی، ڈاکٹر مول (Moll) نے ایک ۲۸ سالہ مصورہ کا

حال بیان کیا ہے کہ باوجود صاحب شوہر ہونے کے وہ اسکی عادی تھی۔

اسی طرح ڈاکٹر ہاورڈ (Howard) نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایک عورت کا حال لکھا ہے جو نہایت ہی بے اختیارانہ طور پر اس عمل کو جاری رکھتی تھی۔

بعض اوقات بچوں میں ہیجان شہوانی پیدا کرنے کی عجیب عادت ہو جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ کرسی کے کنارہ یا کسی اور فرنیچر سے سحق کر کے لطف حاصل کرتی ہیں۔ ڈاکٹر آر۔ ٹی۔ مارلیس (Morris) ساکن نیویارک کا بیان ہے کہ:-

"میری ایک مریضہ خیالات کے لحاظ سے نہایت مذہبی واقع ہوئی ہے اسے گرجا جانے کا بہت شوق ہے۔ لیکن باایں ہمہ وہ ہر روز صبح کو یہ فعل کرتی ہے اور آئینہ کے سامنے خود سے بیٹھ کر"

ڈاکٹر گیسٹ (Guttceit) نے روس کے متعلق لکھا ہے کہ یہاں کی اکثر عورتیں اپنے پیراہن کے گلے دامن میں گرہ باندھ لیتی ہیں اور اسی سے لطف حاصل کرتی ہیں۔ انہی ڈاکٹر صاحب نے ایک روسی عورت کی نسبت لکھا ہے کہ وہ اپنے پاؤں کی ایڑی برہنہ کر کے اس پر بیٹھ جاتی ہے۔

بعض لڑکیاں چکر کے جھولے میں لکڑی کے گھوڑوں پر اس شوق کی وجہ سے بیٹھتی ہیں اور بعض کو سائیکل کی سواری بھی یہی لطف دیتی ہے۔

ایک فرانسیسی ڈاکٹر پوسلے (Poullet) لکھتے ہیں کہ:-

"میں ایک مرتبہ کسی فوجی درزی خانہ میں گیا۔ جہاں تقریباً تینتیس مشینیں چل رہی تھیں۔ جن کی آواز تقریباً یکساں تھی لیکن اسی اثناء میں دفعتاً میری توجہ ایک مشین کی طرف ہوئی جو بمقابلہ دیگر مشینوں کے زیادہ تیزی سے چل رہی تھی۔ مشین پر کام کرنے والی سنہرے بالوں والی ایک سرخ و سفید لڑکی تھی جس کی عمر تقریباً اٹھارہ یا بیس برس کی ہوگی عین اسی حالت میں جبکہ وہ مشین پر پتلون سی رہی تھی، اچانک اس کا چہرہ دمکنے لگا منہ کا دہانہ کسی قدر کھل گیا، ناک کے نتھنے پھول گئے۔ اور اس کے پاؤں مشین کے پائدان پر تیزی سے چلنے لگے عین اسی حالت میں میں نے اسکی آنکھوں میں کسی قدر تشنج دیکھا، اس کی پلکیں جھک گئیں۔ چہرہ اس قدر زرد ہوگیا گویا مُردنی چھا گئی ہے اور پیچھے کی طرف کرسی کے تکیہ کا سہارا لے کر لیٹ گئی، اسکے ہاتھوں اور پاؤں نے اپنا کام چھوڑ دیا اس نے انگڑائی لے کر ٹانگیں پھیلا لیں۔ گلے سے خفیف سی آواز اور پھر ایک آہ سرد پیدا ہوئی جو گرد و نواح کے شور و غل میں گم ہو گئی۔ چند منٹ تک وہ لڑکی بے حس و حرکت رہی۔ پھر اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا، چہرہ کا پسینہ پونچھا اور پھر اپنے ساتھ کام کرنے والیوں کی طرف کسی قدر شرمائی اور لجائی ہوئی نیچی آنکھیں ڈال کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

ڈاکٹر ویڈلر (Vedler) جنھیں ممالک سویڈن اور ناروے کا بہت بڑا تجربہ ہے بیان کرتے ہیں کہ یہاں کی عورتیں دونوں رانوں کی رگڑ سے پوری کیفیت حاصل کر لیتی ہیں۔

ہیولاک ایلیس ایک مرتبہ کا ذکر کرتے ہیں کہ:۔

"ایک روز میں کسی اسٹیشن پر ٹرین کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک دُور کی نشست پر جو بالکل تنہائی میں تھی ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ نشست کے سہارے لیٹی ہوئی تھی اور اس کا ایک پاؤں جلد جلد اور مسلسل طور پر ہل رہا تھا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک مسلسل یہی حرکت کرتی رہی۔ رفتہ رفتہ اس کی اس حرکت میں شدت پیدا ہوئی، اس نے اپنا بدن کسی قدر اور سیدھا کیا اور ٹانگیں کسی قدر اکڑا کر اپنا جسم تپائی کے سر سے ملا لیا، بعد ازاں دو تین جھٹکے کھائے اور ڈھیلی پڑ گئی۔ چند منٹ بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور خراماں خراماں ڈیننگ روم میں جا کر دیگر مسافروں کے پاس پاس جا بیٹھی۔ اس وقت اس کا چہرہ اترا ہوا تھا"

الغرض اس کا شوق متمدن دنیا میں آج کل اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ غالباً کوئی متنفس اس سے خالی نہ رہا ہوگا۔ جرمنی کے مشہور ڈاکٹر برجر (Berger) نے اپنی کتاب وورلے سنجن (Vorlesungen) میں تحریر کیا ہے کہ:۔

"فی زمانا ۹۹ فی صدی نوجوان مرد اور لڑکیاں وقتاً فوقتاً استلذاذ

بالنفس کر لیا کرتے ہیں۔"

ہرمان کوہن (Herman Chohun) کا قول ہے کہ اس قول کا ملک جرمنی پر بالکل صحیح اطلاق ہوتا ہے۔ روہیلڈر (Rohelder) کے نزدیک ایسے لوگوں کی تعداد ۹۵ فی صدی ہے اور جولین مارکیوز کے نزدیک ایسے لوگوں کی تعداد ۹۲ فی صدی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ڈیوکس (Dukes) کا قول ہے کہ اسکول کے لڑکوں میں ۹۵ فیصدی تعداد ایسے ہی لڑکوں کی ہے۔ ڈاکٹر موریگلیا (Moraglia) نے اطالیہ میں دو سو ادنیٰ طبقہ کی عورتوں کی تحقیقات کی۔ ان میں سے ایک سو بیس عورتوں نے اقرار کیا کہ وہ ایسا کرتی ہیں یا کسی زمانہ میں ایسا کر چکی ہیں۔

ڈاکٹر ارنسٹ (Ernst) کا قول ہے کہ ملک وینی زولا (Vene Zuela) کی ہسپانوی نژاد دوغلی آبادی میں ہر طبقہ کے لڑکے اور لڑکیاں اس کی عادی ہیں۔

فرانس میں ایک پادری صاحب نے ڈاکٹر ڈبرین (Dubreyen) کو بتایا کہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جو ہفتہ بھر بعد اقرار معصیت کرنے آتی ہیں ان میں منجملہ بارہ لڑکیوں کے گیارہ ایسی ہوتی ہیں جنھیں اس کا شوق ہے۔

پیروشیا کے ایک تادیب خانہ کے ایک میڈیکل افسر نے روہیلڈر (Rohleder) سے بیان کیا کہ یہاں کے تمام لوگ جو سن بلوغ تک پہنچ گئے ہیں اس علت میں مبتلا ہیں۔ اسی طرح اسٹیل ہال کا بیان ہے کہ

امریکہ کے ایک تادیب خانہ میں ہر شخص بلا استثناء اس کا عادی ہے۔

استلذاذ بالادویہ | ڈاکٹر ریورڈین (Reverdan) کا بیان ہے کہ ملک فرانس کے اضلاع آئین و کوٹ ڈا اور (Ain - E - Côte dor) میں یہ بات غیر معمولی نہیں ہے کہ نوجوان لڑکیاں اپنے جسم میں ایک بوٹی کے پتے مل لیتی ہیں جسے علمی زبان میں "لناریہ سیمبالیریا" (Linaria Cymbal) اور عام طور "پنٹین" (Pinton) یا "ٹمبارڈے" (Cimbarde) کہتے ہیں۔ اس سے ہلکی سی سوزش پیدا ہو کر لطف پیدا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ڈوہرن (Dührren) نے اپنی کتاب Geschte Chiste - Len - in - England جلد دوم صفحہ ۲۹۲ میں انگلستان کی عورتوں کی نسبت لکھا ہے کہ نوجوان لڑکیاں اکثر بچھو بوٹی کی پتی مل لیتی ہیں جس سے خفیف سی سوزش پیدا ہو جاتی ہے اور مجبوراً سوزش رفع کرنے کے لیے اس جگہ کو ملنا پڑتا ہے۔

ممالک مشرق خصوصاً ایران و ہندوستان میں اس غرض کے لیے عطر گلاب اور عاقر قرحا وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے اس سے ایک قسم کی سوزش پیدا ہو کر تحریک ہوتی ہے اور لذت میں اضافہ ہو جاتا ہے بعض عورتیں صبورہ یہ سہاگہ اور شہد کا ضماد کر لیتی ہیں۔

استلذاذ بالخیال | بعض لوگ کسی قسم کے مصنوعی آلہ سے کام

نہیں لیتے۔ نہ وہ اپنے اعضاء کو کسی قسم کی رگڑ یا سوزش پہنچاتے ہیں بلکہ وہ عالم تصور میں خیالی طور پر پورا لطف حاصل کر لیتے ہیں۔

نائسفورو (Niciforo) نے ایک اطالوی لڑکی کا حال بیان کیا ہے جس کی عمر ۱۷ سال کی تھی اور جو ایک کارخانہ میں کام کیا کرتی تھی۔ اس چھوٹی سی لڑکی کو استلذاذ بالخیال میں اس قدر کمال حاصل ہو گیا تھا کہ وہ کارخانہ کے اندر سب لوگوں کے سامنے دن بھر میں تین چار مرتبہ اس طرح لطف حاصل کر لیا کرتی تھی۔

شرنک نوٹزنگ (Schrenk Notzing) نے ایک عورت کا حال بیان کیا ہے کہ وہ اچھا گانا سن کر یا کوئی مرد دیکھ کر حد درجہ بیتاب ہو جاتی تھی۔

اس کی شہادت ہندوستان میں بھی اب سے کئی ہزار سال پیشتر ہندوؤں کی مشہور و معروف رزمیہ نظم مہابھارت کے آدی پرب میں ملتی ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ:۔

"ایک روز اپری چیر نامی راجہ شکار کھیلنے جنگل میں گیا۔ وہاں اسے اپنی بیوی کی یاد میں انزال ہو گیا۔ اس نے وہ خارج شدہ نطفہ کسی درخت کے پتے میں دونا بنا کر رکھا اور ایک شکاری پرند کی معرفت اپنی رانی کے پاس روانہ کر دیا۔

اثنائے راہ میں اس کو دوسرا شکاری پرندہ ملا اور اس نے وہ دونا

پھینا چاہا، اسی چھینا جھپٹی میں وہ دو نادر دریائے جمن میں گر پڑا پانی میں ایک اپسرا (بہشتی حور) جو کسی رشی کی بد دعا سے مچھلی بن گئی تھی تیر رہی تھی اس نے فوراً اس کو نگل لیا نتیجہ یہ ہوا کہ حاملہ ہو گئی حمل کی مدت پوری ہونے کے وقت اس مچھلی کو ایک ماہی گیر نے پکڑ لیا۔ پیٹ چاک کیا تو ایک لڑکا اور ایک لڑکی توام برآمد ہوئے ماہی گیر نے وہ لڑکا تو راجہ کو دے دیا اور لڑکی خود پالی جس کا نام مچھودری رکھا۔ یہی لڑکی وید بیاس جی کی ماں اور کورول پانڈو کی دادی تھی۔''

یورپ کے اندر بھی سترھویں صدی میں عورتوں کے اندر اس کا شغل موجود تھا۔ چنانچہ سنخوریگ (Sunhuzeg) نے بحوالہ ریلان (Rialan) لکھا ہے کہ:۔

''بعض عورتیں اس قدر مغلوب النفس ہوتی ہیں کہ اگر انہیں کوئی حسین شخص نظر آجاتا ہے تو صرف اسکو دیکھ کر یا باتیں کر کے انتہائی لطف حاصل کر لیتی ہیں۔''

جان پیگٹ (John Paget) نے اپنی کتاب ''قانونی معمے'' میں ایک شادی شدہ عورت کا حال لکھا ہے:۔

''جو اپنے ڈاکٹر پر عاشق ہو گئی تھی اور عالم خیال میں اپنے معشوق سے اس طرح باتیں کیا کرتی تھی کہ تین موٹی موٹی کتابیں بن گئی تھیں۔

ڈاکٹر بیچارے کو اس خیالی عشق کا حال قطعی معلوم نہ تھا لیکن جب اسکے شوہر کو یہ حال معلوم ہوا تو اسقدر جھگڑا بڑھا کہ طلاق تک نوبت پہنچی"

استلذاذ بالنفس کے اسباب و علل

خواہشات نفسانی انسان کے اندر فطرتاً پیدا ہوتی ہیں دیکھا گیا ہے کہ بچے عالم شیر خوارگی میں بھی جب ان کے اندر کسی قسم کا مادّہ شہوانی موجود نہیں ہوتا وہ اپنے عضو جنسی کو اکثر مسلتے رہتے ہیں۔ اس سے انھیں ایک قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ یہی عادت بعد میں استلذاذ بالنفس کی محرک ہوتی ہے۔

(۲) بعض دایہ اور انا بچوں کو سلاتے وقت ان کے بدن کو ہاتھوں سے سہلاتی ہیں جس سے انھیں ایک قسم کی لذت حاصل ہو کر نیند آجاتی ہے اور یہی عادت بعد میں اس عادت کی محرک ہوتی ہے۔

(۳) مجلسی لحاظ سے انسان نے فعل مباشرت کو ایک قابل شرم اور ناپاک فعل قرار دیا ہے جس کے لیے رازداری اور خلوت کی ضرورت ہے اس لیے لڑکوں اور لڑکیوں کو جب وہ خواہش سے مغلوب ہوتی ہیں اس طرح کام نکالنے میں بہت سہولت ہوتی ہے۔

(۴) بعض لوگ مذہبی یا اقتصادی وجوہ کی بنا پر نہ شادی کرتے ہیں نہ حرامکاری اس لیے وہ اس "گناہ تنہائی" کے ذریعہ سے اپنی خواہشات پوری کر لیتے ہیں۔

(۵) بدکار عورتوں اور مردوں سے التفات کرنے میں آتشک وسوزاک وغیرہ کی بیماری کا خطرہ ہوتا ہے لیکن استلذاذ بالنفس میں اس کا کوئی احتمال نہیں۔

(۶) انسان کسی سے محبت کرنے لگتا ہے اور اس تک رسائی نہیں ہوتی تو وہ عالم خیال میں ہی اس سے لطف حاصل کر لیتا ہے۔

یہ مشغلہ عورتوں میں کیوں زیادہ ہے

اگرچہ دنیا بھر میں اس کا شوق عورتوں اور مردو دونوں میں پایا جاتا ہے لیکن تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ شوق بمقابلہ مردوں کے عورتوں میں زیادہ ہے جس کے اسباب حسب ذیل ہیں :-

(۱) مردوں کی تعداد میں کمی۔ جو جنگ یا وبا کی وجہ سے اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) عورتوں میں بمقابلہ مردوں کے شرم وحیا زیادہ ہوتی ہے اس لیے وہ حرام کاری کے بجائے گناہ تنہائی کی طرف رجوع کرتی ہیں۔

(۳) جوان مرد وعورت کا ایک ساتھ سونا سوسائٹی میں معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ اس لیے عورتوں کے لیے استلذاذ بالنفس میں زیادہ آسانی ہے۔

(۴) بعض اقوام میں دوبارہ شادی کرنا معیوب خیال کیا جاتا ہے اس لیے تقاضائے فطرت پورا کرنے کے لیے عورتیں اس مشغلہ کی طرف

مائل ہو جاتی ہیں۔

(۵) مرد جلد کمزور ہو جاتا ہے اور اس کی خواہش عرصہ تک قائم نہیں رہتی برخلاف عورت کے کہ اس کی خواہش عرصہ تک قائم رہتی ہے اور اس لیے وہ اس طرح کام نکال لیتی ہے۔

(۶) اکثر عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی تسکین فطری طور پر بہ آسانی نہیں ہو سکتی اس لیے وہ خود اس کا علاج کرنا چاہتی ہیں۔

(۷) چونکہ عورتوں کو حاملہ ہونے کا خوف رہتا ہے اس لیے یہ مشغلہ ان کو بہت محفوظ نظر آتا ہے۔

(۸) عورت کو ایام سے فارغ ہونے کے بعد ہی مرد کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اگر اس وقت مرد میسّر نہ آئے تو وہ استلذاذ بالنفس کی طرف رجوع کرتی ہے۔

(۹) مرد کے اندر آلۂ خواہش صرف ایک ہے لیکن عورت کے اندر بہت سے اعضا ایسے ہیں جن میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔

(۱۰) فی زمانناً اقتصادی امور کی بنا پر مردوں کو کام میں اس قدر مصروفیت رہتی ہے کہ وہ عورتوں کی طرف پوری توجہ نہیں کر سکتے اس لیے عورتیں استلذاذ بالنفس سے اپنا شوق پورا کر لیتی ہیں۔

(۱۱) بعض عورتوں کو ہسٹریا وغیرہ ایسی بیماریاں ہوتی ہیں کہ انکی طبیعت

اس کی طرف خود بخود مائل ہو جاتی ہے۔

(۱۲) بعض عورتیں جو اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہیں خاطر خواہ شوہر نہ ملنے سے اس کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔

(۱۳) بعض عورتوں کو اپنے حسن و جمال کا اس قدر غرور ہوتا ہے کہ وہ مرد سے بات کرنا اپنی ذلت سمجھتی ہیں لیکن تقاضائے فطرت استلذاذ بالنفس پر انھیں مجبور کرتا ہے۔

استلذاذ بالنفس کے نقصانات

قوانین فطرت کے خلاف جو حرکت کی جائے گی اس سے نقصانات جسمانی یا دماغی طور پر ضرور ظاہر ہوں گے۔ چنانچہ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے استلذاذ بالمثل یا استلذاذ بالنفس کے جو نقصانات لکھے ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہم ذیل میں ایک نقشہ درج کرتے ہیں جس سے استلذاذ بالنفس کے نقصانات متعلق ڈاکٹروں کی رائیں ظاہر ہوتی ہیں:۔

نام ڈاکٹر	نقصانات
اسپائٹزکا Spitzka	دیوانگی، صرع، مختلف عوارض چشم، شقیقہ، دوران سر
سیوج Savage	کھوپڑی میں عجیب قسم کی تکلیف
ایسٹی چیپمین Aesti Chapman	مختلف اقسام کے درد۔

چیپمین	Chapman	گدّی کا جلد کمزور ہو جانا۔
لاکا شینا	Laca Ssagne	پستانوں کا ڈھیلا پڑ جانا۔
اوسینڈوسکی	Ossendowsky	پستانوں کا لٹک جانا۔
پییئر	Peyer	دمہ
سیرلے	Seerly	اختلاج قلب
بارادوق	Baraduc	زخموں پر چھالا پڑ جانا
کلپسن	Clipson	مہاسے اور پھوڑے پھنسیاں
اسکین، لوئس، موریگلیا	Skone, Lewis, Moraglia	آنکھوں کی پتلیوں کا پھیل جانا
پوئلے	Pouilet	آنکھوں کا اوپر چڑھ جانا یا ترچھا ہو جانا،
بونیر	Bournier	آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، گاہے گاہے ثقل سماعت
ج چیپمین	J. Chapman	تکلیف کے ساتھ حیض ہونا
ونکل پوئلے	Winckel Pouilet	سیلان الرحم
جیسٹ	Jusait	خصیتین میں تکلیف ہونا
لوئس، موریگلیا	Louis Moraglia	زرد رنگ یا چہرے کی بے رونقی
گرونر	Gruner	ناک کا سرخ ہو جانا۔
جو میکنزی	Joal Mackenzie	نکسیر پھوٹنا

گودرس	Gowers	خراش گلو بوقت بلوغ
فلائس	Fliess	ناک میں مختلف بیماریاں پیدا ہونا۔
شوفیلٹ	Shufellet	اندام نہانی میں تیزابی کیفیت
گرانڈو	Grindour	ضعف مثانہ
دور۔ کچمار۔ خالص ادی	Dur Krichmar	عورتوں کے ہاتھوں پر مسے ہوجانا۔
گریسنجر لوئس	Oye Griesinger Louis	توہم سامعہ وشامہ
ہرٹر	Herter	قارورہ کا غلیظ ہوجانا۔
اسکین	Skene	عورتوں کے جسم سے بو کا پیدا ہونا

فحاشی عہد قدیم میں

قدیم یونان یورپ میں باقاعدہ فحاشی کی ابتداء مشہور یونانی مقنن مصلح حکیم سولن (Solon) کے زمانہ سے قرار دیتے ہیں۔ یہ شخص بڑا ابح تھا اور فحاشی کے اڈے اور چکلے جو اس نے قائم کیے تھے ان سے اس کی غرض اشتراک فی النسواں کے رواج کو قائم کرنا تھا نہ کہ بڑھانا۔ سولن کے قانون کے مطابق ہر شخص کو حق حاصل تھا کہ اگر وہ کسی شخص کو اپنی بیوی کے ساتھ ملوث دیکھے تو اسے قتل کر ڈالے لیکن اگر ناکتخدا عورت سے کوئی شخص بالجبر ملوث ہوتا تھا تو اسے سزائے جرمانہ دی جاتی تھی جس کی مقدار سو بھیڑوں کی قیمت ہوتی تھی اور اگر کوئی شخص پیشہ ور عورت کے علاوہ کسی ناکتخدا عورت کو اغوا کرتا تھا تو اسے کم جرمانہ کی سزا ہوتی تھی یعنی صرف بیس بھیڑوں کی قیمت۔ حکیم سولن نے لوگوں کو منع کر دیا تھا کہ لوگ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو فروخت نہ کریں جب تک وہ صاحب عصمت ہیں۔

اس کے مرتب کردہ قوانین نے بہت سی باتوں کو جو اسی قبیل سے تھیں باقاعدہ کر دیا تھا۔ ایک قانون یہ تھا کہ اگر کسی صاحب جائداد عورت کا شوہر ہیچکارہ ثابت ہو تو وہ اپنے کسی رشتہ دار کو پسند کر لے تاکہ اس سے

کوئی وارث مال پیدا ہو سکے۔ صاحب مال و جائداد عورت کے خاوند کو مہینہ میں کم از کم تین مرتبہ تعلق جنسی کرنا پڑتا تھا

بعض قوانین حکیم سولن کے ایسے ہیں جو غالباً آج کل کے شوہروں کو بھی پسند آئیں۔ مثلاً کسی عورت کو اجازت نہ تھی کہ وہ تین جوڑے سے زیادہ کپڑے لیکر سفر کرے۔ وہ رات کے وقت سفر نہیں کرسکتی تھی اگر کرتی بھی تو ایک بند گاڑی میں جس کے آگے آگے روشنی لیکر جانا پڑتا تھا۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے کہنے سننے سے اپنی وصیت میں بعض خاص شرائط لکھ دیتا تھا تو انھیں ناجائز قرار دیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر ایوان بلاخ نے حکیم سولن کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"وہ پہلا شخص ہے جس نے غلط منطق سے کام لیکر آئین و قوانین حکومت کی تائید و حمایت کی۔ جو لوگ اس بات کے حامی ہیں کہ چکلوں کو موقوف کیا جائے، ان کی نظروں میں سولن کی یہ دلیل غلط ہے کہ اگر بدکاری کو قانوناً ناجائز قرار دے دیا جائے تو اس سے گھروں کی حرمت و عزت قائم رہتی ہے اور شہریوں کی بیبیوں اور بیٹیوں کی عصمت محفوظ رہتی ہے۔ آج کل بھی بعض پابند قانون عورتوں اور مردوں کا خیال ہے کہ چکلوں کی جو تائید و حمایت کی جاتی ہے وہ سولن کی اسی دلیل کی بنیاد پر ہے"۔

قدیم یونانیوں میں حکومت ابویت (Paternism)

بہت زیادہ رائج تھی اور جس شخص نے حکیم افلاطون کی کتاب "جمہوریت" یا حکیم ارسطو کی سیاسی و اخلاقی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اس پر یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ گھر کے بعض معاملات چلانے کے لیے جو تدبیر سولن نے تجویز کی تھی اس میں کوئی جدید بات نہ تھی۔ سولن ہرگز عورتوں کا طرفدار نہیں تھا۔ اس نے اخلاقیات جنسی کا معیار بلا چون و چرا تسلیم کر لیا تھا۔ اس کا مرتب کردہ تمام نظام بیوی کو اپنے شوہر سے وابستہ رکھتا تھا اور اس نے مردوں کو ارتباط و اختلاط کی کامل آزادی دے رکھی تھی تاوقتیکہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی یا بیٹی سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔

نظام سولن کے ماتحت کسبیوں کا طبقہ رضاکار عورتوں سے نہیں بھرتی کیا جاتا تھا۔ بلکہ اس میں لونڈیاں اور کنیزیں داخل تھیں جو زیادہ تر غیر ملکی ہوتی تھیں۔ ان کسبیوں کے چکلوں کے مصارف منجانب ریاست ادا کیے جاتے تھے اور بقول مورخ نکانڈر (Nickander) جو آمدنی سولن کو ان چکلوں سے حاصل ہوتی تھی، وہ آفروڈیتہ پانڈیموس کے مندر میں پجاریوں کو دیدی جاتی تھی۔ غالباً سولن یہ سمجھتا ہو گا کہ بدکاری اب بھی کسی نہ کسی طرح مذہب سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب یقیناً نہیں ہے کہ مذہب خود کسبیوں کو مقدس قرار دیتا ہے۔ یہ وہ بدنصیب عورتیں ہوتی تھیں جو جنگ میں قید ہو کر آتی تھیں اور چکلوں کو سامنے

خوش غلاف ہوکر آنے جانے والے پر ڈرے ڈالتی تھیں ان عورتوں کو کسی مرد کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل نہ تھا بلکہ انھیں ہر اُس شخص کے لیے رضامند ہونا پڑتا تھا جو ازروئے قانون مقرر کردہ حقیر ترین قیمت پیش کردے۔

اس زمانہ میں عورتیں نہایت حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں اور بیویوں کا فرض بچے جننے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بایں ہمہ جیساکہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ سولن نے ان عورتوں کے حقوق کا تحفظ کردیا تھا جو صاحب مال و جائداد ہوتی تھیں۔ پلوٹارک (Plutarch) نے سولن کے ان قوانین کی تعبیر عجیب و غریب طور پر کی۔ عام طور پر شادی شدہ عورت سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ گھر میں رہے اور اپنے بال بچّوں کی دیکھ بھال کرے۔ لڑکیوں کی شادیاں عموماً اوائل عمر میں ہوجاتی تھیں اور شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ ان ضروری فنون کی تعلیم پاتیں جو ایک اچھی گھر والی کے لئے ضروری ہیں۔ قدیم یونان کی معزز عورت مطلق تعلیم یافتہ نہیں ہوتی تھیں۔ علاوہ ازیں وہ دنیا بھر سے الگ تھلگ رہتی تھیں۔ شادی سے پہلے اکثر شوہر کو دیکھنا تک نصیب نہ ہوتا تھا۔ دولھا اور دُلھن میں باہم محبت کا ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔

عورتوں کو تھیٹروں، مردانہ کھیلوں، یا دیگر پبلک مقامات میں جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن ان احکام امتناعی سے پیشہ ور عورتیں عموماً

مستثنیٰ کر دی جاتی تھیں۔ ہومر کے زمانہ میں عورتوں کی حالت نسبتاً اچھی تھی تاہم مرد عورتوں کو جبراً بھگالے جاتے تھے یا انھیں قید کر کے شادی کرتے یا گھر میں ڈال لیتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں بعض مرتبہ سخت جنگ ہو جاتی تھی چنانچہ ہیلن کے حسن وجمال نے جس طرح ایک ہزار جنگی جہازوں کا بیڑہ تباہ کر دیا تھا وہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔

قدیم یونان میں کسی شخص کی بیوی سے یا کسی اپنی ناکتخدا رشتہ دار عورت سے تعلق پیدا کر لینا معمولی بات سمجھی جاتی تھی اور جس شخص کے خلاف یہ جرم کیا جاتا تھا اس کو عموماً یہ حق حاصل ہوتا تھا کہ مجرم سے وہ جو چاہے انتقام لے۔ اس میں سزائے موت بھی شامل تھی۔ حکومت کی طرف سے بھی مختلف قسم کی سزائیں انسداد زناکاری کے لیے مقرر تھیں۔

ان سزاؤں کے خوف سے صاحب عصمت عورتیں محفوظ رہتی تھیں اور مرد چکلوں میں جا کر لونڈیوں سے متمتع ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں کسی کسبی کے گھر جانا مصلحتاً معیوب نہ تھا اور نہ خوف کا سبب کیونکہ ان کسبیوں کا خرچ حکومت اٹھاتی تھی اور یہ اندیشہ نہ تھا کہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں سے مل کر لوگوں کو لٹوا دیں گی۔ اسی کے ساتھ البتہ یہ امر ضرور قابل توجہ ہے کہ اس زمانہ میں آتشک یا سوزاک جیسی ناپاک بیماریوں کا کہیں وجود نہ تھا۔ یورپ میں آتشک کا پتہ اس وقت کے بعد سے چلتا ہے جب کہ کولمبس

امریکہ دریافت کر چکا تھا۔ یقیناً یہ ناپاک بیماری اُس وقت جزیرہ ہاسپٹی یا سان ڈومنگو واقع مجمع الجزائر غرب الہند سے سپانیہ میں لائی گئی تھی۔ سوزاک قدیم یورپ میں ضرور پایا جاتا تھا لیکن اس بیماری کی نوعیت اور اس میں مبتلا ہونے کے اسباب لوگوں کو معلوم نہ تھے۔

الغرض کسبیوں کا وجود ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے طبقہ امراء کی بیویوں کی عصمت و عفت محفوظ رہتی تھی۔ قدیم زمانہ کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں غلام کا بہت بڑا حصہ تھا۔ مسیح سے قبل چوتھی صدی میں ایتھنز کی مردم شماری ہوئی تو معلوم ہوا کہ آزاد شہری ۲۱ ہزار، غیر ملکی باشندے ۱۰ ہزار اور غلام چار لاکھ ہیں۔ زمانۂ مابعد میں غلاموں کو آزاد کرنا رسم میں عام ہو گیا تھا۔ لیکن یونان میں یہ بات شاذ و نادر تھی۔

واقعات مندرجہ بالا سے یہ بات پوری طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ بہت کم آزاد عورتیں کسبیوں میں شامل ہوتی تھیں۔ لیکن یہ ہوتا تھا کہ کسی شہری کی لڑکی کو بحری قزاق پکڑ لیتے تھے یا وہ جنگ میں اسیر کر لی جاتی تھی۔ یا لڑکی کا باپ اسے فروخت کر دیتا تھا۔ اور اس طرح یہ سب یونان قدیم کے چکلوں میں چلی جاتی تھیں۔

قدیم زمانے کے یونانی کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہونا بیہودگی خیال کرتے تھے۔ اسلئے کسبی صرف مردوں کی تفریح کا کام دیتی تھی، داشتہ عورت

خانگی ضرورتوں کو دیکھتی تھی اور بیوی اس لیے تھی کہ جائز بچے جنے۔ یونان میں بیوی کو ایک ناگزیر مصیبت خیال کیا جاتا تھا اور عشق و محبت ان کے نزدیک ایک بیماری یا ہلکا سا جنون تھا۔

قدیم یونانیوں میں عشق و محبت کو غیر اہم چیز سمجھنے کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہاں تعلق جنسی بغیر کسی آڑ یا پردہ کے ہوتا تھا۔ یونانیوں کے نزدیک برہنگی کوئی گناہ نہ تھا۔ اور اولمپیائی کے کھیلوں میں جو لوگ کرتب دکھاتے تھے وہ کرتہ یا پاجامہ نہیں پہنتے تھے۔ ہر جگہ عریاں بت اور ننگی تصویریں نظر آتی تھیں اور انھیں دیکھ کر کوئی شخص نہیں شرماتا تھا۔ یہی "عریانی" تھی جو عشق و محبت کی کیفیت دل میں قائم نہ ہونے دیتی تھی۔

عشق و محبت کے خیال کو فحش سے علیحدہ کرنا قدیم یونانیوں کے حکیمانہ رجحان کے قطعی خلاف تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہر صورت سے حکومت کی تکمیل کریں اور کسی خاص بات کی ترقی پر توجہ نہ کی جائے تاوقتیکہ وہ ریاست کی ترقی میں مدد نہ دے۔

بہت سے یونانی اہل فکر کے نزدیک باقاعدہ فحاشی سے ریاست کی خدمت ہوتی تھی۔ ان کے نزدیک فحاشی ذریعہ شہوت رانی نہیں تھا۔ بلکہ خواہشات فطری کے پورا کرنے کا ذریعہ تھا۔

قدیم زمانہ میں بدکاری صرف بڑے بڑے شہروں ہی تک محدود نہ تھی

بلکہ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی عورتوں کے چکلے پائے جاتے تھے اسی کے ساتھ جب کسی مہم پر فوجیں بھیجی جاتی تھیں تو ان کے ساتھ کسبیاں بھی جاتی تھیں۔ یہ یونیورسٹیوں میں بھی پہونچ جاتی تھیں۔ تہواروں اور مذہبی میلوں میں تیرتھ کے مقامات میں اور ان تمام میلوں میں جہاں مرد بکثرت جمع ہوتے تھے کسبیوں کے جھرمٹ ضرور ہوتے تھے۔

روما کے تہوار فلوریلیا کی طرح بہت سی مذہبی تقریبیں کسبیوں سے خاص طور پر تعلق رکھتی تھیں۔ اور بعض ایسے تہوار بھی ہوتے تھے جن کا تعلق صرف کسبیوں سے تھا اور ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ میلہ تھا جو آفرودیتہ دیوی کے اعزاز میں بمقام کارنتھ برپا ہوتا تھا۔

اگرچہ یونان کی اکثر کسبیاں کنیزیں ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے درجے تھے۔ درجۂ خاص کی کسبیاں وہ تھیں جو بطور مدخولہ عرصہ تک ایک ہی مرد کی پابند رہتی تھیں اور ادنیٰ درجہ کی کسبیاں وہ تھیں جو وقتی طور پر نہایت ہی حقیر معاوضہ کے قبول کرنے میں بھی عذر نہ کرتی تھیں۔

بہت سی کسبیاں شریف خاندان کی لڑکیاں ہوتی تھیں جو قزاقوں کے ہاتھ پڑنے یا جنگ میں مفتوح ہونیکے بعد لونڈیاں بنائی جاتی تھیں اور پھر ان سے کسب کرایا جاتا تھا۔ ان میں بعض ایسی بھی ہوتی تھیں جو علم مجلس اور فن موسیقی سے واقف ہوتی تھیں اور اگر وہ قبول صورت اور

تعلیم پانے کے قابل ہوتی تھیں تو انھیں چکلوں میں بھی تعلیم دی جاتی تھی۔

جو کنیز ناچنا گانا اور ساز بجانا جانتی تھی اس کی قیمت بازار میں بمقابلہ دوسری کنیز کے زیادہ ہوتی تھی۔ اگرچہ اکثر یونانی اپنی بیویوں کا تعلیم یافتہ ہونا پسند نہیں کرتے تھے لیکن وہ انھیں کسبیوں کی طرف زیادہ مائل ہوتے تھے جو تعلیم یافتہ ہوتی تھیں۔

جو کسبیاں چکلوں کے سامنے کھڑی ہو کر مردوں کو ترغیب دیا کرتی تھیں وہ نہایت ادنیٰ اور ذلیل طبقہ کی ہوتی تھیں۔

اعلیٰ طبقہ کی کسبیوں میں وہ کنیزیں ہوتی تھیں جو اس زمانہ کے مختلف سازوں کو عمدگی اور ہنرمندی کے ساتھ بجا سکتی تھیں۔ یہ کسبیاں گویوں رقاصوں۔ نقالوں اور بھانڈوں کے ساتھ ضیافتوں اور جلسوں میں اکثر طلب کی جاتی تھیں۔ بیویوں کو ہمیشہ گھروں پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور وہ ایسی صحبتوں میں شریک نہیں کی جاتی تھیں۔ ان پیشہ ور لونڈیوں کے ناچ ہمیشہ عریاں اور شہوت انگیز ہوا کرتے تھے کیونکہ رقص کا فلسفہ یہی ہے کہ اشارۃً وکنایۃً یا صراحۃً جذبات حیوانی کو حرکت میں لایا جائے اور پھر چونکہ اس عہد میں شرم وحیا اخلاقی دنیا میں بہت کم وزن چیز سمجھی جاتی تھی اس لیے ان کے رقص کو قدرتاً زیادہ عریاں اور شہوت انگیز ہونا چاہیے تھا۔

عہد حاضر کی طرح قدیم زمانہ میں بھی ناچ کے ساتھ ناٹک کی بعض

خصوصیات متعلق ہوتی تھیں اور جس طرح اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تھیٹر معزز عورتوں کے جانے کی جگہ نہیں ہے اسی طرح یونانیوں میں جو عورت اسٹیج پر آکر کام کرتی تھی اُس کو کسبی سمجھا جاتا تھا۔

جیسا کہ اب سے پہلے انگلستان میں رواج تھا اسی طرح یونان قدیم میں بھی اسٹیج پر زنانہ اور مردانہ پارٹ سب مرد کیا کرتے تھے اُس وقت تمثیل میں اصلیت کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ ایکٹر لوگ مصنوعی چہرے لگایا کرتے تھے تاکہ وہ دیوتا کی طرح معلوم ہوں اور وہ جوتے بھی اونچے پہنتے تھے تاکہ کام کرتے وقت بلند بالا نظر آئیں۔

ایک قسم کا ڈرامہ ایسا بھی ہوتا تھا جس میں عورتیں پارٹ کیا کرتی تھیں اس میں وہ حد درجہ شہوت انگیز ناچ ناچتی تھیں اور عریاں یا نیم عریاں حالت میں جو عریانی سے بھی زیادہ ہیجان انگیز ہے اترت کر کے فن عیاشی کے تمام رازہائے سربستہ کھول دیا کرتی تھیں اور پھر ناچ رنگ کے بعد وہ مردوں کے لیے وقف ہوتی تھیں۔

اُس عہد کے حمام بھی چکلے ہی کا کام دیتے تھے اور ایتھنز اور دیگر یونانی شہروں کے حماموں میں بھی تھیٹروں کی طرح ناچ رنگ کا انتظام ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ چکلوں کی طرح حمام بھی شہر سے باہر بنائے جاتے تھے۔

یونان کے قحبہ خانے نہ صرف عام اور کھلے ہوئے بازار حسن فروشی

ہوتے تھے بلکہ وہاں جانا معیوب بھی نہ تھا۔ وہ ایک قسم کے سرکاری مکانات
تھے جن کا انتظام حکومت کے سپرد تھا۔ بعض قحبہ خانے ہوٹل کا بھی کام
دیتے تھے جہاں سامان اکل و شرب بھی عام طور سے فروخت ہوتا تھا۔ ان
قحبہ خانوں سے باہر اعلیٰ طبقہ کی کسبیاں اپنے ذاتی چھوٹے چھوٹے آراستہ و
پیراستہ کمروں میں رہا کرتی تھیں۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی ایک مرد
کی پابند ہو کر رہتی تھیں اور ان میں وہ کسبی بہت زیادہ مرکز توجہ ہوتی تھی
جو نہ صرف بلحاظ حسن و جمال بلکہ بلحاظ علم مجلسی کوئی خصوصیت رکھتی ہو
ہیروڈوٹس نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مشہور کسبی رہوڈوپی کو سیفو
(Sappho) کے بھائی چارا کسس نے آزاد کرا دیا تھا لیکن وہ پھر
مصر جا کر اپنا پیشہ بدستور کرتی رہی۔ کہتے ہیں کہ وہ اس قدر دولتمند ہو گئی
کہ اہرام مصری میں سے ایک ہرم خود اس کے خرچ سے تعمیر ہوا تھا۔

پلوٹارک نے (Pericles) پریکلیز کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ
اس نے محض ایک کسبی اسپاسیا (Aspasia) کو خوش کرنے کے لیے
شہر ایتھنز کو جنگ میں جھونک دیا تھا۔ بعض مصنفین لکھتے ہیں کہ پریکلیز اسپاسیا
کو محض اسکی عقلمندی اور سیاسی قابلیتوں کے باعث چاہتا تھا۔ سقراط اور
اس کے احباب بھی اس عورت کی صحبت میں بیٹھتے تھے اور جو لوگ اسکی باتیں
سُن لیتے تھے وہ اپنے ساتھ اپنی بیویوں کو بھی لے آتے تھے تاکہ وہ

بھی اس کی باتوں سے مستفید ہوں۔ پلوٹارک لکھتا ہے کہ پیریکلیز نے اپنی بیوی کو نکال دیا تھا اور خود اسپاسیا کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

ڈاکٹر ایوان بلاخ نے قدیم زمانہ کی کسبیوں کے بہت سے حالات لکھے ہیں جن میں ایک آرچیپے (Archippe) تھی جسے سوفوکلیس مشہور ڈرامہ نگار اپنی تمام دولت دے گیا تھا۔ ایک اور لیونتیون (Leontion) تھی جو اپی کیورس اور اس کے شاگردوں کی معشوقہ تھی اور خود بھی ایک اچھی مصنفہ اور فلسفی تھی۔ ایک اور تھی جس کا نام فرائین (Phryne) تھا۔ یہ تمام یونان میں اپنے حسن و جمال کے لئے مشہور تھی اس کا ایک طلائی بت بمقام دلفائی (Delphi) نصب تھا۔ ایتھنز کی ایک اور مشہور کسبی تھائیس (Thais) تھی جو سکندر اعظم کی معشوقہ بن گئی تھی اور اس کے بعد بطلیموس اول شاہ مصر کے ساتھ اس کے تخت پر بیٹھتی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس بطلیموس شاہ مصر کی ماں کسی زمانہ میں سکندر اعظم کے باپ فیلقوس شاہ مقدونیہ کی معشوقہ تھی۔

اپلیس (Apelles) یونانی مصوروں میں سب سے زیادہ مشہور و معروف شخص تھا جو چوتھی صدی قبل مسیح میں گزرا اور سکندر اعظم کا ہمعصر تھا۔ اس نے بھی کسبیوں کی تصویریں کھینچنے سے انکار نہیں کیا۔ اسکی سب سے زیادہ کامیاب تصویر وہ ہے جس کا عنوان ہے "زہرہ سمندر سے نکل رہی ہے"۔

حالانکہ یہ تصویر فی الحقیقت فرائن (Phryne) کسبی کی تھی جو (Poseidon) دیوتا کے ایک تہوار کے موقع پر برہنہ ہو کر سمندر میں کود دی تھی کہتے ہیں کہ پراکساٹلیس مصور (Praxiteles) نے جو اپنی مشہور معروف تصویر آفرودیتہ دیوی کی کھینچی تھی اس کے لیے بھی اسی عورت نے نمونہ کا کام دیا تھا۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے بنے ہوئے جو یونانی گلدان ہیں اُن میں بہت سے ظروف پر قحبہ خانوں کے مناظر اور ننگے آسن بنے ہوئے ہیں جنھیں بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور معزز شہری اُن کو اپنے گھروں میں سجاتے تھے۔ چنانچہ ارسطو نے اپنی کتاب سیاسیات (Politics) میں اور اصلاحات کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ فحش تصاویر منظر عام پر ممنوع قرار دی جائیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قدیم یونان کی کسبیاں ذاتی خصوصیات کے لحاظ سے ایسی ہی تھیں جیسی کہ اس زمانہ کی ہیں؟ ڈاکٹر بلاخ کا خیال ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں جیسا کہ لومبروسو نے اس زمانہ کی کسبیوں کا حال بیان کیا ہے۔ اسی طرح تمام زمانہ کی کسبیوں کے اوصاف میں ان کی پاکیزگی و صفائی، ان کی توہم پرستی، ان کا مکر و فریب، ان کا رشک و حسد اور ان کی بے غیرتی و بیحیائی داخل تھیں لیکن ایک نازک خیال فلسفی یہ

کہہ سکتا ہے کہ مؤخرالذکر بات کے سوا کون سی بات ایسی ہے جو تمام عورتوں میں نہیں پائی جاتی۔

ان عالمگیر خصوصیات قحبگی کو قدیم زمانہ کی کسبیوں پر عائد کرتے ہوئے ہمارے خیال میں ڈاکٹر بلاخ ایک بات بھول گئے ہیں اور وہ یہ کہ قدیم زمانہ کی اکثر کسبیاں اپنی مرضی کے خلاف قحبہ خانوں میں داخل ہوتی تھیں اور جب ایک مرتبہ وہ قحبہ خانہ میں داخل ہو جاتی تھیں تو وہ اس پیشہ کے تمام ہتھکنڈے اور چالاکیاں سیکھ لیتی تھیں اور بعض وہی طریقے اختیار کر لیتی تھیں جو پہلی کسبیوں کے ہوتے تھے۔ لومبروسو کا نظریہ جس سے ڈاکٹر بلاخ پوری طرح متفق نہیں ہیں یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی کسبی اپنی فطری خصوصیات کی وجہ سے ایسی بن گئی ہے اور حالات سے مجبور ہو کر اس نے ایسا نہیں کیا۔

بہت سی چھوٹی چھوٹی تفصیلات جو قدیم یونان کی کسبیوں میں پائی جاتی تھیں اور وہ اس زمانہ میں بھی یورپ اور امریکہ کی کسبیوں میں موجود ہیں۔ یونان اور روم کی کسبیاں اپنے چہرہ پر غازہ ملا کرتی تھیں اور بعض اوقات معزز عورتیں بھی ان کی تقلید کرتی تھیں۔ جو طرز رفتار آج کل کی کسبیوں کا ہے وہی قدیم زمانہ کی کسبیوں کا تھا یعنی وہ بھی مٹک مٹک کر شہوت انگیز چال چلا کرتی تھیں۔ یونانیوں کا لباس بیشک سادہ تھا۔ پھر

بھی اعلیٰ طبقہ کی یونانی کسبیوں کو نئے نئے فیشن جاری کرنے کا موقعہ ملتا رہتا تھا۔
معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں بھی فن مشاطہ گری اتنا ہی ترقی یافتہ تھا جتنا آج کل ہے۔ سن رسیدہ اور بدصورت عورتوں کو بنا سنوار کر دلفریب اور خوبصورت بنانے کا علم ایک مستقل فن تھا جسے بہت محنت سے حاصل کیا جاتا تھا۔
قدیم زمانہ کی کسبیاں مصنوعی دانت بھی استعمال کرتی تھیں جو غالباً موم یا کسی مسالہ کے بنائے جاتے تھے اور ان کا مقصد کھانا پینا نہیں بلکہ محض نمائش ہوتا تھا۔ قدیم زمانہ کے لوگ مختلف قسم کے منجن اور مسیّاں بھی جانتے تھے جن سے دانت خوبصورت بنائے جاتے تھے۔
خضاب کے ذریعہ سے بالوں کو رنگنا۔ مصنوعی بالوں کو کام میں لانا۔ جسم پر سے بال اڑانا۔ یہ تمام باتیں قدیم یونانی کسبیاں کیا کرتی تھیں۔ الغرض اس زمانہ کے اسباب آرائش و زیبائش جہاں تک ہم کو معلوم ہے موجودہ زمانہ کے سامان زیب و زینت سے ہرگز کم نہ تھے۔
قدیم زمانہ کی کسبیاں موجودہ زمانہ کی ہر عورت کی طرح جانتی تھیں کہ فن دلربائی میں عریانی اس قدر کامیاب چیز نہیں ہے جس قدر نیم عریانی اور یہ کہ غمزہ و عشوہ کا برمحل استعمال کتنا موثر حربہ عورت کا ہے۔
الغرض قدیم یونان کی کسبیاں موجودہ یورپین اور امریکی کسبیوں کی طرح تھیں۔ اور اگر کچھ فرق تھا بھی تو اس کی توجیہہ صرف اقتصادی یا فلسفیانہ

ہوسکتی ہے۔

اس امر کے باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ فطرت انسانی یا خواہشات نفسانی میں گزشتہ پانچ چھ ہزار سال کے اندر کسی قسم کا تغیر واقع ہوگیا ہے یہ بات باوجود زمانہ حال کے بیشمار آئین و قوانین، جلسوں، کانفرنسوں، الہامات اور پیشین گوئیوں کے بدستور موجود ہے، قحبہ خانے بھی تقریباً ویسے ہی ہیں جیسے پہلے زمانہ میں تھے۔ آج کل کی قحبی اگر سیکڑوں اور درجنوں بوتلیں شراب کی پی جاتی ہے تو قدیم یونان کی قحبی بھی مسکرات کا استعمال کیا کرتی تھی۔

اناطول فرانس نے اپنے ناول "تھائیس" (Thais) میں نہایت دوربینی سے کام لے کر ایک خوبصورت اور ہردل عزیز یونانی قحبی کا حال لکھا ہے۔ یہ قحبی قدیم یونان میں نہیں بلکہ مصر میں رہتی تھی۔ اس زمانہ میں مصر کے بڑے بڑے شہروں پر یونان کا اثر تھا۔ اس قصہ میں یہ بات دکھائی گئی ہے کہ ایک راہب ایک پیشہ ور عورت پر اثر ڈالتا ہے مگر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ایک مرد اکڑتا ہوا جاتا تھا اور فصل بھر کے لیے قحبہ خانہ کا ٹکٹ خرید سکتا تھا۔ وہ ان لوگوں کی طرح مکارانہ صورت نہیں بناتا تھا جو آج کل اوپیرا میں ایک بڑا کمرہ کرایہ پر لے لیتے ہیں اور پھر بھی زاہدان خشک

کی سی صورت بنائے رہتے ہیں۔

عملی طور پر نوجوان طبقہ کا ہر فرد کسبی کا گھر جھانکتا تھا کیونکہ وہاں ہر شخص بآسانی آجا سکتا تھا۔ فیس بہت کم تھی اور وہاں آنا جانا رائے عامہ کے نزدیک قابل شرم بات نہ تھی۔

سولن کے زمانہ میں چند سکوں کی مدد سے ہر شخص ایک معمولی کسبی کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔ جو کسبیاں زیادہ پسندیدہ ہوتی تھیں وہ اتنی ہی زیادہ گراں بھی تھیں۔ اُس وقت کسبیوں کے دلّال بھی موجود تھے جو یا تو سرکاری ملازم ہوتے تھے یا غلام کسبیوں کے مالک یا آزاد رنڈیوں کے مقرر کیے ہوئے لوگ۔ بعض صورتوں میں یہ لوگ کسبیوں کے رشتہ دار ہوتے تھے۔ ماں اپنی بیٹی اور شوہر اپنی بیوی سے ملا دیتا تھا۔ زمانہ قدیم میں کسبیوں کا کاروبار وہ لوگ بھی کرتے تھے جو اس ذریعہ سے تجارتی نفع حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بازار بردہ فروشاں میں دیگر غلاموں کی طرح کسبیاں بھی فروخت ہوتی تھیں اور خرید و فروخت میں ان کے جذبات کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا جو لوگ خریدنے والے ہوتے تھے وہ ان کو پوری طرح دیکھ لیا کرتے تھے قدیم زمانہ کے لٹریچر میں لوطیوں کا بھی ذکر آتا ہے جن کے لیے قحبہ خانوں میں خاص انتظام کیا جاتا تھا۔ تقریباً تمام خواہشیں جو آج کل ہم کو خلاف فطرت اور خلاف اخلاق نظر آتی ہیں وہ قدیم زمانہ میں معقول اور فطری

خیال کی جاتی تھیں۔ چنانچہ لواطت ایک نہایت اہم بات تھی جو کھلم کھلا ہوتی تھی اور جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔

بہت سی کتابیں جو آج کل مخرب اخلاق سمجھی جاتی ہیں۔ قدیم زمانہ میں پوری طرح اشاعت پذیر تھیں۔ مثلاً بہت سی کتابیں "زہرہ کی تصویر" پہ لکھی گئی تھیں جن میں مجامعت کرنے کے مختلف طریقے تحریر تھے۔

یہودیوں میں غسل جنابت فریضہ مذہبی تھا۔ اسی لئے حمام اور قحبہ خانے پاس پاس ہوتے تھے اور بعض اوقات حمام اور قحبہ خانہ میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ جسمانی ورزش سے پہلے یہ لوگ اپنے جسم پر تیل مل لیا کرتے تھے۔ اور غالباً اسی عمل کی بدولت وہ بیشتر اوقات گندی بیماریوں سے محفوظ رہتے۔ قدیم زمانہ کے لوگ خود اپنے فائدہ کی غرض سے کسبیوں کی جسمانی صفائی اور پاکیزگی کا بیحد خیال رکھا کرتے تھے۔ وہ ان کے نزدیک ایک مفید بلکہ مذہبی چیز تھی جس کی وجہ سے گھر کی عصمت وعفت محفوظ رہتی تھی۔

یونان قدیم میں کسبیوں کی باگ حکومت کے ہاتھ میں ہوتی تھی جو اسکی کمائی کا بڑا حصّہ لے لیتی تھی۔ ٹیکس وصول کرنے والوں کا ایک خاص عملہ ہوتا تھا اور جو عورت حکومت کی ملکیت سے باہر ہوتی تھی وہ ماہانہ ٹیکس ادا کرتی تھی جو اس کی مقررہ خرچی کے برابر ہوتا تھا۔

قدیم ہندوستان، یونان اور روم میں ہر چند کسبیوں کو ذلیل سمجھا جاتا تھا

لیکن جائز بیوی کے مقابلہ میں انھیں بہت زیادہ آزادی اور اہمیت حاصل تھی۔ بیوی کا کام گھر میں رہنا کھانے پینے کا انتظام کرنا اور بال بچوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ لیکن کسبی آزادی کے ساتھ لوگوں سے ملتی تھی۔ اگر وہ ہوشیار ہوتی تھی تو اس قدر اثر اور طاقت حاصل کر لیتی تھی کہ سلطنتوں کی قسمت کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ بہر حال اس کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا میدان بہت وسیع ہوتا تھا۔ اگر اس میں اتنی قابلیت اور خواہش ہوتی تھی کہ وہ علمی مجلسوں میں شرکت کر سکے تو اسے اجازت مل جاتی تھی۔ ہر شخص اس کا مداح ہو سکتا تھا اور ہر شخص اس کا جام صحت پی سکتا تھا ہر شخص اس کے ساتھ بعزت و اکرام پیش آتا اور تحائف نذر کرتا تھا۔

جن حضرات نے ملکۂ الیزبیتھ کے ڈرامے پڑھے ہوں گے وہ واقف ہوں گے کہ ان کا منظر عام طور پر کوئی قحبہ خانہ یا مشہور بارونق شراب خانہ رکھا جاتا تھا۔ یہ طریقہ منجملہ دیگر خصوصیات کے لاطینی تماثیل سے لیا گیا تھا اور لاطینی تماثیل میں یونان کی تقلید کی گئی تھی۔ قدیم زمانہ کے لوگ اسٹیج پر قحبہ خانہ دیکھ کر ناراض نہیں ہوتے تھے اور بہت سی یونانی تماثیل میں کوئی اعلیٰ پایہ کی کسبی ہیروئن ہوتی تھی۔

سلطنت روم کے زمانہ میں یونان کی کسبیوں کا جو کچھ حال تھا وہ لیوسن (Lucian) کے طنزیہ مکالموں اور اسکے ہمعصر السیفرون (Alciphron

کے فرضی خطوط سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ قدیم زمانہ کے تمام چھوٹے بڑے مصنفین معاملات جنسی پر آزادانہ قلم فرسائی کرتے تھے اور بہت سی کتابوں کا مقصد یہی تھا کہ وہ "کوک شاستر" کا کام دیں۔ اس مقصد کی طرف قدیم طبی کتب میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

یہی بات قدیم فنون لطیفہ میں بھی پائی جاتی ہے چنانچہ آج بھی "لنگ" کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ لیکن انھیں دیکھ کر وہی لوگ پہچان سکتے ہیں جو ان کے راز سے واقف ہیں۔ قدیم زمانہ میں جب یہ "لنگم" اور بھی زیادہ بکثرت تھے تو ہر شخص ان کا مطلب مفہوم سمجھتا تھا۔

قدیم زمانہ سے یہ بات چلی آتی ہے کہ جب کوئی مصور یا سنگتراش کسی مقدس مجسمے یا تصویر کے لیے کسی عورت کا نمونہ تلاش کرتا ہے تو عموماً وہ صاحب عصمت و عفت نہیں ہوتی۔ یونان میں آفرودیتہ (Aphrodite) دیوی کے بہت سے بت مشہور و معروف کسبیوں کے نمونہ پر بنائے گئے تھے چونکہ وہ عشق و محبت کی دیوی تھی اس کے لیے کچھ ضرورت نہ تھی کہ تقویٰ کا رنگ اس میں پیدا کیا جائے۔ ہومر (Homer) شاعر اور یونانی ڈرامہ نویس کی دیویاں اور دیوتا چونکہ بشریت سے جدا نہ تھے اس لیے وہ بھی طبعی تقاضائے فطرت کے ماتحت کام کرتے تھے۔

فحاشی قدیم رومیوں میں | قدیم رومی تہذیب تمدن کی بنیاد زیادہ تر

یونانی تہذیب تمدن پہ قائم ہوئی تھی۔ بہت سی باتیں جو جزیرہ نمائے یونان کی قحبگی کے متعلق کہی جا چکی ہیں ان کا اطلاق اطالوی اور سلطنت روم کی قحبگی پہ بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ حالات بدل گئے تھے مگر غلامی کا سلسلہ بدستور جاری تھا اور اخلاق جنسی کا معیار بھی وہی قائم رہا۔

اہل رومہ زمانہ قدیم سے نسلاً بعد نسل لنگ کی پوجا کرتے چلے آتے تھے قدیم یونانیوں اور اہل مشرق سے انھوں نے عشق و محبت کی دیوی کی پوجا کرنا سیکھا چنانچہ رومی دیوی وینس کی وہی خصوصیات ہیں جو یونانی دیوی آفرودیتہ کی تھیں بعض کا قیاس ہے کہ لفظ "وینس" (Venus) عبرانی لفظ "بنات" سے نکلا ہے جس کے معنی "بیٹیاں" یا "لڑکیاں" ہیں۔ اس لغوی معنی سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مشرق میں "کنیاں کی کٹی" (Maiden's Hut) اور مذہبی مباشرت میں باہم کیا تعلق تھا۔ بائبل کی بہت سی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب بنات اسرائیل جنبی دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگی تھیں تو وہ حد درجہ بدمستیوں اور سیہ کاریوں میں مبتلا ہو جاتی تھیں۔

یونان کی طرح روم میں بھی قحبہ خانہ کا دروازہ ہر اس شخص کے لیے کھلا رہتا تھا جس کے پاس روپیہ ہوتا اور سلطنت روم کے زمانہ میں تقریباً ہر شراب خانہ حسن فروشی کا بازار بنا ہوا تھا۔

ہورکیس کا خانساماں گاؤں کی زندگی سے گھبرا گیا تو ہوریس نے اپنے خط میں اُسے اس طرح ڈانٹا تھا:-

"ہم دونوں ایک ہی چیز کو یکساں نظر سے نہیں دیکھتے ..... میں دیکھتا ہوں کہ قحبہ خانے اور شرابخانے تمھارا دل شہر کی طرف کھینچتے ہیں .... یہاں شراب خانے کہاں جو تمہیں شرابیں بہم پہنچائیں۔ نہ یہاں کوئی گانے بجانے والی جس کے ساتھ طبلہ کی تھاپ پر تم کو لاسکا کرنا ہو۔"

رومی قحبائیں عموماً وہ عورتیں ہوتی تھیں جو جنگ میں اسیر ہو کر آتی تھیں اور ملک شام کی رقاصّہ اور مغنیّہ عورتیں بھی دریائے ٹائبر کے ساحل سے جہاں روم آباد تھا بخوبی واقف تھیں ان میں جملہ اقوام و ملل کی عورتیں شامل تھیں اور یہ بہر معاشرتی اور مجلسی طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس زمانہ کے پُرتکلف شرابخانوں میں عمدہ کھانے۔ عمدہ شرابیں۔ راگ و رنگ اور بھینی بھینی خوشبوئیں جذبات نفسانی کو ہیجان میں لاتی تھیں۔ شرم و حیا کی دیوی پوڈی سیتا (Pudicita) کے روم میں دو مندر تھے۔ لیکن اس مندر میں بھی کثرت سے شہوت رانیاں ہوتی تھیں۔

جب سلطنت روم میں عورتوں اور مردوں کے لیے مشترکہ حماموں کا رواج جاری ہی اور پبلک حماموں میں بیشتر عورتیں داخل ہونے لگیں تو بعض لوگ بڑا فریفتہ ہوئے۔ اس لیے ان کا عام داخلہ بند کر دیا گیا۔ اگر کوئی

جاتی بھی تھی تو خاص اجازت نامہ لے کر جاتی تھی کیونکہ ان کو عام شہریوں جیسے حقوق حاصل نہ تھے۔

قدیم یونان کی طرح روم میں بھی قحبہ خانے کو اہلی زندگی کی پاکیزگی کا معاون سمجھا جاتا تھا۔ زنا سب سے بڑا جرم تھا۔ زانیہ کے شوہر کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنی سیہ کار بیوی کو قتل کر ڈالے۔ اور اس کے بہکانے والے سے جس طرح جی چاہے انتقام لے۔ آخری شہنشاہ روم کے زمانہ میں زنا کے لیے حکومت کی طرف سے بھی سزائے قتل مقرر کر دی گئی تھی۔

جب کوئی زبردست فتح حاصل ہوتی تھی تو ہزارہا نوجوان لونڈیاں قید ہو کر بازار میں آجاتی تھیں اور جب رومی سپاہی بعض اوقات کسی غیر ملک میں عرصہ تک رہتا تھا تو اس کو تقاضائے فطرت پورا کرنے کے لیے یا تو کسی پیشہ ور عورت سے ملتفت ہونا پڑتا تھا یا وہ کسی عورت کو اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔

اس زمانہ میں بھی جزائر شرق الہند میں جو ولندیزی فوجیں متعین ہیں۔ ان کے سپاہیوں کو اجازت ہے کہ وہ جزائر کی سانولی عورتوں کو اپنے پاس رکھیں۔

روم کے تمام سرکس، تھیٹر، مذہبی میلے ٹھیلے اور پبلک جلسے مقاصد فحبگی کو پورا کرتے تھے۔ ہر جگہ عورتیں آزادی کے ساتھ بہار حسن دکھاتی تھیں، چنانچہ سیورنیس (Seneca) نے کبھی اور بیوی کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مرد سوائے چہرے کے اپنی بیوی کا کوئی حصہ جسم نہیں دیکھ

سکتا۔ لیکن کسبی اس کی پروا نہیں کرتی۔ اپنے باریک ریشمی لباس میں وہ مرد کو ایسی ہی نظر آتی ہے گویا عریاں ہے اور اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ دیکھا جا سکتا ہے۔

روم کے ہر بارونق بازار میں پیشہ ور عورتیں لوگوں پر ڈورے ڈالتی نظر آتی تھیں جب شہر رومہ عروج پر تھا تو اس کی آبادی ۱۵ لاکھ تھی۔ آزاد شہریوں، کاروباری لوگوں، آزاد غیر ملکیوں اور غلاموں کے اجتماع سے شہر میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی بعض محلے ایسے تھے جن میں کسبیوں کی خاص طور پر کثرت تھی۔ یہ مندروں کے آس پاس بھی اسی کثرت سے رہتی تھیں جیسے دیگر مقامات میں۔ لیکن نیچے درجہ کی ارزاں کسبیاں عموماً شہر کے گرد و نواح میں رہا کرتی تھیں۔ سہ پہر کے وقت قحبہ خانے کھلتے تھے اور رات بھر کھلے رہتے تھے۔ رات کے وقت کسبیاں شراب خانوں کی زندگی میں بھی حصہ لیتی تھیں، بڑے بڑے مکانات کے جلسوں میں شریک ہوتی تھیں اور لوگ موسیقی کے مدرسوں میں بھی اسی نیت سے جاتے تھے کہ شاید ان کی نظر انتخاب کسی پر پڑ جائے۔

شہنشاہی کے زمانہ میں شہر رومہ عیش و عشرت اور سیہ کاریوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ بہت سے مورخین کا قول ہے کہ زوال سلطنت کا باعث یہی عیش پرستیاں اور سیہ مستیاں ہوئیں۔ مانٹسکیو (Montesquieu) نے لکھا ہے کہ :-

"روما کے عوام بدترین شہنشاہوں سے بھی نفرت نہیں کرتے تھے
جب رومیوں کے ہاتھ سے سلطنت نکل گئی اور ان کے لیے جنگ و جدل
کا کوئی مشغلہ نہ رہا تو رومی بدترین قوم بن گئے۔ وہ تجارت و فنون کو
غلاموں کا کام سمجھتے تھے۔ حکومت کی طرف سے جو انھیں مُفت غلّہ
ملتا تھا اس کی وجہ سے انھوں نے فن زراعت سے لاپروائی کی اور
کھیل تماشوں کے عادی ہو گئے۔ جب شاہ نیرو (Nero) کوموڈس
(Coomodos) کالیگولا (Caligolas) (شاہان روما)
کا انتقال ہو گیا تو لوگوں نے ان کا ماتم کیا کیونکہ وہ ان کی عیش پرستیوں
میں حتی الامکان ہر طریقے سے مدد کرتے تھے اور تمام سلطنت کی
دولت ان کے لیے خرچ کر دیتے تھے۔"

وہ بھی کیا وقت تھا جب روما کے باشندوں کی اکثریت سرکاری
وظائف اور وثیقوں پر زندگی بسر کرتی تھی، کام کرنے کو ان کا دل نہ چاہتا تھا۔
گلیاں بہت تنگ تھیں۔ ذرائع نقل و حمل کی کمی کے باعث تمام آبادی حدودِ شہر
میں گھچا گھچ بھری تھی۔ گرد و نواح میں جا کر لوگ نہیں بستے تھے۔ غریب نادار لیکن
مغرور شہری روما کے اندر ہی رہنا پسند کرتے تھے۔

عالمِ تصور میں تصنیف کیجئے کہ قدیم اٹالیہ کی ایک حسینہ کسی بازار میں جہاں
خوب چہل پہل ہے، اٹھلاتی ہوئی گزر رہی ہے کسی سے آنکھ لڑائی کسی کا منھ

چڑھایا "کہیں گر گئی کہیں مر گئی"۔ الغرض چوروں سے، غلاموں سے کاہل شہریوں سے چھیڑ کرتی چلی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور اخلاقی انحطاط کے ساتھ انسان کے قوائے عمل کس درجہ مضمحل ہو جائیں گے۔

بعض اوقات گاؤں یا قصبہ کے کسی معزز آدمی کی لڑکی شہر کی شان و شوکت اور رنگ رلیوں کا حال سن کر گھر سے نکل کھڑی ہوتی تھی اور رفتہ رفتہ صحبت بد کے اثر سے وہ بھی کمانے لگتی تھی۔ الغرض بمقابلہ یونان کے رومہ میں آزاد کسبیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اعلیٰ طبقہ کی رومی کسبیاں یا تو آزاد شدہ کنیزیں ہوتی تھیں یا ان کی اولاد۔ رومہ کی اکثر مشہور کسبیاں ایشیائی نژاد تھیں۔ ان میں بعض ایسی تھیں جو لونڈی کی حیثیت سے لائی گئی تھیں اور بہت سی ایسی تھیں جو بطیب خاطر شہر رومہ یا سلطنت روم کے اور بڑے شہروں میں آبسی تھیں اور اپنا پیشہ کرتی تھیں۔ یونان کی طرح روم میں بھی اعلیٰ طبقہ کی بعض کسبیاں تاریخی کسبیاں بن گئی تھیں۔ ہوریس (Horace) کی کتاب میں ایسی عورتوں کی ایک بڑی فہرست موجود ہے۔ ان ناموں میں سے سائنارا (Cynara) لالیجہ (Lalija) لیڈیا (Lydia) اور فلیس (Phyllis) ایسے نام ہیں جنھوں نے بڑی شہرت حاصل کی ہمارے خیال میں یہ ان کے اصلی نام نہیں تھے بلکہ لقب یا پیار کے نام تھے یا ایسے نام تھے جو محض پیشہ کی خاطر

رکھ لیے گئے تھے۔ قدیم یونان میں بہت سی کسبیوں کا نام لالیجہ (Lalija) ہوا کرتا تھا جس کے معنی ہیں "بچوں کی طرح بھولی بھالی باتیں کرنے والی۔"

لیکن واضح ہو کہ بہت سی کسبیوں کو صرف بھولی بھالی باتیں ہی کہنا نہیں آتا تھا بلکہ وہ بعض اوقات اعلیٰ درجہ کی گویا اور اعلیٰ پیمانہ کی شاعرہ بھی ہوتی تھیں۔ ایسی عورتوں کے لیے ایسے امکانات تھے جو گھر کی بیبیوں اور بیٹیوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتے تھے۔

اس آزادی کے شوق میں روم کی بہت سی کتخدا عورتوں نے بھی خود کو خفیہ طور پر آزاد کر لیا تھا حتّٰی کہ بعض شہنشاہوں کی بیویاں بھی قحبہ خانوں میں جا کر مصروف نشاط ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں شہنشاہ کلادیوس (Cladiuus) کی ملکہ مسالینہ (Messalina) کا نام کافی مشہور ہے۔ اس عورت کو ۴۸ء میں اس الزام پر قتل کر دیا گیا کہ اس نے ایسی حالت میں جب کہ اس کا شوہر شہنشاہ کسی دوسری جگہ مصروف تھا ایک خوبصورت رومی نوجوان سے شادی کر لی تھی۔ جوونیل (Juvenal) نے اس شہنشاہ بیگم کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ایک قحبہ خانہ میں اپنے لیے ہمیشہ ایک کمرہ محفوظ رکھتی تھی اور ہر رات سر پر سنہری بالوں کی ٹوپی پہن کر لائسسکا ([illegible]) کے نام سے قحبہ خانہ میں جاتی تھی۔

رومی قحبہ خانے عبارت تھے کوٹھریوں کی ایک قطار سے جنکے دروازے

ایک ہی غلام گردش میں ہوتے تھے۔ ایک ہی قحبہ خانہ میں مرد و عورت دونوں قسم کے عصمت فروش مل جاتے تھے۔ بڑے کمرہ میں بہت سی کسبیاں اور نوعمر لڑکے جمع رہتے تھے جن میں سے ہر شخص کو انتخاب کر لینے کی اجازت تھی ان میں نوجوان لڑکیاں بھی ہوتی تھیں اور ادھیڑ عورتیں بھی جنھیں اس شرم انگیز پیشہ میں مدتیں گزر گئی تھیں۔ لیکن قدیم زمانہ کی مشہور کسبیوں کو اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ وہ قحبہ خانہ میں جا کر حسن فروشی کریں یا سڑکوں پر کھڑے ہو کر مردوں کو ترغیب دیں ان کی بات چیت نوکروں کے ذریعہ سے ٹھہر جاتی تھی اور گھر بیٹھے دولت پہنچ جاتی تھی۔

بعض قحبہ خانوں کے دروازوں پر کسبیوں اور نوعمر لڑکوں کی فہرست آویزاں ہوتی تھی جس میں ہر ایک کا مختصر حال اور اس کی خصوصیات درج ہوتی تھیں ہر ایک کی خرچی بھی اس فہرست میں درج ہوتی تھی بعض کی خرچی اتنی بڑی ہوتی تھی کہ اسے ایک امیرزادہ ہی ادا کر سکتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔ علاوہ ازیں جو لوگ آتے جاتے تھے وہ فرمائشیں بھی پوری کرتے تھے۔ تحائف بھی لاتے تھے۔

رومی تماثیل میں بعض ایسی بھی ہیں جن میں کسی لونڈیوں کو فروخت کیا گیا۔ یا کسی مدت معینہ کے لیے ٹھیکہ پر دے دیا گیا بعض مرتبہ اس قسم کے معاملات عدالتوں تک پہنچتے تھے۔

قدیم یونان میں آزاد کسبیوں پر جو ٹیکس لگایا جاتا تھا اس کا حال ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ تیسری صدی عیسوی میں بزمانہ شاہ اسکندر سیویروس (Alexander Severus) یہ ٹیکس روم میں بھی جاری کر دیا گیا تھا اور اس طرح جو آمدنی ہوتی تھی وہ سرکسوں، تھیٹروں اور عام جلسوں پہ خرچ کی جاتی تھی گویا عشرت پسند کسبیوں سے روپیہ جمع کر کے مزید اہتمام عیش رانی کیا جاتا تھا۔ قدیم زمانہ کی کسبیاں بعض خاص مجسٹریٹوں کے ماتحت ہوتی تھیں۔ یہ عموماً وہ مجسٹریٹ ہوتے تھے جو لوگوں کے اخلاق کے نگراں رہتے تھے۔ روم کے ایسے مجسٹریٹ جو کسبیوں کے لیے قواعد و ضوابط مرتب کیا کرتے تھے۔ بازاروں اور پبلک حماموں کے بھی انچارج ہوتے تھے۔ رومہ میں کسبیوں کو ایک خاص امتیازی لباس پہننا پڑتا تھا۔ یہ نہایت زرق برق اور شوخ رنگ ہوتا تھا۔ معزز بیبیاں زیادہ تر سادہ لباس پہنا کرتی تھیں۔ خصوصاً زمانہ جمہوریت میں۔ سیاہ قبا کسبیوں کا خاص نشان تھا۔ گھر کی معزز بیبیاں ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہنتی تھیں جس سے ان کے بدن کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔ حتیٰ کہ پاؤں تک ڈھکے ہوتے تھے لیکن کسبیاں تنگ و چسپت لباس استعمال کرتی تھیں۔

کسبیوں کو رومی مجسٹریٹوں سے اپنا پیشہ کرنے کے لیے لائسنس لینے پڑتے تھے اور ان کے درج رجسٹر کر لیے جاتے تھے۔

شہنشاہی زمانہ میں بہت سے قوانین ایسے تھے جن کی رو سے کوئی خاندانی

اپنی بیوی سے پیشہ نہیں کرا سکتا تھا اور رومی عورتوں کو بدکاری سے باز رکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ شہنشاہ ٹیسی ٹس (Tacitus) نے کوشش کی کہ روما کے تمام قحبہ خانے توڑ دیے جائیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ یہ واقعہ تیسری صدی عیسوی کا ہے۔ تھیوڈوسیس اعظم (Theodosius The Great) اور ویلنٹی نین اول (Valentinian) نے چوتھی صدی میں سلطنت روم کے اندر قحبگی کا پیشہ قطعی بند کر دیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں بھی سلطنت مشرقیہ روما کے شہنشاہ جسٹی نین (Justinian) نے انسداد قحبگی کا سلسلہ جاری رکھا۔

بت پرست رومیوں میں یہ خیال پہلے ہی سرایت کر چکا تھا کہ بدکاری ایک ناپاک اور شرمناک فعل ہے۔ اگر کوئی کسبی آزاد طبقہ کی ہوتی تھی تو بھی اسے دوسرے شہریوں کے سے حقوق حاصل نہ تھے۔ عدالت میں اس کی گواہی مستند نہ ہوتی تھی اور نہ وہ خرچی کے بارہ میں کسی پہ نالش کر سکتی تھی۔

روم کے شہنشاہی زمانہ میں رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ کسی قحبہ خانہ میں جانا اچھی بات نہیں بلکہ باعث ننگ و عار ہے۔ شریف خاندان کے لوگ یہ ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ قحبہ خانے میں گھستے ہوئے کوئی انہیں دیکھے اور پہچان لے۔ وہ اگر جاتے تو رات کو جاتے اور چوری چھپے جاتے۔ شہنشاہ آگسٹس (Augustus) کے زمانہ میں ایک قانون پاس

ہوا جس کی رو سے کوئی رومی کسی کسبی سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ ارکان دارالاعیان کے درجہ کے لوگوں کے لیے تو اس بات کی بھی اجازت نہ تھی کہ کسی کسبی کی لڑکی سے شادی کر سکیں لیکن دارالاعیان کا کوئی رکن اگر کسی کسبی کو بطور مدخولہ گھر میں ڈالنا چاہیے تو ایسا کر سکتا تھا۔ بہت کم صورتیں ایسی تھیں جن میں کسی اعلیٰ مرتبہ کے شخص نے کسی کسبی سے نکاح کیا ہو بطلیموس شاہ مصر سے تھائیس کسبی کی شادی کا ذکر ہم کر چکے ہیں شہنشاہ جسٹی نین (Justinian) نے خود ایک عورت تھیوڈورا (Theodora) سے شادی کی تھی جو بچپن میں سوانگوں اور نقلوں کے اندر ایکٹریس کا کام کیا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ عورت اپنے فن کی بڑی ماہر تھی اور اس نے قحبہ خانہ کی دوسری لڑکیوں کو بھی قحبگی کے گُر اور کرتب سکھا دیے تھے اور پھر اسی تھیوڈورا نے شہنشاہ کے ساتھ مل کر انسداد قحبگی کی کوشش کی لیکن جسٹی نین نے اس عورت سے نکاح کرنے کے قبل قسطنطین کا وہ قانون منسوخ کر دیا تھا جس کی رو سے کسی بلند مرتبہ شخص کو سوانگ بھرنے والیوں اور نقلیں کرنے والیوں سے نکاح کرنے کی اجازت نہ تھی۔ تھیوڈورا کو حکمران ملکہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس نے نظم و نسق سلطنت میں بہت اہم حصہ لیا۔

فحاشی اور ہندوستان قدیم	قدیم روم۔ یونان۔ فینقیہ۔ آشوریہ بابل۔ فلسطین اور مصر کی بے سروپا

روایات یا خرافیات سے ناظرین کرام کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ فحش کی ابتداء مذہب کی آڑ میں ہوئی تھی۔ اسی طرح ہندوستان قدیم کی دیومالا (My Thology۔) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی فحاشی کی ابتداء اسی نوع کی مذہبی روایات سے ہوتی ہے۔ اگر ان روایات کا مطالعہ منظور ہے تو دیانند سرسوتی کی ستیارتھ پرکاش ملاحظہ کیجیے جس میں بہت سے اسی نوع کے قصے درج ہیں اور جن کو پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ ان روایتوں کو کیونکر ہندو قوم نے اس وقت تک گوارا کیا اور ان کے ہوتے ہوئے ایک شخص ان کے مذہب و معاشرت اور تہذیب اخلاق کے متعلق کیا رائے قائم کر سکتا ہے۔

فحاشی قرونِ وسطیٰ میں

قرونِ وسطیٰ سے مراد وہ زمانہ ہے جو سلطنتِ روما کے زوال سے شروع ہو کر کولمبس کی دریافتِ امریکہ پر منتہی ہوتا ہے اور اس دَور میں موضوعِ زیرِ بحث کے لحاظ سے تین باتیں قابلِ اعتنا رہیں۔ ایک تو یورپ کا دینِ مسیح قبول کرنا۔ دوسرے آتشک یا "آبلۂ فرنگ" کا ظہور۔ تیسرے علوم فنون کا احیاء اور کلیسائے مسیحی میں افتراق و انشقاق۔

تاریخِ یورپ کو تین علیحدہ علیحدہ نمایاں حصّوں میں تقسیم کرنا تو یقیناً مشکل ہے کیونکہ بہت سی باتیں جو قدیم روما میں پائی جاتی تھیں ان کا اثر قرونِ وسطیٰ میں بھی بدستور قائم رہا اور بہت سے ادارے جو قرونِ وسطیٰ کی ابتدا میں ظہور میں آئے تھے وہ بعد کو احیاءِ علوم و فنون اور اصلاحاتِ مذہبی کے زمانہ میں بھی باقی رہے۔

رومیولس آگسٹولس (Romulus Augustols) کے معزول ہونے یعنی سنہ ۴۷۶ء کے بعد سے امریکہ کی دریافت تک (سنہ ۱۴۹۲ء) دس صدی کا زمانہ ایسا گزرا ہے جب حالات بہت تغیر پذیر تھے اور بعض مورخین اس زمانہ کی پہلی چھ صدیوں کو "دورِ تاریکی" سے تعبیر کرتے ہیں اور پچھلی چار صدی کا

کے زمانہ کو "قرون وسطیٰ" سے درآنحالیکہ اس وقت بھی فن تعمیر و مصوری، ادب و فلسفہ میں جو جو ترقیاں ہوئیں وہ بہت کچھ اہمیت رکھتی ہیں۔

فحاشی اور اثرات مسیحیت

جس طرح آج کل کے یوروپین بچے بلحاظ قومیت انگریز، فرانسیسی یا جرمن پیدا ہوتے ہیں اسی طرح قرون وسطیٰ میں زن و مرد رومن کیتھولک پیدا ہوتے تھے یعنی جس طرح آج کل کوئی "دلدادۂ نوضویت" (Anarchist) اپنے سیاسی خیال کی وجہ سے خود کو حکومت کے ٹیکسوں سے مستثنےٰ نہیں سمجھ سکتا اسی طرح وہ لوگ بھی مذہبی پابندیوں سے نہیں بچ سکتے تھے خواہ ان کے دل میں مذہب کی کوئی وقعت ہو یا نہ ہو۔ عیسائی ممالک میں جو معدودے چند غیر مسیحی خصوصاً یہودی اور مسلمان رہتے تھے انھیں کامل حقوق شہریت حاصل نہیں تھے۔ عموماً ان لوگوں سے اس وقت تک رواداری برتی جاتی تھی جبتک جذبۂ حرص و آز یا مذہبی تعصب ان لوگوں کو قتل یا ملک سے خارج نہ کرا دیتا تھا۔

باایں ہمہ عہدنامہ جدید (مجموعۂ اناجیل) کے پڑھنے سے ہم کو اس بارہ میں بہت ہی کم معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ قرون وسطیٰ کے عیسائی فی الحقیقت کس قسم کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر سینگر نے نہایت صحت کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ :-

"تعلیم مسیحیت کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پارسائی پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ حواریین مسیح پارسائی کو ایک اخلاقی اور مذہبی فرض کہتے تھے اور جس جوش خروش کے ساتھ وہ بت پرستی کے خلاف وعظ کہا کرتے تھے اسی طرح وہ فحاشی کی بھی برائیاں بیان کیا کرتے تھے۔"

لیکن باایں ہمہ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی مذہبی جماعت قحبہ خانوں کی بھی سرپرستی کرتی تھی۔ حتیٰ کہ بعض بڑے بڑے مقدس و متبرک مقامات میں بھی قحبہ خانے پائے جاتے تھے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اوّل اوّل مسیحیت پر "ایسینی" یہودیوں (Essenes) کی تعلیمات اور رسم و رواج کا بڑا اثر پڑا تھا۔ یہ جماعت اشتراکیت پسند تھی سب لوگ مل جل کر رہتے تھے اور اپنی زندگی ہاتھ پاؤں کی محنت سے بسر کرتے تھے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا یہ لوگ لذات نفسانی سے محترز رہتے تھے حتیٰ کہ اپنی بیویوں سے بھی صحبت نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ان کی پارسائی سے ان پر اسرار آسمانی منکشف ہو جائیں گے اور اس طرح بہت جلد نزول مسیحا ظہور میں آئے گا۔ درحقیقت یہ لوگ اکثر سن رسیدہ اور معمر ہوتے تھے جن میں جذبات نفسانی کی طاقت زائل ہو چکی ہوتی تھی۔ لیکن یہودیوں کی عام تعلیم یہ تھی کہ شریعت موسوی کے مطابق شادی بیاہ کر کے نسل بڑھاؤ۔ اس شوق میں کہ یسوع مسیح کی آمد ثانی جلد از جلد ظہور میں آجائے

ابتدائے زمانہ کے عیسائیوں کے دل ترک ازدواج پہ مائل ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ یسوع نے اپنے معتقدین کو تنبیہ کی تھی کہ "جب تک تمہارا زہد اتقاء فقیہوں اور فریسیوں سے فائق نہ ہو گا تم ہرگز بہشت کی سلطنت میں داخل نہیں ہو سکو گے"۔ یہ الیشینی (Essenes) یہودی بھی فریسیوں (Pharisees) کی ایک شاخ تھے جو تمام عوائد و رسوم کے نہایت سختی کے ساتھ پابند تھے۔ یسوع نے جو وعظ پہاڑی پہ کہا تھا اس میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ :-

"تم نے سُنا ہو گا کہ پُرانے زمانے کے لوگوں کی طرف سے کہا گیا کہ تو زنا نہ کر لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ جو شخص کسی عورت کی طرف بد نگاہ سے دیکھے گا وہ اپنے دل میں اس عورت سے زنا کر چکا"۔

بایں ہمہ عہد نامہ جدید (یعنی مجموعۂ اناجیل) سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع قوانین کی سختی کے خلاف تھے اور اس صورت میں وہ گویا الیشینوں کے حلقہ سے باہر تھے۔ قرونِ وسطیٰ کے بعض ادارات کے لیے یسوع کی وہ تعلیم جس میں گنہگاروں کو مزید گناہ سے بچانے کے لیے ہدایت کی گئی ہے نہایت اہمیت رکھتی ہے :-

"تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟ اگر کسی شخص کے پاس سو بھیڑیں ہیں اور ان میں سے ایک کہیں بھٹک جائے تو کیا وہ بقیہ ننانوے بھیڑوں کو

چھوڑ کر پہاڑوں میں نہیں جاتا اور وہاں گم شدہ بھیڑ کو تلاش نہیں
کرتا؟ اور اگر وہ بھیڑ اسے مل جاتی ہے تو یقیناً میں تم سے کہتا ہوں
کہ اسے اس بھیڑ کی اتنی خوشی ہوتی ہے کہ ان ننانوے بھیڑوں کی
نہیں ہوتی جو گم نہیں ہوئی تھیں"۔

ہر چند اوّل اوّل جو لوگ عیسائی ہوئے تھے ان میں اکثر اسی یہودی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں لوگوں نے مسیحیت کی ابتدائی تاریخ کو نمایاں طور پر رہبانیت کے رنگ میں رنگا تھا تاہم یہ بات کہ یسوع انہیں آسینی یہودیوں میں سے تھے یا نہیں ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ بہرحال اس میں کلام نہیں کہ یسوع بدکاری اور فحاشی کے خلاف تھے اور وہ قحبہ خانوں کے قیام کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور جس طرح قدیم زمانہ کے یہودی کسی فاحشہ کا نام سنتے ہی کانپ جاتے تھے اسی طرح یسوع بھی لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔

یسوع نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی کہ خداوند کی خاطر لوگ اپنی بیویوں کو چھوڑ بیٹھیں بلکہ وہ کہتے ہیں:-

"جو کوئی شخص اپنی بیوی کو حرامکاری کی سوا اور کسی وجہ سے چھوڑ دے
اور کسی دوسری عورت سے شادی کر لے تو وہ زنا کرتا ہے اور جو شخص
اس چھوٹی ہوئی عورت سے شادی کرے گا وہ بھی زنا کرے گا"۔

یہ عبارت یقینی ذو معنی ہے کیونکہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی مرد

اپنی بیوی کو چھوڑ سکتا ہے مگر اس لیے نہیں کہ دوسری عورت سے شادی کرے بلکہ بقیہ عمر مذہبی تجرد میں بسر کرنے کے لیے۔ مگر اس قسم کا نتیجہ نکالنے کے لیے ہمارے پاس کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ یسوع نے یہودی متفکرین کی ایک جماعت کا یہ قول قبول کر لیا تھا کہ جب مرد و عورت باہم مل کر یک جسم ہو جائیں تو انھیں ہرگز علیحدہ نہ کیا جائے تاکہ ان سے زنا نہ صادر ہو۔

پادریوں نے اپنی رہبانیت اور تجرد کے لیے حسب ذیل قول بھی نقل کیا ہے جو یسوع سے منسوب کیا جاتا ہے:۔

"سب مرد اس قول کو قبول نہیں کر سکتے سوائے ان کے جن سے یہ بات کہی جاتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں بعض لوگ مخنث ہیں جو ماں کے پیٹ سے اسی طرح پیدا ہوئے تھے اور بعض مخنث ایسے ہیں جنھیں لوگوں نے ایسا بنا دیا ہے اور ایسے بھی مخنث ہوں گے جنھوں نے بہشت کی بادشاہت کی خاطر خود کو خصّی کر لیا ہے۔ اب جو اس قول کو مان سکتا ہے وہ مان لے۔"

چونکہ قرون وسطیٰ کے عیسائی پادریوں نے بعض خاص صورتوں سے قطع نظر خود کو جسمانی طور پر کبھی خصّی نہیں کیا تھا اس لیے یہ الفاظ ہمارے موضوع کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ رومن کیتھولک کلیسا نے ابتدا ہی سے

یہ بات منظور کر لی تھی کہ کوئی مذہبی آدمی بیوی نہ کرے اور جائز بچے نہ جنوائے لیکن اس حکم امتناعی کو صدیوں تک پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔ اس "پادریانہ پارسائی" کا خیال اواخر قرون وسطیٰ میں بالکل فراموش ہو گیا تھا اور کبھی کبھی کسی جدید پیر پادری کی پیروی کے جوش میں ضرور ابھر آتا تھا لیکن جب کلیسائے رومن کیتھولک کی طرف سے اصلاحات مذہبی کا جواب دیا جانے لگا تو اس خیال نے پھر اہمیت حاصل کر لی اور اس کا سلسلہ ابھی تک اُن لوگوں میں جاری ہے۔

یسوع ؑ سے سوال کیا گیا کہ اگر عورت زنا کرتی ہوئی پکڑی جائے تو اس سے کیا سلوک کیا جائے تو یسوع ؑ نے جواب دیا کہ :-

"وہ شخص جو تم میں معصوم ہے وہ سب سے پہلے اُس عورت کو پتھر مارے"

یہ سنتے ہی تمام الزام لگانے والے وہاں سے باہر نکل گئے ایک بھی باقی نہ رہا جو اس گنہگار عورت کے خلاف گواہی دے۔ کیا اس زمانہ میں سلطنت یہودیہ کی اصلی حالت یہی تھی؟ کیا ان کے تمام مرد قانون اخلاق کی خلاف ورزی کرنے کے مجرم تھے؟ یا وہ یہ خیال کرتے تھے کہ بڑے سے بڑا نیک پارسا آدمی بھی کسی نہ کسی طرح گناہ سے ملوث ہو جاتا ہے؟ چونکہ یوحنا کا بیان بالکل روایتی معلوم ہوتا ہے اس لیے زیادہ قابل توجہ نہیں تاہم قرون وسطیٰ کے نیک عیسائیوں کے نزدیک تمام باتیں سچی اور تاریخی تھیں۔

پولوس کی تعلیم یسوع کی تعلیم سے بہت مختلف معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً وہ خیال کرتا تھا کہ تمام بنی نوع انسان ذلیل ہیں، اس کے نزدیک گناہ اور شریعت موسوی دونوں ایک چیز تھیں۔ اس نے تمام تو انین مروجہ کی تعمیل کرنے کی کوشش کی لیکن سب میں خامیاں پائیں۔ اسی باعث وہ آخر میں یہ خیال کرنے لگا کہ قانون شیطان کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ وہ صرف ایمان پر زور دیتا تھا اور کہتا تھا کہ ایمان نکوکاری سے بھی افضل ہے۔ وہ خیال کرتا تھا کہ اگر لوگ یسوع پر ایمان لے آئیں تو ان کی روح میں جدید زندگی پیدا ہو جائے گی اور اس طرح ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ پولوس کے نزدیک اگرچہ یہ تعلیم گناہ کے لیے فتوائے جواز نہیں تھی لیکن بعد کو بہت سے عیسائی اس کے یہی معنی لینے لگے۔

عیسائیوں کے مذہبی اجتماعات میں عورتوں کا رجحان طبیعت کسی قدر یہ ہوتا تھا کہ وہ مردوں کے برابر درجہ حاصل کریں لیکن اس معاملہ میں پولوس کی رائے کچھ اور تھی۔ وہ کہتا ہے :-

"میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر عورت کا سر مرد ہے اور ہر مرد کا سر مسیح ہے اور مسیح کا سر خدا ہے۔ جو مرد اپنا سر ڈھانک کر عبادت کرتا ہے وہ اپنے سر کو بے عزت اور ذلیل کرتا ہے اور ہر عورت جو اپنا سر ڈھکے بغیر عبادت کرتی ہے وہ اپنے سر کو ذلیل کرتی ہے"

پولوس نے مردوں کو یہ بھی سکھایا کہ وہ عورتوں کو ہاتھ نہ لگائیں اور بچے نہ پیدا کریں کیونکہ گوشت پوست کی تمام چیزیں جلد فنا ہو جائیں گی۔ صرف روحانی چیزیں باقی رہ جائیں گی۔ شادی بیاہ محض اس خیال سے جائز قرار دیا گیا تھا کہ فحاشی بند ہو جائے۔ چنانچہ پولوس کہتا ہے کہ:۔

"دوزخ میں جانے سے یہی بہتر ہے کہ انسان نکاح کر لے"

حالانکہ اس کی دلی خواہش یہی تھی کہ سب لوگ ناکتخدا اور پارسا بنے رہیں۔

عہدنامہ جدید درحقیقت مختلف مصنفین کی آراء کا مجموعہ ہے جو مطمحِ نظر اور تجربہ میں بہت کچھ فرق رکھتے تھے۔ اور اسی لیے اس میں بہت سی عبارتیں ایسی ہیں جن کے کئی کئی معنی ہو سکتے ہیں اور ہر قسم کی تعلیم کی تائید و حمایت میں بائبل کے اسناد مل جاتے ہیں چنانچہ پولوس کے ایک خط میں لکھا ہے کہ:۔

"میں نے تم کو ایک خط اس ہدایت کے ساتھ لکھا تھا کہ تم بدکاری کی صحبت میں نہ رہو۔ یہ نہیں کہ تم اس دنیا کے بدکاروں کے ساتھ نہ رہو بلکہ بندگانِ حرص و آز، بت پرستوں اور استحصال بالجبر کرنے والوں کی صحبت میں بھی نہ رہو۔ ورنہ تم کو اس دنیا سے نکل جانا ہوگا"

مگر سینٹ اگسٹائن کہتا ہے کہ:۔

"کسبیوں کے پیشہ کو نہ روکو ورنہ شہوت انیاں تمام سوسائٹی کو تہہ و بالا کر دیں گی"

[illegible] کی ایک مجلس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک عیسائی کیلیے

یہ بات مناسب ہے کہ وہ کسی ایک عورت کے ساتھ رہے خواہ وہ عورت اس کی بیوی ہو یا نہ ہو۔ آگسٹائین کا خیال یہ تھا کہ مسیحی گرجاؤں میں کسی کو نہ آنے دیا جائے تاوقتیکہ وہ اپنا پیشہ ترک نہ کر دے لیکن اس معاملہ میں قرون وسطیٰ کے بہت سے علمائے دینیات نے اس کا تتبع نہیں کیا۔ پھر بھی طلوییا صدی میں ترنٹ کی مجلس نے اسی قسم کا حکم دیا۔

پانچویں صدی میں ایلویرہ (Elvira) کی مجلس نے کسبیوں اور قرمساقوں کو خارج از دین کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس مجلس نے یہ حکم بھی دیا کہ جو کسبیاں کسی عیسائی سے نکاح کر لیں انہیں عشاء ربانی میں شامل ہونے دیا جائے۔ اس کے بعد بہت سی مجلسوں نے ان کے وجود کی ضرورت کو تسلیم کیا۔ سنہ ۱۴۳۱ء میں بمقام باسلے ایک مقتدا دین مسیحی نے ایک مضمون پڑھا جس میں یہ حجت پیش کی کہ یہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے لوگوں کے اخلاق حسنہ قائم رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد کی صدی یعنی دور جدید کے آغاز میں میلان کی مجلس نے ان کو حکم دیا کہ وہ ایک خاص قسم کا لباس پہنا کریں جس پر سنہری یا رو پہلی کلابتوں یا ریشم کی کوئی کشیدہ کاری نہ ہو علاوہ ازیں یہ بھی حکم دیا گیا کہ وہ ایک محلہ میں رہا کریں۔ گرجاؤں کے قریب بود و باش اختیار نہ کریں اور ہوٹلوں اور سراؤں میں بھی نہ آئیں۔

عیسائیوں میں بعض ایسے فرقے پائے جاتے تھے جن پر یہ الزام لگایا گیا

کہ وہ مذہب کے نام سے سیہ کاریاں کرتے ہیں۔ چنانچہ نکولائی فرقہ کے عیسائی کہتے تھے کہ جو لوگ بخشش کے طلبگار ہوں ان کے لیے گناہ کرنا لازم ہے پیروان آدم (Adamites) اور مریدان قابیل (Coiniles) کی طرح یہ بھی مذہبی اغراض کے لیے اشتراک فی النسواں کے قائل تھے بہت سے فرقے اس امر پر اصرار کرتے تھے کہ جب کسی مرد یا عورت کو عوام کے سامنے بپتسمہ دیا جائے یا جب کوئی مرد یا عورت عبادت میں مصروف ہو تو اُسے لازم ہے کہ کپڑے اُتار ڈالے۔ شرم و حیا کی بھینٹ چڑھانے کا عقیدہ جو بہت سے مشرقی مذاہب میں اس قدر اہم تھا وہ بھی وقتاً فوقتاً بندگان مسیح میں پیدا ہو جاتا تھا۔

جب یورپ میں دین مسیحی پھیلا تو زمانہ بُت پرستی کے بعض عیاش دیوتاؤں کو بھی فراموش نہیں کیا گیا اور ان میں سے بعض کو اولیاء اللہ بنا دیا گیا۔ چنانچہ جو دن ان کی پوجا کے لیے مقرر تھے ان میں "لنگوں" کے جلوس نکالے جاتے تھے سینٹ ویلنٹائن (St Velentine) عشق و محبت کا سر پرست سمجھ کر اس کی پرستش کی جاتی تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں تمام یورپ کے اندر پریاپس (Priapus) دیوتا کے بُت موجود تھے جس کا حال اس سے قبل کسی جگہ لکھا جا چکا ہے۔ ان تقریبوں میں نہایت فحش ناچ گانے "مقدس کنواری" (مریم صدیقہ) کے نام سے ہوتے رہتے تھے بعض عیسائی فرقے ایسے بھی تھے جنہیں

ایام بت پرستی کے دیوتاؤں کی ان کے اصلی ناموں کے ساتھ پوجا کی جاتی تھی چنانچہ "ویلنوس" "بن دیویاں" اور "جل دیویاں" نہ صرف عیسائی شعراء کی نظموں بلکہ عوام کے خیالات میں بھی بدستور موجود تھیں۔

قرون وسطیٰ کی کسبیاں عام طور پر "مریم کنواری" کی پرستش کر کے دعا مانگا کرتی تھیں کہ رات کو ان کی خوب کمائی ہو۔ یہ اس غرض کے لیے مذہبی تعویذ گنڈے بھی استعمال کرتی تھیں۔

قرون وسطیٰ میں اس امر کی بھی کوشش کی گئی کہ ان عورتوں سے توبہ کرائی جائے چنانچہ تیرھویں صدی میں ایک جماعت ان کی جرمنی میں ایسی قائم ہو گئی تھی اور اس کا نام "تائبات سینٹ مریم میگڈلینی" تھا۔ اس طبقہ کی پشیمانہ خواہروں کے لیے تمام جرمن ریاستوں میں بہت سی "زنانہ خانقاہیں" تعمیر کی گئی تھیں جن کا خرچ کچھ تو ان عورتوں کی بھیک سے اور کچھ مختلف اسقفوں کے عطیات سے چلتا تھا۔

ان توبہ خانوں میں کام کرنے پر بہت زور دیا جاتا تھا اور اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا کہ ان "بہنوں" کی طبیعت لذات نفسانی کی طرف مائل نہ ہو۔ جہاں ایک مرتبہ کوئی کسبی تائب ہو کر داخل خانقاہ ہو جاتی تھی تو پھر اسے بعد اختتام سال یا بعد مدت مقررہ ابتدائی خانقاہ سے باہر نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس طبقہ میں "دوشیزہ

لڑکیاں اور دیگر عورتیں بھی جنہوں نے یہ پیشہ کبھی نہیں کیا تھا داخل کی جانے لگیں اور ان عورتوں کو بجائے "تائبات یا خواہران میکڈ بلینی" کے "سفید بہنیں" کہنے لگے۔

تیرھویں صدی میں ملک فرانس میں بھی "بنات اللہ" (Daughters of God) کا ایک طبقہ قائم کیا گیا۔ اس کے اغراض مقاصد بھی یہی تھے کہ کسبیوں کو مذہبی زندگی میں لایا جائے۔ تمام یورپ جگہ جگہ ایسے راہبہ خانے تعمیر ہو گئے تھے جن میں وہ گنہگار عورتیں داخل ہوتی تھیں جو تارک الدنیا ہونا چاہتی تھیں۔

بہت سی کسبیاں ایسی پناہ گاہوں یا مکانوں میں داخل ہو جاتی تھیں جو خصوصیت کے ساتھ مذہبی نوعیت نہیں رکھتے تھے۔ ان مکانوں میں قدرتاً ایسی عورتیں آکر داخل ہوتی تھیں جن کے لیے سن رسیدگی کے باعث کام چلانا مشکل ہو جاتا تھا۔ میکڈ بلینی خانوں کا خرچ وہ عیسائی اٹھاتے تھے جو خود کو یسوع مسیح کے اسوۂ حسنہ کا پابند سمجھتے تھے۔

بعض اوقات مذہبی جوش میں مبتلا ہو کر ان گھروں میں کسبیاں بھی داخل ہو جاتی تھیں۔ لیکن جب وہ اس زندگی کی یکسانیت سے گھبرا جاتی تھیں تو پھر باہر نکل کر اپنا پیشہ اختیار کر لیتی تھیں۔ ان باتوں کی وجہ سے بعض ادارے ایسی کسبیوں کو اپنے ہاں جگہ نہیں دیتے تھے جو

پہلے داخل ہو کر نکل گئی تھیں۔ بہت سی عورتیں ایسی بھی پھرتی تھیں جو یہ کہہ کر بھیک مانگتی تھیں کہ وہ اپنی گناہگارانہ زندگی ترک کر دینا چاہتی ہیں اسی کے ساتھ فحاشی سے بھی اپنی آمدنی میں اضافہ کر لیتی تھیں۔

قحبہ خانوں کے سب سے اچھے سرپرست عموماً پادری اور راہب خیال کیے جاتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں شہروں اور قصبوں کے اندر ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور غالباً ان میں بہت کم ایسے تھے جو حقیقی طور پر راہبانہ زندگی بسر کرنے پر مائل تھے۔ چونکہ یہ لوگ جائز طور پر شادی کر کے اپنی خواہشات نفسانی کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے یا تو وہ گھر میں کوئی عورت ڈال لیتے تھے یا فحاشی کرتے تھے۔ بہت سے مقامات میں ایسے قانون رائج تھے جن کی بنا پر کوئی مذہبی آدمی قحبہ خانوں میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ لوگ بجائے وہاں جانے کے خود وہاں کی عورتوں کو اپنے پاس بلا لیتے تھے۔

گناہوں سے نجات پانے کے لیے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت سمجھی جاتی تھی کہ گنہگار اپنے بدن پر کوڑے کھائے۔ اس رسم سے پادری صاحبان کو کافی موقع مطلب برآری کا مل جاتا تھا۔ جو پادری اقرار معصیت سنتا تھا وہ اس بات پر ہمیشہ زور دیتا تھا کہ خفیف سے خفیف گناہ کے لیے بھی جسم پر تازیانے کھائے جائیں۔ عورتوں کا جسم چونکہ نازک ہوتا ہے

اس لیے کبھی عموماً ٹانگوں یا کمر کے نیچے گوشت حصے پر لگائی جاتی تھی اور چونکہ سزائے تازیانہ سے گنہگار کی تذلیل مقصود ہوتی تھی اس لیے بعض اوقات جسم سے کپڑا دور کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔

خانقاہوں اور راہبہ خانوں میں راہبوں اور "کنواریوں" پر نہ صرف بدکاری کی وجہ سے کوڑے پڑتے تھے بلکہ محض "جلال ربانی" ظاہر کرنے کے لیے بھی کوڑے برساتے تھے ——— گیارھویں صدی میں ایک راہب ڈامیانی (Damiani) نے تازیانہ زنی کے لیے ایک خاص مذہبی طبقہ قائم کیا تھا جس میں ہر طبقے کے آدمی شامل ہو کر اپنے جسموں پر کوڑے مارتے ہوئے بصورت جلوس نکلتے تھے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی مصیبت مثلاً قحط یا وبا نازل ہوتی تھی تو ہزاروں آدمی ان مظاہروں میں شریک ہو جاتے تھے اور بڑی بے دردی سے ایک دوسرے پر کوڑے برساتے تھے۔ یہ لوگ کوڑے کھاتے کھاتے کچھ ایسے مشتاق ہو جاتے تھے کہ وہ اپنے جسموں پر ہر قسم کی سزا برداشت کر لیا کرتے تھے اور جب ان لوگوں کا مذہبی جوش بھڑک اٹھتا تھا تو وہ یہودیوں اور مفروضہ جادوگروں کو مار ڈالتے تھے۔

اسی سلسلہ میں فرقہ ... بھی تھا ... کا مستحق ہے۔ قرون وسطیٰ کے بہت سے مفکرین ایسے گزرے ہیں جو عورتوں سے سخت نفرت

کرتے تھے وہ یہ اس کے ہمخیال تھے کہ عورت مرد سے کم درجہ پہ ہے اور اس کی یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ ابتدائی گناہ کی ذمہ دار حوا تھیں۔ اس وقت عورتوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک ملکوتی اور دوسری شیطانی۔ یعنی عورتیں یا تو شیطان کا آلۂ کار ہیں یا مریم کی کنیزیں ہیں یکسیاں قسم اوّل میں اور راہبہ عورتیں قسم دوم سے تعلق رکھتی تھیں جو عورت کسی کی معشوقہ ہوتی تھی وہ تو گویا کنیزِ مریم تھی مگر گھر کی غریب بیوی بیچاری شیطانی قوتوں کی مالک ٹھہرائی جاتی تھی۔ الغرض ان خیالات میں خوب مضحکہ انگیز ترقی ہوئی۔ عام خیال یہ تھا کہ عشق و محبت ایک روحانی اور آسمانی جذبہ ہے اور نکاح ایک مقدس معاہدہ ہے لہٰذا اس کا تعلق کسی ناپاک شہوت نفسانی یا کسی ایسے جذبہ سے نہ ہونا چاہیے جس کی بنیاد خواہشات جسمانی پر ہو۔

بہت سے شعراء کا خیال یہ تھا کہ عورت کو اگر کوئی چاہے تو فقط دور سے چاہے۔ لہٰذا کسی دوسرے مرد کی بیوی پہ عاشق ہونا اور عاجزانہ طور پہ اُس کی خدمت کرنا مناسب و اچھا سمجھا جاتا تھا۔ جرمنی اور فرانس کے شعراء اس بات کی تصویر نہایت نفاست اور عمدگی سے کھینچتے تھے کہ کوئی بھلا آدمی کسی حسینہ کے سامنے دست بستہ دوزانو بیٹھا ہے اس کی محبت قطعی بے لوث ہے اور وہ اس مہ جبین کی ہر خدمت غلاموں کی طرح بجا لاتا ہے لیکن درحقیقت

یہ سب کچھ ایک کھیل تھا اور اصلی مقصد یہ تھا کہ عورت کا شوہر جب تک کوئی ناشائستہ حرکت نہ دیکھے اُس وقت تک اس قسم کی عشق بازی پر معترض نہ ہو بہ ظاہر اس طریقہ پر عورت کی پرستاری قطعی بے لوث اور صحیح سمجھی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہی "عشق بازی" طبقہ امراء میں زناکاری بن گئی۔

ہر چند یہ "عشق بازی" بڑے لوگوں کا کھیل تھا۔ لیکن اس کا اثر طبقہ اوسط اور کسانوں پر بھی ہوا۔ یعنی مرد اپنی عورتوں کو بخیال ادب آموزی زدوکوب کرتے تھے اور پھر خود ہی "مقدس کنواری" یا وینس (عشق و محبت کی دیوی) کے نام سے اپنی معشوقہ دلنواز کے ہاتھوں جوتیاں کھاتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ میں رفتہ رفتہ یہ خاص فن بن گیا تھا اور تکلیف و تذلیل ہمیشہ تازیانہ ہی کے ذریعہ سے نہ ہوتی تھی بلکہ اظہار عشق و محبت کا ایک معمولی طریقہ یہ بھی تھا کہ مرد اپنی محبوبہ کا ایک پھٹا ہوا کثیف کُرتہ خود پہن لیتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ کی سحر و ساحری میں بھی مختلف قسم کے جنسی یا شہوانی عناصر شامل تھے۔ اوّل ہر وہ عورت جسے دیکھ کر جذبات نفسانی مشتعل ہو جاتے تھے۔ اس میں شیطانی قوتیں سمجھی جاتی تھیں۔ عام خیال یہ تھا کہ انسان کا جسم ناپاک اور اس کی روح پاک ہے۔ لہٰذا جس عورت کو دیکھ کر شہوت بھڑکے وہ ضرور بالضرور شیطان کا آلۂ کار ہے۔ جب کوئی مقدس راہب کسی عورت کو دیکھ لیتا تھا تو فوراً بھاگ جاتا تھا تاکہ شیطان کے مکر و فریب میں نہ پھنس جائے

اس زمانہ میں بھی یونان کے ایک جزیرہ میں راہبوں کا ایک صومعہ ہے جہاں عورت کو اندر جانے نہیں دیا جاتا اور کچھ دن پیشتر تو یہ حالت تھی کہ بلّیاں اور دوسرے مادہ جانور اس جزیرہ سے باہر نکال دیئے جاتے تھے۔

قرونِ وسطیٰ میں جن سحر پیشہ لوگوں پر مقدمات چلا کر انھیں زندہ جلا دیا گیا تھا۔ ان میں مرد جادوگر بہت کم تھے۔ ایسی بڑھیا عورتوں سے جو مکروہ صورت ہوں لوگ بہت ڈرتے تھے کیونکہ ان کی نسبت یہ خیال تھا کہ وہ دور ہی سے لوگوں کو زہر دیدیتی ہیں، چھری مار دیتی ہیں اور لوگوں پر موہنی کر کے انھیں دامِ محبت میں گرفتار کر لیتی ہیں۔ ایسی عورتیں سوسائٹی کے اس طرزِ عمل سے واقعی اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھنے لگتی تھیں اور رات کو جنگلوں میں جمع ہو کر جلسہ کرتیں اور مختلف قسم کی خلافِ وضع فطری حرکتیں کرتیں۔ اس زمانہ میں بہت سی عورتوں کو جادوگرنی سمجھ کر جو قطعی بے ضرر تھیں زندہ جلا دیا گیا۔

اگرچہ یہ بتانا دشوار ہے کہ سحر و ساحری اور حرامکاری میں اصلی تعلق کیا تھا لیکن جو کچھ بھی تعلق ہوگا وہ نہایت اہم ہوگا۔ ڈاکٹر سینجر کا خیال ہے کہ پادری اور راہب اکثر ہفتہ میں ایک رات ان ناشائستہ حرکات کے لیے وقف کر دیتے تھے اور اسمیں شک نہیں کہ ان محافل میں جا کر کسبیاں بھی شہوت رانی کے مختلف طریقے سیکھتی تھیں اور دوسروں کو سکھاتی تھیں۔ قرونِ وسطیٰ کے اندر دیویوں اور عفریتوں کا جو عقیدہ تھا بسا اوقات اس سے بھی خوب مقصد برآری ہوتی تھی۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ رات

وقت لوگوں کے گھروں میں عفریت آتے ہیں اور اکثر دوشیزہ لڑکیوں سے ملتفت ہو کر انھیں حاملہ کر دیتے۔ درآنحالیکہ یہ عفریت انسانوں کے علاوہ اور کوئی نہ ہو سکتے تھے۔

مجلسی معاشرتی حالات

یورپ میں قرون وسطیٰ کی زندگانی کا دار زیادہ تر زراعت و فلاحت پر تھا۔

اگرچہ بعض مصنوعات میں بھی کافی ترقی ہو گئی تھی لیکن یہ چیزیں عموماً چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں بنتی تھیں۔ لوگ گاؤں ہی میں زیادہ تر بود و باش رکھتے تھے اور عموماً ایک ہی مزرعہ میں ضرورت کی تمام چیزیں پیدا کر لی جاتی تھیں۔

کسان لوگ تعلقہ دار یا زمیندار کو اپنا محافظ و نگہبان خیال کرتے تھے اور اس حفاظت کے معاوضہ میں ہر ہفتہ دو تین دن تعلقدار کی خدمت مفت کیا کرتے تھے اس خدمت کے سلسلہ میں ان کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ جب وہ اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے تھے تو تعلقہ دار کو ایک خاص رقم ادا کرتے تھے یہ رقم غالباً زمیندار کے اس حق کا معاوضہ تھا جو عروس کی شب اولین پر اس کو حاصل تھا۔ رفتہ رفتہ زمیندار کی قوت اس قدر بڑھ گئی کہ وہ عروس کسان کی لڑکی سے بھی لطف حاصل کرتے اور رقم بھی وصول کر لیتے۔

چونکہ اس وقت فن زراعت نہایت ہی ابتدائی حالت میں تھا اسلیے ان بیچارے زرعی غلاموں کے پاس شاذ و نادر ہی اتنی دولت جمع ہوتی

تھی کہ وہ آزادی حاصل کر سکیں۔ علاوہ ازیں ان کی اراضی کا کچھ حصہ (خصوصاً جنگل اور چراگاہ) مشترکہ ہوتا تھا اور ان کا بہت سا وقت میدان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے میں لگ جاتا تھا۔

یہ اپنی غربت کی وجہ سے نہ سامانِ تعیش پر کچھ صرف کر سکتے تھے۔ نہ کہیں باہر سیر و سیاحت کے لیے نکلتے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ ان کی اخلاقی حالت شہری لوگوں سے بہتر ہوتی تھی۔

قرون وسطیٰ کے اوائل میں یورپ کے اندر صرف چند شہر تھے اور جو تھے بھی تو ان میں اکثر رومیوں کے بسائے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ جب کاروبار اور تجارت کو ترقی ہوئی تو بہت سے مقامات نے بڑھتے بڑھتے اہمیت حاصل کر لی۔ ورنہ پندرھویں صدی عیسوی تک یورپ بھر میں ایسے ایک درجن سے بھی کم ایسے شہر موجود تھے جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے زائد ہو گی۔ اس وقت لنڈن کی آبادی ۴۰ ہزار۔ ویانا کی ۵۰ ہزار خیال کی جاتی تھی، پیرس اور اطالیہ کے بعض شہر کبھی قدر بڑے تھے اور مشرق میں قسطنطنیہ اور بعض دیگر شہر واقعی بڑے شہر تھے جن کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ لہٰذا ان بڑے شہروں کی معاشری حالت اُن شہروں سے قطعی مختلف تھی جن سے اس وقت ہمارا خاص تعلق ہے۔

مغربی یورپ کے چھوٹے چھوٹے شہروں میں سوداگروں اور اہل حرفہ

کی پنچایتیں خاص اختیارات رکھتی تھیں اور جن لوگوں کی شہر کے اندر دکانیں ہوتی تھیں وہ ان میں سے کسی نہ کسی جماعت سے ضرور تعلق رکھتے تھے سوداگروں کی پنچایتیں مذہبی و معاشرتی فرائض انجام دیتی تھیں اور بازار کا اہتمام بھی انھیں کے سپرد تھا۔

تقریباً ہر پیشہ اور حرفہ میں یہ دستور تھا کہ چند سال کے لیے لڑکوں کو معاہدہ پر رکھ لیا جاتا تھا اور ان کو کوئی اُجرت نہیں دی جاتی تھی میعاد شاگردی وامیدواری گزرنے کے بعد وہ لڑکا روزانہ کچھ اُجرت پانے لگتا تھا۔

پھر چونکہ عموماً اُجرتی کاریگر کو اس قدر آمدنی نہ ہوتی تھی کہ بیچارہ شادی کرکے بال بچوں کی پرورش کر سکے اس لیے ان میں سے اکثر تمام عمر ناکتخدا رہتے تھے اور یہی وہ لوگ تھے جن سے قحبہ خانوں کی رونق قائم تھی۔ یہ لوگ صفائی پسند اور پاکیزہ طبع نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ کیچڑ میں لوٹتے اور ہر قسم کی بدبو اور عفونت میں زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ بجز اس کے کہ جو شرابخانوں یا عام قحبہ خانوں میں حاصل ہو سکے ان کے لیے عیش و تفریح کا کوئی سامان نہ تھا۔

قرون وسطیٰ میں طویل العمری کے لیے جسمانی طور پر طاقتور ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں نے حفظانِ صحت کا نام تک نہ سُنا تھا۔ ملکوں ملکوں میں وبائیں پھیل جاتی تھیں اور لوگ باقاعدہ جنگوں یا آپس کے جھگڑوں میں

ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔ اسی لیے عموماً مردوں سے عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور چونکہ مذہبی عقائد کی بنا پر یا اقتصادی مشکلات کے خیال سے اکثر مرد مجرّد رہتے تھے۔ اس لیے عورتوں کی بھی بڑی تعداد کو مجبوراً ناکتخدا رہنا پڑتا تھا۔ پھر بعض عورتیں یا تو ترک دنیا کر کے کسی خانقاہ میں داخل ہو جاتی تھیں یا پیشہ اختیار کر لیتی تھیں۔ قرون وسطیٰ کے کارخانوں یا شراب خانوں میں عورتوں کو اُجرتیں بھی کم ملتی تھیں۔ ادنیٰ درجہ کی عورتوں کی عصمت و عفت کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی تھی اور ہر چند زنا سب سے بڑا گناہ خیال کیا جاتا تھا، لیکن یہی گناہ عام تھا۔

قرون وسطیٰ کے قحبہ خانوں کو جن لوگوں سے زیادہ آمدنی ہوتی تھی وہ تین جماعتوں سے متعلق ہوتے تھے۔ راہبوں کی جماعت، کاریگروں کا طبقہ اور طلباء۔ ہر چند کوشش کی جاتی تھی کہ طلباء ریچھے رہیں اور اوقات مقررہ پر ان کو اپنی اقامت گاہوں میں موجود رہنا پڑتا تھا۔ مگر یہ تمام احتیاطیں انھیں فحاشیوں سے باز نہ رکھ سکتی تھیں۔

قرون وسطیٰ کے لوگوں میں بعض قحبہ خانوں کے خلاف تھے اور بعض ان کو اخلاقی لحاظ سے ضروری سمجھتے تھے لیکن پیشہ ور عورتوں کو عام طور پر ذلیل سمجھنے کے باوجود اتنی اجازت تھی کہ وہ تقریبوں میں شریک ہو کر اپنے تحائف پیش کریں۔ کبھی کبھی بادشاہ اور امراء بھی قحبہ خانوں کو عزت بخشتے تھے

اور جب کوئی معزز مہمان آجاتا تھا تو اُس کو اجازت ہوتی تھی کہ وہ جس قحبہ خانہ میں چاہے بغیر روک ٹوک کے چلا جائے شہنشاہ سجمنڈ (Sigismund) پندرھویں صدی میں گزرا ہے اس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جس شہر میں گیا وہاں کے قحبہ خانہ کی ضرور سیر کی۔

پیشہ ور عورتوں کو دوسری شریف عورتوں سے ممیز کرنے کے لیے یہ قاعدہ مقرر تھا کہ پیشہ ور عورتیں زیور اور قیمتی لباس پہن کر پبلک میں نہ نکلا کریں۔ ان کے لیے حکم تھا کہ وہ نقاب، اوڑھنی، کسی مخصوص وضع قطع کی عبا، یا کوئی مقررہ نشان استعمال کریں۔ یہودیوں، بدعتی عیسائیوں، جذامیوں اور دیگر ذلیل قوموں کے افراد کو بھی عام گزرگاہوں یا بازار میں ایک خاص قسم کا نشان استعمال کرنا پڑتا تھا۔

ملکی قوانین کی رو سے اس طبقہ کے لوگوں کو چوروں اور آوارہ لوگوں کی قسم میں رکھا جاتا تھا اور جو سرکاری ملازم قحبہ خانوں کی حفاظت کیا کرتے تھے وہ اجنبی عورتوں کی طرف اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ بعض اوقات ان کو پکڑ کر منہ کالا کرتے اور کوڑے مار کر نکال دیتے تھے۔

قرون وسطیٰ کی مذہبی خانقاہیں چونکہ فواحش میں بہت بدنام ہوگئی تھیں اور وہاں کسی پارسا لڑکی کا پہنچ جانا گویا اپنے آپ کو بیچ کر نکلنا تھا۔ اسلئے کلیسا کی طرف سے ان کے خلاف احکام امتناعی جاری کیے گئے لیکن یہ سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔

مذہبی تہواروں میں بھی کسبیاں بڑا حصہ لیتی تھیں۔ بعض اوقات
مقامی حکام اپنے مہمانوں کے سامنے ان کا رقص دیکھتے تھے اور اس کے
عوض انھیں کھانا شراب اور کچھ لونڈوں کے ہار دیے جاتے تھے۔ یہی حال قدیم
روما میں تھا بعض اوقات قرونِ وسطیٰ کے لوگ شادی بیاہ کی تقریب میں
مہمانوں کی تفریح کے لیے کسبیاں کبھی اجرت پر بلا لیا کرتے تھے۔

جب کوئی بادشاہ یا اسقف اپنی قلمرو میں دورہ کرتا تھا تو اس کے
ہمراہ متعدد کسبیاں بھی ہوتی تھیں اور مقدس سلطنت روم کے زمانہ میں
جب امرا جمع ہوتے تھے تو کسبیاں ان سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاتی تھیں۔
مذہبی مجالس اور [illegible] کے گرد بہت سی کسبیاں جمع ہو جاتی
تھیں اور کوئی فتح حاصل ہوتی تھی تو فوجیوں کو شراب اور عورت بطور
مال غنیمت مفت دی جاتی تھی۔

قرونِ وسطیٰ کی آخری دو تین صدیوں میں ہر ایک حماموں نے بھی
قحبہ خانوں کا درجہ اختیار کر لیا تھا۔ انگلستان میں تو بہت پہلے سے حماموں
کے اندر کسبیاں رکھی جاتی تھیں اور یہ رواج رومیوں نے جاری کیا تھا
لیکن براعظم یورپ میں یہ رواج اس وقت جاری ہوا جب صلیبی جنگوں کے
بعد بہت سے لوگ [illegible] واپس آ گئے۔

اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ [illegible] کسبیوں کو مشرقی سلطنت روم [illegible]

اور شمالی افریقہ میں فروخت کر دیا جاتا تھا اور وہاں سے عربی کنیزیں وینس کے قحبہ خانوں کے لیے خرید کر لائی جاتی تھیں۔ مغربی شہروں میں بردہ فروشی نے اسقدر اہمیت کبھی اختیار نہیں کی تھی جسقدر قسطنطنیہ، قاہرہ اور بغداد میں۔

اس عہد کی تقریباً تمام کسبیاں جاہل ہوتی تھیں اور بعض اوقات ایسے ملکوں میں بھیجدی جاتی تھیں جہاں کی زبان وہ بہت کم سمجھتی تھیں۔ یہاں ان کو پورے قانونی حقوق حاصل ہوتے تھے اور ان کا مالک ان سے جو چاہے کام لے سکتا تھا۔

فحاشی سے شراب کا تعلق ہمیشہ رہا ہے اسی لیے قرون وسطیٰ کی کسبیاں پہلے شرابخانوں ہی میں جمع ہوا کرتی تھیں لیکن جب قحبہ خانے جداگانہ قائم ہو گئے تو شراب خانوں سے انکا تعلق کم ہو گیا۔ قدیم زمانہ کی طرح اوائل قرون وسطیٰ میں بھی قحبہ خانے اکثر بازاروں ہی میں ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کو وہاں سے ہٹا کر نواح شہر میں جگہ دی گئی۔ رات کے وقت انکے مکان کے دروازے پہ ایک سرخ لالٹین لٹکا دی جاتی تھی اور دن میں کوئی خاص نشان نصب کر دیا جاتا تھا ان علامتوں کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں وہ بھی دیکھ کر پہچان لیں کہ یہ بازار کس قسم کا ہے۔

بعض اوقات یہودیوں کے محلہ میں قحبہ خانے بنا دیے جاتے تھے جس سے یہ لوگ سخت جلتے تھے۔ یہودیوں کو ان قحبہ خانوں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

بہت سے اضلاع میں کسی یہودی کا عیسائی عورت سے یا عیسائی کا یہودی عورت سے تعلق ہوتا اس قدر سخت جرم قرار دیا گیا تھا کہ مرتکبین کو زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے یہودیوں کو حکم تھا کہ وہ کوئی امتیازی نشان استعمال کریں تاکہ شناخت ہو سکے۔ قرون وسطیٰ میں یہودیوں کی شادیاں اوائل عمر میں ہو جایا کرتی تھیں اس لیے گمان غالب ہے کہ بہت کم یہودی ایسے ہوتے ہوں گے جو اپنی بیویوں کے سوا کسی غیر عورت سے واسطہ رکھتے ہوں گے۔

قرون وسطیٰ کے اخیر میں پبلک قحبہ خانوں کے نظام میں تغیر و تبدل پیدا کرنے کا میلان شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اٹالیہ اور جنوبی فرانس میں چند قحبہ خانے نہایت پرتکلف تیار کیے گئے جن میں خوبصورت اور شاندار حمام بھی تھے۔ میونسپلٹیوں نے بہت سے قحبہ خانے اپنے ہاتھ میں لے لیے جن کا انتظام وہ اپنے تنخواہ دار ملازموں سے کرتے یا ٹھیکہ پر دیدیتے۔ بہت سے شہروں میں قحبہ خانوں سے باہر جو پرائیویٹ ٹھکانے ہوتے تھے ان پر سخت ٹیکس لگائے جاتے تھے تاکہ سرکاری قحبہ خانوں کو ان سے نقصان نہ پہنچے۔

چونکہ قحبہ خانوں میں رہنے والی عورتیں سرکاری ملازم ہوتی تھیں اور حکومت کو ان کی کمائی کا ایک حصہ ملتا تھا اس لیے ان کو بعض رعایتیں بھی حاصل تھیں اور پولیس ان کی پوری حفاظت کرتی تھی۔ قحبہ خانوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات بھی مقرر تھے اور احکام میں یہ صراحت بھی ہوتی تھی کہ کن

کن لوگوں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں حکومت کی طرف سے ایسے قواعد ضوابط بھی رائج تھے جن کے ڈر سے کوئی شخص دھوکا دے کر کسبیوں کی اجرت مار نہیں سکتا تھا اور نہ مالک قحبہ خانہ کے نامعقول مطالبات کی وجہ سے کسبیوں کے کپڑے فروخت کیے جا سکتے تھے۔ ارباب حکومت اس کی بھی نگرانی کرتے تھے کہ ان کو دونوں وقت کھانا معقول دیا جاتا ہے یا نہیں۔

بہت سی میونسپلٹیوں نے یہ قاعدہ مقرر کر رکھا تھا کہ شہر کی کوئی دوشیزہ لڑکی قحبہ خانوں میں داخل نہ کی جائے لیکن قحبہ خانوں کے مالک کسی دوسرے شہر سے خوبصورت لڑکیاں لا سکتے تھے۔

قرون وسطیٰ میں چالیس برس کی عمر والوں کو سال خوردہ سمجھا جاتا تھا اس لیے قحبہ خانوں میں کوئی عورت اس عمر کی نہیں رہ سکتی تھی۔

اگرچہ ان کو ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن گرجاؤں میں آنے کی اجازت ان کو مل جاتی تھی اور گرجا کے لیے موم بتیاں خریدنے اور عشائے ربانی کے مصارف کے لیے ان سے اکثر چندہ بھی لیا جاتا تھا۔

قرون وسطیٰ کے لوگ اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ وہ گندگی اور توہمات میں مبتلا ہیں جب کام ہوتا تھا تو وہ کر لیتے تھے لیکن فرصت کے وقت وہ نہایت بدتمیزی سے لہو و لعب اور عیش و عشرت میں مشغول ہو جاتے تھے اور جانوروں سے زیادہ ان کی حیثیت نہ رہتی تھی۔

اگرچہ علماء و فضلاء کسبیوں کو ادنی مخلوق قرار دیتے تھے لیکن پھر بھی گرجاؤں میں ان کی نشست مقرر تھی اور تہواروں میں پارسا لوگوں کے ساتھ شامل ہو جاتی تھیں۔

ایک بات پبلک قحبہ خانوں میں یہ بھی ہوتی تھی کہ کسبیوں کو دن بھر میں کوئی نہ کوئی مقررہ کام ضرور کرنا پڑتا تھا مثلاً سینا پرونا یا کاتنا۔

ہر چند اس امر کی بہت کوشش ہوتی تھی کہ فحاشی صرف قحبہ خانوں تک محدود رہے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور خانگی طور پر بھی فحش برابر جاری رہا۔ اس جماعت میں ہر قسم کی عورتیں ہوتی تھیں لیکن خصوصیت کیساتھ مشاطہ گری کرنے والیاں، حمام میں نہلانے والیاں اور سلائی کا کام کرنے والیاں اس زیادہ مبتلا تھیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض عورتیں بازاروں کی سڑکوں پہ حسن فروشی کرتی پھرتی تھیں اور ان کی وجہ سے نہ صرف سرکاری قحبہ خانوں کو نقصان پہنچ جاتا تھا بلکہ شہر میں جرائم کی تعداد بھی بڑھ جاتی تھی اور قتل وغیرہ کی واردات بھی نسبتاً زیادہ ہونے لگتی تھیں۔

بعض اوقات شہروں میں سرکاری قحبہ خانوں کے آس پاس لوگ اپنے ذاتی قحبہ خانے بھی خفیہ طور پر قائم کر لیتے تھے اور ہر چند حکومت ان کو قائم نہ رہنے دیتی، لیکن فحاشی کو صرف سرکاری قحبہ خانوں تک محدود رکھنے

میں کبھی کامیابی نہیں ہوئی اور نہ فحاشی کا سدباب اس طرح کبھی ممکن ہے۔

ناچ گھر جہاں عموماً شراب فروخت ہوتی تھی کھلے قحبہ خانہ کی صورت رکھتے تھے لیکن پندرھویں صدی تک ان ناچ گھروں کو چنداں اہمیت حاصل نہ ہوئی تھی کیونکہ اس وقت نہ بڑے بڑے شہر پائے جاتے تھے اور نہ لطف و تفریح کا شائستہ نظام قائم ہوا تھا۔ البتہ مشرق کے بڑے بڑے شہروں میں قدیم یونان و روم کی طرز کے میخانے پیدا ہو گئے تھے جن میں "تعلیم یافتہ" کنیزیں بزم نشاط گرم کیا کرتی تھیں۔

حماموں میں اکثر و بیشتر عورتیں ہی ملازم ہوتی تھیں۔ جو حماموں اور بیش خدمتوں کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ اواخر قرون مظلمہ میں بھی ایسے ادارات فحاشی بہت آراستہ و پر تکلف ہوا کرتے تھے اور عورتیں بھی حسن و جمال دیکھ کر ملازم رکھی جاتی تھیں، لیکن قرون وسطیٰ کی فحاشی کی خصوصیت خاصہ اس کی ارزانی تھی۔

قرون وسطیٰ میں حرم میں بھی بکثرت تھیں اور ان میں بہت ایسی تھیں جو درحقیقت اصلی بیویوں کا درجہ رکھتی تھیں۔ جب پادریوں کے لیے یہ بات ناممکن ہو گئی کہ وہ عورتوں سے جائز طور پر نکاح کر سکیں تو وہ کنیزوں اور باندیوں سے تعلق رکھنے لگے اور ان سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی اس کی نگہداشت بالکل جائز اولاد کی طرح ہوتی تھی اور بعض اوقات انھوں نے ترقی کر کے حکومتیں تک کی ہیں

جو احکام قحبہ خانوں کے متعلق جاری ہوتے تھے ان میں اس امر کی بھی صراحت ہوتی تھی کہ کسی مرد کو آستین پکڑ کر قحبہ خانہ میں نہ کھینچا جائے اور نہ کسی کی ٹوپی اتاری جائے۔ الغرض حکومت کے احکام ہر قسم کی تفصیلات پر حاوی تھے اور جس طرح سرکاری بازاروں اور منڈیوں کی نگرانی ہوتی ہے اسی طرح اس زمانہ میں قحبہ خانوں کی نگرانی ہوتی تھی۔

احکام کی خلاف ورزی کرنے والی کسبیوں کو جو سزائیں دی جاتی تھیں ان میں ایک سزا یہ بھی تھی کہ اس کو پکڑ کر شکنجہ کے اندر کس دیتے تھے یا کسی چھکڑے میں لاد کر باجہ کے ساتھ تشہیر کرتے تھے اور لوگ ساتھ ساتھ شور وغل مچاتے اور آوازے کستے جاتے تھے بعض مقامات میں اس طریقہ تشہیر میں کسی قدر تفاوت ہو جاتا تھا یعنی چھکڑے میں لادنے کے بجائے اس کو دم کی طرف منھ کر کے گدھے پر سوار کر کے شہر میں گھماتے تھے اور اس پر سڑی گلی ترکاریاں اور کیچڑ تک پھینکتے تھے۔

اگر کوئی بدمعاش کسی باعصمت عورت کو اڑا لاتا تھا تو اسے بعض جگہ تو پھانسی دیدیجاتی تھی یا زندہ آگ میں جلا دیا جاتا تھا مختلف جرائم پر کسبیوں اور ان کے ساتھیوں کو سزا ئے تازیانہ دیجاتی تھی۔ یا ان کا کوئی عضو کاٹ دیا جاتا تھا یا کچھ دنوں کے لیے جیل خانہ میں ڈال دیے جاتے تھے۔ یا ان پر جرمانہ کر دیا جاتا تھا۔ اکثر اوقات گرم لوہے سے داغنے کی بھی سزا دیجاتی تھی۔

قحبہ خانوں میں حفظانِ صحت کا خیال تو رکھا جاتا تھا لیکن ناپاک بیماریوں کا کوئی لحاظ نہ ہوتا تھا۔ البتہ اگر کسی عورت کی نسبت کسی بیماری کا شبہ ہوتا تھا تو اُسے شفاخانہ بھیج دیتے تھے اور جن کی گود میں بچے ہوتے تھے انھیں بھی شفاخانہ بھجوایا جاتا تھا۔ کسی جذامی عورت کو قحبہ خانہ میں داخل نہ کیا جاتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ کے انگلستان میں فحاشی

جب رومیوں نے برطانیہ کو فتح کر لیا تو انھوں نے دیکھا کہ ملک میں جماعتی شادیوں اور دیگر قسم کے تعلقاتِ زناشوئی کا رواج تو موجود ہے لیکن کوئی قحبہ خانہ نہیں پایا جاتا۔ ڈاکٹر سینجر (Sanger) کا قول ہے کہ اسوقت اہلِ برطانیہ کے اوضاع و اطوار بہت ناشائستہ تھے یہ لوگ بالکل گنوار تھے اور ان کے یہاں یہ عام دستور تھا کہ شادی کے وقت تمام الجنس قطعی ہمبستر ہوتی تھیں۔

البتہ اینگلو سیکسن قوم کا قانونِ اخلاق زیادہ سخت تھا اور اگرچہ ان لوگوں میں کبھی نکاح کا کوئی خاص قانون مقرر نہ تھا۔ لیکن وہ زناکاری پر نہایت سخت سزا دیتے تھے۔ جب یہ لوگ انگلستان آئے تو اُن کے بعض سرداروں میں کثرتِ ازدواج کا رواج تھا۔ لیکن اس عورت کو جو عصمت کی ناقدری کرتی تھی یا اُس مرد کو جو کسی غیر عورت کے ساتھ ملتفت ہوتا تھا سخت سزا دی جاتی تھی۔ بدچلن بیوی کو بعض اوقات خودکشی کر لینے کا موقع دیا جاتا تھا جس کے

بعد اس کی لاش پھونک دی جاتی تھی۔ لیکن اگر وہ عورت خودکشی نہیں
کرتی تھی تو اُسے سخت عقوبت دی جاتی تھی بلکہ عورتوں کا ایک مجمع کثیر جن کے
ہاتھوں میں ڈنڈے اور چھرے ہوتے تھے اُس عورت پر حملہ کرکے تکا بوٹی
کر دیتی تھیں اور اس کے چاہنے والے کو بھی قتل کر دیا جاتا تھا۔

جو لوگ شادی کرنا چاہتے تھے وہ عورتوں کے والدین سے اپنی بیویاں
خرید لیا کرتے تھے۔ شادی شدہ عورت کے بال تراش دئیے جاتے تھے
تاکہ صورت میں کشش کم ہو جائے۔

شاہ کینوٹ کے ایک قانون کی رو سے زانیہ کے ناک کان کاٹ ڈالے
جاتے تھے لیکن بعد میں ایک رقم معاوضہ مقرر کر دی گئی تھی جو زانیہ کے شوہر کو
دلائی جاتی تھی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فحاشی بڑھنے لگی اور تعزیر کا طریقہ
پھر جاری کرنا پڑا مگر تعزیر کی صورت بدلی ہوئی تھی یعنی مجرم کو بادشاہ کا
غلام بننا پڑتا تھا۔ سخت مشقت کرنی پڑتی تھی یا بادشاہی فوج میں خدمت
کرنے پر اُسے مجبور کیا جاتا تھا۔ شاہ ایڈگر نے ایک قانون جاری کیا جس کی رو سے
زانی و زانیہ دونوں کو ہفتہ میں تین دن صرف روٹی اور سادہ پانی پر
گزر کرنا پڑتا تھا اور یہ سلسلہ سات برس تک جاری رہتا تھا۔

رومیوں نے لندن اور انگلستان کے بعض دیگر شہروں میں قحبہ خانے
قائم کر دئیے تھے اور ان میں سے غالباً ایک دو قرون وسطیٰ تک جاری رہے

انگلستان کے حماموں کے اندر قحبہ خانے قائم کرنے کا فخر بھی رومیوں ہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ انگریزی کا لفظ "اسٹوز" (Stews) جو وسطی زمانہ کے لفظ "اسٹوین" (Stewen) سے بنا ہے "غسل" ہی کے معنی رکھتا ہے اور قرونِ وسطیٰ میں انگلستان کے اندر سرکاری حمام سب سے بڑے قحبہ خانے ہوتے تھے۔

بارھویں صدی میں بعہد ہنری دوم قحبہ خانوں کے انتظام کے متعلق ایک قانون پاس ہوا جسکی رو سے تعطیلات کے ایام میں کوئی عورت حماموں کے اندر رہنے نہیں دیجاتی تھی اور نہ حمام میں سامان اکل و شرب فروخت کرنے کی اجازت تھی۔ بہت سے قواعد اسی قسم کے تھے جن کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے یعنی کسی مرد کو جبراً گھسیٹ کر قحبہ خانہ میں نہیں لے جا سکتے تھے۔ کوئی راہبہ یا کتخدا عورت قحبہ خانوں کے اندر داخل نہیں ہو سکتی تھی جس عورت کو "سوزاک" کی تکلیف ہوتی تھی اسے قحبہ خانہ میں نہ رہنے دیا جاتا تھا ہنری دوم کے اس قانون کی توثیق چودھویں اور پندرھویں صدی میں ہوئی۔

نویں صدی میں بہت سے مسیحی علما اس بات پر مصر تھے کہ ملک کی کسبیوں سے جس قدر آمدنی ہو اسکا دسواں حصہ کلیسا کو ملنا چاہیئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد کلیسا والوں نے اس کا مطالبہ ترک کر دیا شاید اس وجہ سے کہ بعض فقہا گناہگاری سے جلب منفعت کرنا بھی گناہ سمجھتے تھے لیکن آیندہ زمانہ کے اسقفوں نے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ قحبہ خانوں سے آمدنی حاصل

کرنا برا نہیں سمجھا۔ سموئیل پیپز (Samuel Papys) کے زمانہ میں دو قحبہ خانوں کی آمدنی ڈیوک آف یارک کو ملا کرتی تھی۔

جب ڈین (Danes) قوم نے انگلستان پر حملہ کیا تو وہ بھی انگریزی اخلاقیات جنسی کو کوئی ترقی نہ دے سکے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ڈین لوگ روزمرہ اپنے بالوں میں شانہ کیا کرتے اور دیگر طریقوں سے اس قدر اپنے آپ کو سنوارتے کہ اینگلو سیکسن قوم کی عورتوں کے لیے دل کا سنبھالنا مشکل ہو گیا اس زمانہ میں ایک قانون یہ تھا کہ جو کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی بیوی سے زنا کرے اسے ایک مقررہ رقم بطور تاوان شوہر مظلوم کو دینی پڑے گی علاوہ ازیں اس شوہر کے لیے دوسری عورت بھی بہم پہنچانی پڑے گی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کسبیاں ضرور موجود تھیں اور فحاشی کوئی بڑا جرم خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اگر کسی کسان کی بیوی کی عصمت دری کر دی جاتی تھی تو اس کے شوہر کو بیس روپیہ کے قریب تاوان دلایا جاتا تھا اور اگر کسی شریف یا امیر کی بیوی سے زنا کیا جاتا تھا تو اس کا تاوان زیادہ سے زیادہ دو تین سو روپیہ تک ہوتا تھا لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اس قانون کے باعث زنا میں ترقی نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ معاوضہ وغیرہ کی الجھنوں میں پھنسنے سے زیادہ آسان یہ تھا کہ آدمی کسی پبلک قحبہ خانہ میں چلا جائے۔

نارمن (Norman) حملہ آور ڈین قوم سے بھی زیادہ شائستہ تھے۔

چنانچہ نارمن لوگوں کی فتح کے بعد انگلستان میں نظام جاگیرداری
کو بجید زور ہو گیا اور اسی کے ساتھ ملک کو تجارتی و حرفتی اہمیت بہت حاصل
ہو گئی۔ چونکہ اس عہد میں براعظم یورپ کا انگلستان سے بہت کچھ تعلق ہو گیا
تھا اس لیے اس دور کا اثر بہت سی صورتوں میں فحاشی پر بھی ہوا۔

قانون جاگیرداری کی رُو سے اگر کوئی شخص رعایا میں سے کسی تعلقدار
کی بیوی سے ناجائز تعلق پیدا کرتا تھا تو ضبطی زمین کی سزا دی جاتی تھی۔ لیکن
اگر خود تعلقدار اپنے سے کم درجہ شخص کی بیوی کی آبروریزی کرتے تھے تو اس کو
کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ بعض اوقات مقتدایان دین قانون جاگیرداری کے خلاف
عدل و انصاف اور درستی اخلاق کا تقاضہ کرتے تھے لیکن چونکہ کلیسا والوں
کے خیالات چنداں بلند نہ تھے اور وہ خود بھی مبتلائے معصیت رہتے تھے
اس لیے ان کا اثر عیاش تعلقداروں اور زانیوں پر بہت کم پڑتا تھا۔ ولیم فورس
(William Rufus) کے عہد میں اس مسئلہ پر بہت بڑا جھگڑا پیدا ہوا
کہ کلیسا کے بیچی کے اسقف کسی شخص کو زنا کے جرم میں بلا اجازت بادشاہ
سزا دے سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن آخر کار بہت سے مقتدایان دین نے یہی
پسند کیا کہ بادشاہ کے خلاف جھگڑا کرنا مناسب نہیں۔

انگلستان میں ۱۲۳۶ء ہنری سوم پر مسئلہ پیش ہوا کہ جو بچے شادی سے قبل پیدا
ہوں لیکن بعد میں ان کے والدین شادی کر لیں تو وہ بچے جائز شمار ہوں گے یا

ناجائز۔ اس کے متعلق مذہبی اور ملکی قوانین میں اختلاف تھا۔ ملکی قانون کی رُو سے ایسے بچے ناجائز تھے لیکن اسقفوں کا فتویٰ یہ تھا کہ وہ اپنے والدین کے جائز وارث ہیں اور ان کو جائز اولاد کے دیگر حقوق بھی حاصل ہیں اور چونکہ جائز و ناجائز اولاد کا جھگڑا مذہبی عدالتوں میں پیش ہوتا تھا اس لیے اسقفوں کی رائے غالب رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ آزادانہ بغیر ازدواج کے طور پر اپنے گھروں میں بلا نکاح عورتیں رکھنے لگے۔

قرون وسطیٰ کی جرمنی میں فحاشی

قرون وسطیٰ میں جرمنی کے قانون کی رُو سے اگر کوئی آزاد لڑکی یا کتخدا عورت شہر کے اندر مبتلائے فحاشی ہوتی تھی تو اس کو پکڑ کر تین سو کوڑے مارتے تھے۔ اور اگر کسی لڑکی کے والدین اس کی فحاشی پر راضی ہوتے تھے تو ان کو بھی سزائے تازیانہ دی جاتی تھی۔ یہی قانون ان کنیز و اور ملازم عورتوں پر عائد ہوتا تھا جو پیشہ کرتی تھیں۔

لیکن قرون وسطیٰ میں جرمنی نے اس باب میں بہت رواداری سے کام لیا کیونکہ دیگر بلادِ یورپ کی طرح یہاں کے امرا اور اسقف بھی قحبہ خانوں کی جلب منفعت کرتے تھے۔ چنانچہ شہر مینز (Mainz) میں پندرھویں صدی کے اندر تمام قحبہ خانوں کے مہتمم ارباب کلیسا ہی ہوا کرتے تھے۔

پندرھویں صدی میں شہر اولم (Ulm) کی میونسپلٹی نے اپنے

قحبہ خانے لوگوں کو ٹھیکہ پر دیدئے اور ٹھیکہ داروں نے وعدہ کیا کہ وفاداری سے شہر کی خدمت انجام دیں گے۔ کوئی مال مسروقہ اپنے گھروں میں رکھیں گے ہنگامے اور بلوے کبھی نہ ہونے دیں گے اور ہر قحبہ خانہ میں ہمیشہ صاف ستھری اور تندرست عورتیں رکھا کریں گے۔ ان کو حکم تھا کہ کسبیوں کو مقررہ قیمت کی خوراک دیجائے۔ جو دن گوشت کے مقرر تھے اس روز اُن کو گوشت کی دو چیزیں دیجاتی تھیں۔ جمعہ کے دن اور ایام صیام کے زمانہ میں، گوشت یا بھنے ہوئے کبابوں کی جگہ انڈے اور مچھلی دیجاتی تھی۔ اگر کوئی کسبی باہر سے کھانا منگانا پسند کرتی تھی تو مہتمم قحبہ خانہ اسے تقریباً چھ آنہ ادا کرتا تھا جو عموماً گھر کے کھانے کی قیمت ہوتی تھی۔ مہتمم کے لیے یہ بھی لازم تھا کہ وہ قحبہ خانہ کی کسبیوں کے ہاتھ بشرط طلب فروخت کریں۔

شہر اولم کے ہر قحبہ خانہ میں نقدی کا ایک صندوقچہ ہوتا تھا۔ جس کی ایک کنجی مہتمم کے پاس، دوسری ایک کسبی کے پاس اور تیسری خزانچی کے پاس رہتی تھی۔ ہر روز کی آمدنی تمام کسبیاں اسی صندوقچہ میں داخل کرتی تھیں۔ جس کا ایک تہائی حصہ قحبہ خانہ کے مالک کو ملتا تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص زیور وغیرہ دے جاتا تھا تو وہ عورت ہی کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔

پندرھویں صدی کے آخر میں شہر ہیمبرگ میں تمام قحبہ خانے ایک خاص محلہ میں محدود کر دیئے گئے تھے اور ہر چند اسوقت یہ قحبہ خانے میونسپلٹی

کی ملکیت نہیں تھے لیکن میونسپلٹی کی طرف اُن پر ایک خاص ٹیکس ضرور عاید کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں کارخانوں وغیرہ میں بھی بغیر لائسنس بہت فحاشی ہوتی رہتی تھی۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں جرمنی کے اندر یہ میلان پیدا ہوا کہ اخلاقِ عامّہ سے کلیسیا کی نگرانی موقوف کر دی جائے اور نہایت سخت قوانین اس باب میں نافذ کیے گئے۔ چنانچہ زانیہ اور دلّالہ دونوں کو کبھی کبھی سزائے موت بھی دی گئی۔ مگر عام سزا ایسی تھی۔ کہ سر مونڈ کر تمام عمر چہرہ پر ایک نقاب پہننے پر اسے مجبور کیا جاتا تھا۔

لیکن چونکہ گھر کی بیویوں کی عصمت عفت کی بہت کچھ قدر کی جاتی تھی اسلئے فحش کار واج بڑھا اور اس حد تک اسے ضروریات زندگی میں داخل کر لیا گیا کہ اگر کسی قرضخواہ کو اس بات کی ضرورت پڑتی تھی کہ وہ قرضدار پر نالش کرنے کے لیے گھر سے باہر کسی سرائے میں قیام کرے تو اُسے حق حاصل تھا کہ وہ اپنی رقم مطالبہ میں قیام سرائے کے مصارف فحاشی بھی شامل کر لے برلن وآئنا اور دیگر بلادِ جرمن کے سرکاری حساب کتاب میں ایسی رقمیں بھی پائی جاتی ہیں جو سفراء اور دیگر معزز مہمانوں کی تفریح طبع کے لیے عورتوں کو اُجرت میں دی گئی تھیں۔ اگرچہ فحاشی صرف ناکتخدا لوگوں کے لیے جائز خیال کی جاتی تھی۔ لیکن ان معزز مہمانوں میں جن کی اس طرح عزت افزائی اور خاطر

مدارات کی جاتی تھی۔ بہت کم ایسے ہوتے تھے جن کی بیویاں موجود نہ ہوں۔

قرونِ وسطیٰ کی جرمن معاشرت میں سفری رقاصائیں بھی بہت کچھ اہمیت رکھتی تھیں۔ اکثر صورتوں میں یہ عورتیں اپنے پیشہ کے علاوہ یوں بھی کمائی کرتی تھیں۔ حروبِ صلیبیہ کے بعد ممالکِ مشرق سے بہت سی ناچنے والیاں جرمنی اور یورپ کے دیگر مغربی ممالک میں آئیں جن کے ناچ سخت ہیجان انگیز ہوتے تھے اور زراعت پیشہ طبقہ کی عورتوں نے بھی بہت جلد ناچ سیکھ لیے اور پھر یہ رقص ان اضلاع میں بھی پھیل گیا جہاں وہ مشرقی رقاصائیں نہیں پہونچی تھیں۔

قرونِ وسطیٰ کے فرانس میں فحاشی

گال(۱) اور فرنیک(۲) اقوام میں فاحشہ عورتوں کیلئے سخت سزائیں مقرر تھیں۔ یہاں تک کہ سنگساری کی بھی سزا موجود تھی لیکن ان سزاؤں کا موقع شاذ و نادر ہی کبھی پیدا ہوتا تھا کیونکہ ان قوموں میں کوئی باقاعدہ شہری زندگی نہیں پائی جاتی تھی۔ اگرچہ رومیوں کی فتوحات تک ان ممالک میں کوئی باقاعدہ ادارہ فحاشی کا نہ تھا لیکن ناجائز تعلقات جنسی کے واقعات اکثر دیکھے

(۱) گال قوم ملک گال کی باشندہ تھی اور ملک گال (Gaul) میں وہ ملک شامل تھے جنھیں آجکل فرانس و بلجیم کہتے ہیں علاوہ ازیں اس ملک میں کچھ حصہ ہالینڈ، سوئزرلینڈ اور جرمنی کا بھی شامل تھا۔

(۲) فرنیک (Frank) ایک جرمن نژاد قوم تھی جس نے چھٹی صدی میں ملک فرانس کو فتح کیا۔

جاتے تھے خصوصاً اس وقت جب کوئی زبردست فتح حاصل ہوتی تھی
یا جب کوئی سالانہ جشن منایا جاتا تھا۔

رومیوں کے عہد میں شہر مشالیا موجودہ مارسیلز (Marseilles) بہت کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ فروغ تجارت کی وجہ سے وہاں کے قحبہ خانوں میں خوب چہل پہل رہتی تھی۔ علاوہ ازیں رومی فوجی بھی اپنے ساتھ ہزاروں عورتیں لے آئے تھے جو پیشہ ور تھیں۔

فرنیک قوم کے سردار اکثر ایک سے زیادہ عورتیں پاس رکھتے تھے ان میں ایک تو اصلی بیوی ہوتی تھی اور باقی اس کی مدخولہ یا حرمیں ہوتی تھیں۔ الغرض دسویں اور گیارھویں صدی تک پیشہ فحاشی کم جاری ہوا تھا۔

شہنشاہ شارلمین (Charlemagne) کے قوانین میں فحاشی قطعی ممنوع تھی۔ راہبوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ بدچلنی کی زندگی چھوڑ دیں اور راہبہ عورتوں کو تنبیہ کی تھی کہ وہ "کسبی۔ چور اور قاتلہ" ہونا چھوڑ دیں تمام کسبیوں اور فاسقوں کو کوڑے مارے جانے کا حکم تھا۔

لیکن امراء اور پادریوں کو مدخولہ عورتیں رکھنے کی اجازت تھی۔
پادریوں کو نکاح کرنے کی بھی اجازت تھی لیکن شہنشاہی قوانین عبارت اور زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نکاح کے جھگڑے کو خود پسند نہیں کرتے تھے۔

قرون مظلمہ میں اعلیٰ طبقوں کے اندر ازدواجی وفاداری برزبرتہ

مفقود ہوتی جاتی تھی جس کی ابتدا ار بادشاہوں کی طرف سے ہوئی اور پھر طبقۂ امرا اور مقتدایان دین نے بادشاہوں کی تقلید کی، چنانچہ بڑے بڑے گرجاؤں پر سنگتراشی کے ذریعہ سے اکثر ایسے مناظر کندہ ہونے جانے لگے تھے جنھیں فی زمانہ بھی ہرگز پبلک میں نہیں لایا جا سکتا۔

تیرھویں صدی میں لوئی سینٹ دہم نے انسداد فحاشی کی بے سود کوشش کی۔ ۱۲۲۵ء میں لوئی نہم (سینٹ لوئی) نے جو زیادہ متقی و پرہیزگار بادشاہ تھا ایک فرمان جاری کر کے تمام کسبیوں اور چکلہ والیوں کو ملک سے نکال دیا اور جو لوگ پھر پیرس واپس آگئے تھے انھیں سخت سزائیں دی گئیں۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ کیونکہ دوسری عورتوں نے بہت جلد انکی جگہ لے لی اور شرابخانوں فحاشی کا چرچا بڑھ گیا۔ علاوہ ازیں چاروں طرف سے شکایتیں ہونے لگیں کہ لوگوں سے بیویوں اور بیٹیوں کی عزت آبرو بچانا ناممکن ہوگیا ہے۔

مجبورًا یہ فرمان دو سال بعد منسوخ کرنا پڑا اور کسبیوں کا اہتمام ایک سرکاری عہدیدار کے سپرد کر دیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ جو عورتیں قواعد مقررہ کی خلاف ورزی کریں انھیں گرفتار کر کے سزا دے۔ اسکے ساتھ شہر پیرس کے ایک خاص محلہ میں کسبیوں کو محدود کر دیا گیا اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ بیش قیمت لباس اور زیور نہ پہنیں۔

بڑھاپے میں شاہ سینٹ لوئی نے اپنے بیٹے کو جو بعد میں فلپ سوم

کے نام سے بادشاہ ہوا طلب کرکے حکم دیا کہ وہ ۱۲۵۴ء کا فرمان پھر جاری کردے لیکن اس کے نفاذ کی کوشش نہیں کی گئی۔

قرون وسطیٰ کے فرانسیسی لٹریچر میں بہت سے حوالے ایسے ملتے ہیں کہ میزبان نے اپنی بیوی مہمان کے نذر کردی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے فرانس میں عورت کی حالت کس قدر ذلیل تھی۔ چونکہ ابتدا میں نکاح کے لئے عورتیں خریدی جایا کرتی تھیں۔ اسلئے بطور مہمان نوازی کسی مہمان کو ایک دو رات کے لیے اپنی بیوی دیدینے کا خیال عجیب نہ سمجھا جاتا تھا۔

قرون وسطیٰ کے بعض مشہور واعظین بدکاریوں کے خلاف بہت کچھ وعظ کہا کرتے تھے اور ان لوگوں کے وعظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں گرجا گھر بھی قحبہ خانوں کا کام دیتے تھے۔ ان وعظوں میں راہبوں، گرجاؤں کے پادریوں اور اسقفوں کو جو پارسائی کے عہد وپیمان پر قائم نہیں رہتے تھے سخت فہمائش کی گئی ہے۔ بقول ان واعظین کے بہت سے راہبہ خانے درحقیقت حرم سرائیں تھے جنمیں ہر قسم کی خلاف فطرت حرکتیں ہوا کرتی تھیں۔

قدیم مورخین کے قول کے مطابق قرون وسطیٰ کی بہت سی رسمیں عام قانون اخلاق سے متجاوز تھیں۔ مثلاً ۲۸ دسمبر کو جب یوم معصومین (Innocents Day) منایا جاتا تھا تو مردوں کو بہت سویرے لڑکیوں کی خوابگاہوں میں داخل ہونے کی اجازت تھی۔ اگر اس وقت بھی لڑکیاں سوتی تھیں تو مردوں کو

اجازت تھی کہ وہ انھیں گدگدائیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر کھلا ہوا گندہ مذاق ہوتا تھا۔ بلکہ یہ بات پر لطف خیال کی جاتی تھی کہ جب دولھا اور دلھن تنہا ہوں تو انھیں روزن دیوار سے جھانکا جا سکے۔ ہندوستان میں بھی یہ دستور کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔

شہنشاہ شارلمین کے قوانین میں بعض ان مخنچی فرقوں کے لیے بھی سزائیں مقرر تھیں جو عیاشی کیا کرتے تھے۔ اسکے بعد کی صدیوں میں سحر و ساحری اور مذہبی تازیانہ زنی کا بھی لوگوں کے اخلاق پر بہت کچھ اثر پڑا۔ مذہبی شہسواروں کے فرقہ ٹمپلر (Templars) کا فرانس کے بادشاہ فلپ چہارم نے استیصال کر دیا تھا اور اس فرقہ کے بہت سے آدمیوں کو اس الزام میں سزائے قتل دی گئی تھی کہ وہ خلاف فطرت حرکتوں میں مبتلا تھے۔ اسمیں شک نہیں کہ بادشاہ نے یہ عمل رعایا کی درستی اخلاق کے خیال سے نہیں بلکہ حرص و آز سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ تاہم اس امر کا ثبوت واقعی موجود تھا کہ اس فرقہ کے لوگ خلاف فطرت جرائم کے مرتکب ہوا کرتے تھے۔

اس زمانہ میں کسبیوں سے زیادہ تعرض نہ کیا جاتا تھا لیکن اُن کو یہ حکم ضرور تھا کہ وہ اپنے لباسوں پر نشانات مقررہ لگائیں تاکہ اُنکے پیشہ کی شناخت ہو سکے۔ شہر اوینان میں تمام کسبیاں سیاہی مائل لباس میں بائیں بازو پر ایک سفید قوس یا کمان لگا لیا کرتی تھیں اور اگر لباس کا رنگ ہلکا ہوتا تھا تو

اس قوس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا تھا۔ پیرس میں بھی اسکی پابندی ہوتی تھی۔ علاوہ اس کے ان کو یہ بھی حکم تھا کہ وہ بازاروں میں باریک لباس، ریشمی پوشاک اور زیور وغیرہ پہن کر نہ نکلیں۔ اگر کوئی عورت ممنوعہ لباس پہن کر نکلتی تھی تو اس کا لباس وہیں پشت کی طرف سے چاک کر دیا جاتا تھا اور نیلام کر کے اس کا روپیہ سرکاری خزانہ میں داخل ہو جاتا تھا۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں پیرس کے اندر بعض کسبیوں کو زندہ جلا دیا گیا اور بعض کو شہر میں تمام دن برہنہ گشت کرانے کے بعد شام کو ان کے بال جھلس دیے گئے۔ سرِعام تازیانہ زنی اور گوش تراشی بھی کبھی کبھی ہوتی تھی۔

فرانس کے بہت سے صوبجات میں تعلقداروں نے کسبیوں پر ٹیکس لگانا شروع کر دیا تھا اور شہر تولوز میں ایک یونیورسٹی اور ایک بہت بڑا قحبہ خانہ قائم کیا گیا جسے لوگ (Great Abbey) کہتے تھے۔ تمام پیشہ ور عورتیں جو اپنا کام جاری رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ قحبہ خانہ کے اندر رہنے پر مجبور تھیں، ان کی تنخواہیں بھی مقرر تھیں اور ان کے ذریعہ سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ میونسپلٹی اور یونیورسٹی میں تقسیم ہو جاتی تھی۔

جب شاہ چارلس ششم شہر تولوز میں گیا تو تمام سرکاری کسبیاں اس کا خیر مقدم اور سلام کرنے حاضر ہوئیں۔ اسوقت انھوں نے درخواست کی کہ انھیں نیلے بازو پر سفید فیتہ پہننے سے معاف کیا جائے کیونکہ اس سے ان کا

پیشہ ظاہر ہو جاتا ہے اور لوگ ان کی بے عزتی کرتے ہیں۔ بادشاہ نے انکی خواہش کے مطابق فرمان جاری کر دیا لیکن اس سے تولوز کے لوگ ناخوش ہوئے اور اگر کوئی کسبی امتیازی نشان کے بغیر باہر پھرتی تھی تو اسے غضبناک مجمع کے ہاتھوں پٹنے کا خطرہ ہوتا تھا۔ اس سے عاجز آکر انھوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ وہ قحبہ خانہ کے اندر رہی رہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی اور بلدیہ کی آمدنی بیحد گر گئی مجبور ہو کر انھوں نے بادشاہ سے اپیل کی۔ اب بادشاہ کو معلوم ہوا کہ لوگوں نے فرمان شاہی کو ٹھکرا دیا ہے۔ لہذا اس نے اپنا خاص تکونیہ نشان قحبہ خانے کے دروازے پر لگوا دیا۔ مگر اس پر بھی اہل تولوز مصر رہے کہ کسبیاں امتیازی نشان ضرور استعمال کریں۔

آخر کار کسبیاں اس قحبہ خانہ سے چلی گئیں اور شہر کے دوسرے حصہ میں جا کر رہنے لگیں جہاں انھوں نے بدمعاشوں کی ایک جماعت کو اپنی حفاظت کے لئے رکھ لیا۔ ایک صدی بعد شہر تولوز نے کسبیوں کے لئے ایک "ہریاول گھر" (Green House) تعمیر کر دیا جو بہت عرصہ تک قائم رہا۔

قرون وسطیٰ کے فرانس میں بعض ساہوکاروں نے بھی چکلے قائم کر لئے تھے چنانچہ اہل لومبارڈی کو کئی بڑے اپنے قحبہ خانہ رکھنے کے حاصل تھے۔

جس میں دلکش حمام بھی موجود تھے۔ یہ قحبہ خانے کئی پشت تک جاری رہے۔

فرانس کے جنوبی صوبجات میں انسداد فواحش کی بہت کچھ کوششیں کی گئیں لیکن ناکام رہیں۔ بعض اوقات کسبیوں اور ان کے چاہنے والوں کو برہنہ تن بازاروں میں نکالا گیا۔ کتنیوں کو آہنی قفس میں بند کرکے دریا میں غرق کر دیا گیا، لیکن یہ مشغلہ بند نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

عہد جدید اور فحاشی

تمہید اکثر مورخین سولھویں صدی کو قرونِ وسطیٰ اور عہد جدید کے درمیان ایک حدِ فاصل قرار دیتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں جو دماغی اور معاشری ترقیاں ہوئیں وہ اس قدر اہم نہیں تھیں جتنی سترھویں اور اٹھارویں صدی کی ترقیاں ثابت ہوئیں سنہ ۱۶۰۰ء کے یورپ کے تمدن میں جس قدر باتیں قرونِ وسطیٰ کی موجود تھیں وہ ہمارے زمانہ میں نہیں ہیں۔

بہرحال موضوع زیرِبحث کے لحاظ سے وہ دس برس جو سنہ ۱۵۰۰ء سے پہلے گذرے اور بیس سال اسکے بعد کے خاص اہمیت رکھتے ہیں سنہ ۱۴۹۲ء میں کولمبس (Columbus) نے جزائرِ غرب الہند دریافت کیے اور منجملہ دیگر چیزوں کے دنیائے جدید نے یورپ کو آتشک بھی عطا فرمائی سنہ ۱۵۱۷ء میں لیوتھر (Luther) نے شہر وائمبٹرگ کے ایک گرجا کے دروازہ پر اپنے بچانوے دعاوے چسپاں کیے اور سنہ ۱۵۲۹ء میں جون کالون "ایمان لایا" سنہ ۱۵۰۰ء تک فنِ طباعت کافی ترقی کر چکا تھا، جس کے ذریعہ سے تمام یورپ میں یونانی زبان پھیل گئی۔ جب سنہ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ

فتح کرلیا تو بازنطینی علماء و فضلاء تمام مغربی یورپ میں منتشر ہو کر پھیل گئے۔

احیاء علوم و فنون (Renaissance) اصلاحات مذہبی (Reformation) اور اکتشافات امریکہ نے تمام یورپ کے عوام کی معاشرت میں تغیر تو ضرور پیدا کیا لیکن یہ تغیرات بہت دھیمی رفتار سے ہوئے۔ اور عام طور پر قرون وسطیٰ کی طرز معاشرت ۱۵۰۰ء سے بھی آگے بہت عرصہ تک قائم رہی یعنی جو حالت کسبیوں کی ۱۳۰۰ء میں تھی تقریباً وہی حالت ۱۷۰۰ء میں بھی رہی اور سچ پوچھئے تو ان کی یہی حالت غالباً ۱۲۰۰ء ق م۔ میں بھی تھی۔ ۱۷۵۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان جو زمانہ گزرا اس میں لوگوں کی قدامت پرستی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور اٹھارویں صدی کے اواخر میں فرانس کے اندر ایک زبردست بیداری کا امکان پیدا ہوگیا جس نے انیسویں صدی میں ایک عظیم انقلاب صنعت و حرفت میں پیدا کرکے اس کے اثرات کو بہت زیادہ مستحکم کردیا۔

آتشک

محققین کے نزدیک ابھی تک یہ مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا کہ آتشک کی ابتدا کہاں اور کیونکر ہوئی بعض شہادتیں اس نظریہ کی مؤید ہیں کہ جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اس وقت تک مرض آتشک اہل یورپ کو معلوم نہیں تھا اور بہت ممکن ہے کہ جو لوگ کولمبس کے ساتھ گئے تھے ان میں سے بعض ۱۴۹۳ء اور ۱۴۹۴ء میں یہ

بیماری جزیرہ ہائیٹی (Haiti) سے لائے۔

پندرھویں صدی کے آخر میں تمام یورپ میں آتشک کی بیماری وبا کی طرح پھیل گئی۔ جب چارلس ہشتم شہر نیپلز میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ لوگ ایک بیماری میں مبتلا ہیں جسے وہ "مرض الافرنج" ([illegible]) یعنی فرانسیسی بیماری کہتے ہیں اور ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بیماری فرانسیسی سپاہیوں کی لائی ہے۔ لیکن در حقیقت اس مرض کے ذمہ دار وہ ہسپانوی سپاہی تھے جو چارلس کی فوج میں ملازم تھے۔

بلادِ اطالیہ کی یہ "فرانسیسی بیماری" بہت جلد سواحل شمالی افریقہ اور انگلستان میں پہونچی اور وہاں "ہسپانوی بیماری" کے نام سے مشہور ہوئی پرتگال میں اس کا نام "مرض قسطانہ" تھا اور سواحل شام و فلسطین پر اس کا نام "آبلہ فرنگ" یا "مسیحی بیماری" مشہور ہوا اور جب یہ ناپاک بیماری اقصائے مشرق میں پہونچی تو وہاں "مرض پرتگیزی" کہلانے لگی۔ یہ بات بہت جلد ظاہر ہو گئی تھی کہ یہ خوفناک بیماری مجامعت سے پیدا ہوتی ہے خصوصاً جب کسبیوں سے واسطہ رکھا جائے۔ چنانچہ سنہ ۱۵۰۰ء سے قبل ہی اس انکشاف کی بنا پر بعض مقامات میں قحبہ خانے بند کر دیے گئے اور بہت سے شہروں میں احکام جاری ہو گئے کہ جو کسبیاں مبتلائے آتشک ہوں وہ اپنا کام بند کر دیں۔

اس جدید مرض متعدی کا علاج کرنے پر اطبا عام طور سے راضی نہ ہوتے تھے اور جن اطبا نے اپنے پیشہ کی عزت و شان کا خیال نہ رکھ کر آتشک زدہ مریضوں کا علاج بھی کیا تو وہ مرض کو شفا دینا تو کجا اس کی رفتار کو بھی نہ روک سکے۔ اس مرض کے معالجہ میں عموماً چوب چینی استعمال کی جاتی تھی ۱۴۹۶ء میں بمقام وینس اور ۱۴۹۷ء میں بمقام پیرس بہت جلد "آتشک خانے" تعمیر کر دیے گئے۔

اگرچہ آتشک زدہ کسبیوں کے خلاف احکام جاری کرنا بہت اچھی بات تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ ارباب حل و عقد کو معلوم بھی نہ ہونے پاتا تھا کہ کون آتشک زدہ ہے اور کون نہیں۔ اس کے بعد ضرورت سمجھی گئی کہ قحبہ خانہ کی کسبیوں کا معائنہ کرایا جائے اور جن پر آتشک زدہ ہونے کا شبہ ہوا انہیں شہر بدر کر دیا جائے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شہر سے باہر جا کر اپنا پیشہ کرنے لگتی تھیں اور بیماری کو پھیلاتی تھیں۔

۱۵۰۱ء تک ہسپانیہ کے شہر ویلنشیا (Valencia) میں طبی معائنہ کا ایک نظام قائم ہو گیا تھا۔ ہر عورت کو جو قحبہ خانہ میں داخل ہونا چاہتی طبیب سے ایک سند حاصل کرنا پڑتی تھی اور میونسپلٹی کے اسپتال میں ایسی گندی بیماریوں کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کیا گیا۔ جب سرکاری طبیب کسی کو آتشک زدہ خیال کرتا تھا تو اس کا علاج اسی جگہ

ہوتا تھا۔ تجربہ خانے کے مہتمموں کو حکم تھا کہ اگر کسی پر آتشک کا شبہ ہو جائے
تو فوراً رپورٹ کریں۔ لیکن فی الحقیقت یہ طبّی قیود بے سود ثابت ہوئیں۔

پیرس کے ارباب حل و عقد نے سنہ ۱۶۱۴ء تک کوئی اسپتال ایسا
نہیں کھولا تھا جو آتشک زدہ مریضوں کے علاج کے لئے موزوں ہو۔ اس
سے پہلے آتشک زدہ کسبیوں کو بغرض معالجہ ہر جگہ داخل کر لیا جاتا تھا اور
آتشک زدہ مردوں کو بھی بڑے اور چھوٹے شفاخانوں میں داخل کر لیتے تھے۔

اٹھارھویں صدی تک بھی پیرس کی کسبیاں سرکاری طور پر علاج
کرانے سے گریز کرتی تھیں کیونکہ شفاخانوں میں ایک تو کھانا اچھا نہیں
ملتا تھا۔ دوسرے طرز بود و باند بھی سخت ناپسندیدہ تھا اور ایک ہی
کمرہ میں آٹھ آتشک زدہ عورتیں سویا کرتی تھیں۔ علاوہ اس کے علاج
بھی داخل ہونے سے مہینوں بعد تک شروع نہ ہوتا تھا۔ ان کو علاج
کے لئے نمبر وار انتظار کرنا پڑتا تھا اور جب تک کسی کا نمبر آتا تھا۔ اُس وقت
تک بیماری ناقابل علاج ہو جاتی تھی۔ نہانے دھونے کیلئے کوئی سہولت
نہ تھی۔ پلنگ کی چادریں بھی بہت کم تھیں اور جو تھیں بھی وہ برسوں
دھوبی کا منہ نہ دیکھتی تھیں۔

عہد جمہوریت میں بہت سی اصلاحات جاری ہوئیں یعنی ایک نیا
شفاخانہ ایسے مریضوں کے لیے تعمیر کیا گیا جسمیں حمام اور غسل خانے بھی تھے اور علاج

میں بھی کافی سہولتیں تھیں۔ مردوں کے لیے علیحدہ شفاخانہ بنادیا گیا عورتوں کے لیے علیحدہ۔

۱۸۰۳ء تک پیرس کی کسبیاں باقاعدہ طبی معائنہ کے لیے مجبور نہ کی جاتی تھیں وہ معائنہ کنندہ کو ایک خاص فیس ادا کیا کرتی تھیں اور یہ حضرت معائنہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے تھے اس لیے بعد میں طبی معائنہ میں سختی کی گئی اور اچھے اچھے اطباء کی خدمات اس کام کے لیے حاصل کی گئیں۔

جب آتشک کی بیماری تمام یورپ میں وبا کی طرح پھیل گئی تو اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ انفرادی حیثیت سے اس ناپاک مرض کی رفتار کو کیونکر روکا جائے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کر کے نوجوانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ قحبہ خانوں سے پرہیز کریں لیکن اس کا اثر کچھ نہ ہوا۔

الغرض ۱۵۰۰ء سے ۱۸۰۵ء تک انسداد آتشک کی جو کوششیں بھی ہوئیں وہ اکثر ناکام رہیں اور اس سلسلہ میں نہ قحبہ خانوں کا کوئی معقول انتظام ہو سکا نہ فحاشی کو دنیا سے مٹایا جا سکا۔

اصلاحات فرقہ پروٹسٹنٹ

جب ۱۵۱۱ء میں مارٹن لوتھر شہر روم گیا تو وہ کٹر رومن کیتھولک تھا لیکن جو کچھ اس نے وہاں دیکھا اسی نے اسکو پروٹسٹنٹ بنادیا۔ اس زمانہ

میں دو باتیں خاص طور پر دنیا میں مشہور تھیں۔ ایک تو یہ کہ بڑے بڑے مذہبی عہدے فروخت کیے جاتے ہیں۔ دوسرے جو لوگ پاپائے اعظم کے عزیز یا رشتہ دار ہوتے ہیں۔ ان کا خاص لحاظ کیا جاتا ہے۔ لیکن ان سب باتوں سے زیادہ جس چیز نے اسکی طبیعت پر اثر کیا وہ یہ تھی کہ پاپائے اعظم کے مقدس دربار میں حد درجہ فحاشی ہوتی تھی۔ اسوقت شہر روما کسبیوں سے اور عہدیداران کلیسا کی آشناؤں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور مذہبی جوش و خروش قطعی مفقود تھا۔ اس نوجوان جرمن پادری نے دفعتاً کوئی جدید مسلک جاری نہیں کیا بلکہ سب سے پہلے اس نے وہ اسباب پیش کئے جن کی بنا پر وہ کلیسا سے باغی ہوا تھا اسنے ۱۵۱۷ء تک جبکہ ٹزیل (Tetzel) (ایک اعلیٰ عہدیدار کلیسا) نے پادریوں کے حقوق فروخت کرنے شروع کئے اپنا یہ عقیدہ علی الاعلان ظاہر نہیں کیا کہ "نجات صرف دین سے حاصل ہو سکتی ہے"۔ اسکے دو سال بعد اس مصلح نے اعلان کر دیا کہ پاپائے اعظم اور اسکی کونسل معصوم نہیں ہیں۔ ۱۵۲۵ء میں (اور یہی بات ہمارے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے) لیوتھر نے کیتھرینا فان بورا سے نکاح کر لیا جو راہبہ تھی اور لیوتھر کی طرح ہمیشہ پارسا رہنے کا عہد و پیمان کر چکی تھی۔

وہ کہتا تھا کہ جس طرح کھانا پینا اور سونا فطری باتیں ہیں اسی طرح عورت اور مرد کا ملنا بھی حسب تقاضائے فطرت ہے۔ ایک روز اس نے بیان کیا کہ:

"اصول ازدواج تمام مخلوقات میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ جانور تو درکنار پھول تک نر و مادہ سے خالی نہیں ہیں!"

لہذا پادریوں کا تجرد سخت لغو بات ہے۔

لیوتھر کا عقیدہ تھا کہ مرد عورتوں سے افضل ہیں۔ وہ نہایت شدومد کیساتھ کہتا تھا کہ عورت کو لازم ہے کہ اپنے شوہر کی مرضی کے تابع رہے۔ ریاست ہیسی (Hesse) کے بادشاہ فلپ کا قول یہ تھا کہ طلاق دیکر عورتیں چھوڑنے سے یہ بہتر ہے کہ مرد کثرت سے عورتیں رکھے۔ جو شادی شدہ عورتیں لاولد رہتی تھیں وہ ان کو یہ صلاح دیا کرتا تھا کہ وہ بچہ جننے کیلئے خفیہ طور پر کوئی دوسرا خاوند رکھ لیں۔ لیوتھر کا عقیدہ یہ تھا کہ جب تک عورت کے اولاد نہ ہو وہ مکمل نہیں ہوتی۔ قرون وسطیٰ کے اس عقیدہ کی لیوتھر سخت مخالفت کرتا تھا کہ عورتیں قابل نفرت ہیں اور ناپاک اور گنہگار ہیں مگر اسے اس خیال سے ہرگز اتفاق نہ تھا کہ فحاشی ایک ناگزیر معصیت ہے۔ وہ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پہ خوب جانتا تھا کہ ایک جوان آدمی بالطبع خواہ کتنا ہی شہوت پرست کیوں نہ ہو لیکن وہ اگر چاہے تو مجرد رہ سکتا ہے۔ اسی لیئے وہ قحبہ خانوں کے خلاف کھلم کھلا وعظ کیا کرتا تھا۔ ۱۵۶۲ء میں جب بلدیۂ نورمبرگ کے ارباب حل و عقد نے شہر کا قحبہ خانہ بند کیا تو انھوں نے ایک وجہ یہ بتائی کہ اسکے سبب سے آتشک پھیلتی ہے اور دوسری وجہ یہ ظاہر کی کہ بعض پروٹسٹنٹ پادریوں کے وعظ و نصیحت نے

انھیں ایسا کرنے پر مائل کیا۔ اسی طرح جب قحبہ خانوں کے خلاف لگاتار وعظ ہوئے تو ۱۵۲۳ء میں شہر اولم کا قحبہ خانہ بند کردیا گیا اور فرینکفرٹ اور دیگر بلاد میں بھی اس کا تتبع کیا گیا۔ مگر یہ امتناعی احکام زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے۔

لیوتھر راہبوں اور ننوں کو نصیحت کرتا تھا کہ وہ نکاح کرلیں جس کا سبب تھا کہ تجرّد کی زندگی میں وہ بہت زیادہ گناہ کے مرتکب ہوتے تھے ورنہ لیوتھر اسکے نزدیک میاں بیوی کے تعلقات بھی ناجائز تھے اگر انہیں لذت نفسانی شامل ہوجائے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کی بعض انتہا پسند جماعتیں جو لیوتھر کے زمانہ میں پیدا ہوگئی تھیں وہ بلا قید نکاح عورتوں سے جنسی تعلقات رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک اُن کا معیار اخلاق بمقابلہ کیتھولک یا پیروان لیوتھر زیادہ بلند تھا۔ وہ کہتے تھے کہ انفرادی حیثیت سے کسی قسم کی ملکیت یا جائداد رکھنا فرمان یسوع کے قطعی خلاف ہے۔ فرقہ موراویہ (Moravians) میں جنھیں اخوان متحد (Unni Ted. Brothers.) بھی کہتے تھے عام رواج تھا کہ عورت مرد کا جوڑا قرعہ اندازی ملاتے تھے کیونکہ ان کے یہاں یہ تعلیم تھی کہ انسان کو ہرگز حصول انفرادیت کی کوشش نہ کرنا چاہیے۔

لیوتھر کے علاوہ ایک اور شخص کالوین فرانس میں پیدا ہوا۔ اوّل اوّل اُسے مذہبی تعلیم دلائی گئی تھی لیکن بعد کو اس کے والد نے اس پر زور دیا کہ

پیشہ وکالت اختیار کرے۔ چونکہ اس زمانہ میں اہل کلیسا سخت بدچلن تھے اس لئے کالوین اکیس ۲۱ سال کی عمر میں پیشہ وکالت ترک کرکے اصلاح کلیسا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مگر جب اہل کلیسا نے اسے بہت پریشان کیا تو وہ ترک وطن پر مجبور ہوگیا۔ مگر جینوا پہنچکر اسکا اثر اور زیادہ بڑھ گیا اور سیاسی سردار بھی بن گیا۔ کالوین ایک زاہد خشک آدمی تھا۔ اسکا سب سے پہلے خیال یہ تھا کہ فحاشی کا استیصال کیا جائے اس نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اس نے تھیٹر بند کرادیے۔ بہت سے تہوار موقوف کردیے اور ہر قسم کے جشن شادمانی کے خلاف فتوی دیدیا۔ جان ناکس (Knox) نے جو کالوین ہی جیسا خشک مزاج آدمی تھا کالوینیٹ کی تبلیغ اسکاٹ لینڈ میں کی جہاں اس کا نام (Pres By Terianism) ہوا۔

لیکن یہ ناممکن تھا کہ کالوین اور ناکس جیسی طبیعت ان کے تمام مریدوں کی بھی ہوتی۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ جب لوگوں کی رنگ رلیاں بند کردی گئیں تو ملک میں دیگر قسم کے افعال شنیعہ کی وبا پھیل گئی اور فحاشی خفیہ طور پر ہونے لگی۔

دور احیاء علوم و فنون

قرون وسطی کے فنون لطیفہ کا تعلق تمام تر کلیسا ہی سے تھا۔ بڑے بڑے گرجا۔ مقدس تصویریں پادریوں کے مجسمے وغیرہ سب مشہور و معروف مصوروں اور ماہران فنون

لطیفہ ہی کے رہین منت تھے۔ عریاں تصاویر اور بتوں کا تعلق بھی زیادہ تر کلیسا ہی سے تھا۔

اس دور کا آغاز اطالیہ سے ہوا اور تمام یورپ میں پھیل گیا سولہویں صدی میں جو انگریز سیاح اطالیہ سے اپنے وطن کو واپس آتا تھا تو جدید تہذیب سے پوری آراستہ ہو کر آتا تھا، اسے لاطینی و یونانی ادبیات کا شوق ہوتا تھا، اسے فلورنس۔ روما اور ونیس کی تصاویر، بت تراشی اور فن شعر میں درک ہوتا تھا۔ علم مجلس میں بھی طاق ہوتا تھا اور اپنے احباب میں اطالوی عیش پسند امرا کی رنگ رلیوں کے حالات بیان کرتا تھا اس وقت اطالیہ کی آزادی و خوش عیشی کا یہ عالم تھا کہ دسترخوان پر جو ظروف نقرئی رکھے جاتے تھے اُن پر بھی عریاں و فحش تصویریں منقوش ہوتی تھی۔

احیاء علوم و فنون کے زمانہ میں اطالیہ کے اندر بہت کم کسبیاں اچھی تعلیمیافتہ تھیں لیکن کسی قدر ادبیات اور موسیقی کی تعلیم ان کو ضرور دیجاتی تھی ان میں سے بعض اپنی حاضر جوابی اور شیوا بیانی کے لئے مشہور تھیں لیکن یہ باتیں انہی کیلئے مخصوص نہ تھیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں مصر کی عورتوں میں بھی بہت آزادی پیدا ہو گئی تھی اور بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی و خوش لباسی میں وہ کسبیوں سے کسی طرح کم نہ تھیں۔

اسوقت ایک دو کسبیاں شاعر ہونے کی حیثیت سے بھی ممتاز تھیں

اور ایسی تو اکثر تھیں جو مصوّروں اور بت سازوں کے سامنے بیٹھ کر اپنے خوبصورت جسم کا نمونہ پیش کیا کرتی تھیں۔

اعلیٰ طبقہ کی کسبیوں میں روزانہ غسل کرنے کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا اور وہ پانی میں قیمتی عطر اور خوشبوئیں ڈال کر نہایا کرتی تھیں۔ سولھویں صدی میں اطالوی کسبیاں سنہرے بال بےحد پسند کرنے لگیں۔ اس لیے جن کے بال قدرتاً سنہرے نہیں ہوتے تھے وہ اپنے بالوں کا رنگ مختلف طریقوں سے اڑا کر سنہرا بنایا کرتی تھیں۔

زیادہ مشہور اور اونچے درجہ کی کسبیاں لباس اور زیور پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کیا کرتی تھیں اور جو زیادہ صاحب استطاعت تھیں وہ خواتین دربار کا سا بیش قیمت لباس پہنتی تھیں۔ عموماً یہ عورتیں غازہ اسفیدہ اور خضاب و رنگ استعمال کرتی تھیں جس کا مقصد زیب و زینت نہیں بلکہ اپنے معائب چھپانا ہوتا تھا۔

قرون وسطیٰ اور کسبیوں کو جو امتیازی نشانات استعمال کرنا پڑتے تھے وہ رفتہ رفتہ غائب ہو گئے تھے اور لباس کی یکرنگی و یکسانی میں سب عورتیں برابر تھیں قیمتی لباس، ریشمی کپڑے، نفیس زیور کا ہر جگہ ہر طبقہ میں رواج ہو گیا تھا اور آرائش و زیبائش معاشرت کا ضروری جزو ہو کر رہ گئی تھی۔

واضح ہو کہ انگریزی لفظ کورٹی زن (Courtesan) (کورٹ + زن)۔

درباری عورت) غالباً فرانسیسی لفظ "کورٹی زین" (Courtisane
کورٹ + زین = زینت دربار) سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں "دربار شاہی
کی عورت"۔ ممکن ہے کہ یہ لفظ بالواسطہ یا بلاواسطہ اطالوی لفظ کورٹی
زیانہ" (Courtegiana) سے نکلا ہو جو سولھویں صدی میں اونچے درجہ
کی کسبیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دربار شاہی
کی عورتیں کس اخلاق کی ہوتی تھیں۔ ان درباری عورتوں میں درباریوں کی
بھی بیویاں ہوتی تھیں اور معمولی لوگوں کی بھی۔ یہ شائستہ فحاشی قدیم یونانی
یا رومی فحاشی کا تتمہ نہ تھی بلکہ قرون وسطیٰ کی ان ترقی یافتہ فحاشیوں کی
ایک دلفریب صورت تھی جس نے قرون وسطیٰ کی آخری صدیوں میں بادشاہ
پاپائے اعظم اور امراء و شہزادگان کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ دولت کے
دریا بہتے ہوئے اطالیہ میں چلے آتے تھے۔ تکلفات اور عیش پرستیوں کا سیلاب
اُمنڈ رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ متعدی بیماری طبقۂ اعلیٰ سے گزر کر طبقۂ اوسط و
ادنیٰ میں بھی پھیل گئی اور اطالوی تہذیب فرانس۔ انگلستان۔ بلجیم۔ ولندیز
اور جرمنی پر بھی مسلط ہو گئی۔

اگرچہ وقتاً فوقتاً تدابیر انسداد عمل میں لائی جاتی لیکن بایں ہمہ
استلذاذ بالمثل قرون وسطیٰ کے اطالیہ میں نہایت استحکام کے ساتھ جڑ پکڑتا
جاتا تھا۔ حسن پرستی زن و مرد دونوں کا مشغلہ تھا اور ابتدائی سی نوعمر

لڑکے اطالوی کسبیوں کا مقابلہ کرنے لگے تھے۔ آخرکار شہر وینس میں کسبیوں
نے مجبور ہو کر مردوں کا لباس پہنا اور لڑکوں کی طرح بال بنانے شروع
کر دیے تاکہ لوگوں کے اس ذوق کو بھی تسکین پہنچے۔
اطالیہ سے یہ علت فرانس میں پھیلی اور شاہ ہنری ہشتم اس باب میں
بہت مشہور ہو گیا۔ لوئی چہاردہم کے زمانہ میں دربار کے اندر ایک کلب
ہی اس مقصد کیلئے قائم ہو گیا۔ انگلستان میں جب دور ملوکیت دوبارہ
قائم ہوا تو وہاں کے طبقۂ امراء میں بھی اس کا شوق پایا جاتا تھا۔

معاشری و صنعتی تغیرات

سولھویں صدی کے اوائل میں اہل یورپ
کی اکثریت زراعت فلاحت میں مصروف
رہتی تھی، لوگ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے۔
کبھی کبھی پھیری والے بساطی یا ناچنے گانے والوں کی ٹولیاں گاؤں میں
آ جاتی تھیں۔ گاؤں والوں کی دنیا ان کا وہی چھوٹا سا مزرعہ اور اُس کے
اردگرد کی قابل کاشت زمین تھی۔ ان کے خیال میں سب سے بڑی عظمت:
جلال والی چیز قریب ترین قصبہ کا بڑا گرجا تھا۔ جسے غالباً انھوں نے
کبھی دیکھا نہ تھا بلکہ صرف اس کا حال سُن لیا تھا۔ لیکن قصبہ اور شہر کے باشندوں کا
مطمح نظر اس قدر محدود نہ تھا۔ اُن کی ملاقات بڑے بڑے سیاح تاجروں سے
ہوتی رہتی تھی۔ مذہبی زیارتوں اور حروب صلیبیہ کی وجہ سے مختلف اقوام و

ملل کے لوگوں سے ربط ضبط پیدا ہو گیا تھا لیکن ان لوگوں میں سولھویں اور سترھویں صدی تک قومیت کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ طلبار کی مشترکہ زبان ضرور لاطینی تھی اور ہر جگہ شریعت علیسوی کا زور شور تھا جس کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ اخلاقیات جنسی کو تار عنکبوت کی طرح توڑ دیا جاتا تھا۔

قرون وسطیٰ میں جس قدر یکسانیت وہم آہنگی نظر آتی تھی عہد جدید میں اسی قدر اختلاف و تضاد دکھائی دیتا ہے۔ بعض مقامات بلحاظ تجارت و صنعت بہت جلد ترقی کر گئے اور بعض کی حالت وہی رہی جو قرون وسطیٰ میں تھی۔ اب لوگ ہر چیز کو وطنیت کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور تمام مغربی اور وسطی یورپ میں پاپائیت کی جگہ مختلف مذہبی اور فرقہ وارانہ جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ باہر سے قہوہ اور چائے آنے لگی تھی اور ان کے آتے ہی ملک میں قہوہ خانے کھلنے شروع ہو گئے تھے جو بعد کو قحبہ خانوں کا کام دینے لگے۔ وینس اور پیرس کی عورتوں کے لیے دور دور سے عطریات آنے لگے۔ امریکہ سے تمباکو بھی آ پہنچا جس کے آتے ہی تمام یورپ خصوصاً بلاد جرمن میں تمباکو کی دوکانیں کھل گئیں اور کسبیوں کو سگرٹ نوشی کا شوق ہو گیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے اب تک تمباکو پینے والی عورتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

قرون وسطیٰ میں بھی منشی چیزوں کا استعمال ہوتا تھا لیکن سولھویں

صدی سے تو شراب کا استعمال نمایاں طور پر بہت بڑھ گیا کیونکہ کاریگروں اور مزدوروں کے پاس بھی اسباب تعیش کے لیے روپیہ کافی موجود تھا۔

جس زمانہ کا ہم حال بیان کر رہے ہیں اس زمانہ میں شراب خانوں اور شراب کے گوداموں کا فحاشی سے بجید تعلق تھا اور اٹھارویں صدی میں ایسے میخانے جہاں لطف رقص و سرود بھی حاصل ہوتا بہت ترقی کر گئے تھے۔

تجارت و حرفت کی ترقی سے ملک میں بڑے بڑے شہر پیدا ہونے لگے۔ چودھویں صدی کے لندن کی آبادی صرف ۳۵ ہزار تھی لیکن ۱۶۰۰ء میں ڈھائی لاکھ ہو گئی، ۱۷۰۰ء میں سات لاکھ اور ۱۸۰۰ء میں دس لاکھ کے قریب ہو گئی۔ پیرس میں جو قرون وسطیٰ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا اس وقت اسکی آبادی ایک لاکھ تھی، جو ۱۷۰۰ء میں ۵ لاکھ ہو گئی اور انقلاب فرانس کے وقت سات لاکھ۔ اسی طرح وائنا کی آبادی جو ۵۰ ہزار تھی ۱۸۰۰ء تک چوگنی ہو گئی۔ شہر ہمبرگ عہد وسطیٰ میں ایک اہم تجارتی شہر تھا اور اس وقت اسکی آبادی تقریباً ۲۰ ہزار ہو گی مگر یہی آبادی ۱۸۰۰ء تک ایک لاکھ ہو گئی الغرض جو مقامات قرون وسطیٰ میں محض چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے وہ ۱۸۵۰ء تک بڑے بڑے شہر بن گئے تھے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ قوم کی آبادی میں اضافہ ہو گیا تھا، بلکہ دراصل گاؤں کی آبادی شہروں میں آ گئی تھی۔

دور جدید کی ابتدائی صدیوں میں جوں جوں صنعت و حرفت، زراعت

فلاحت اور کاروبار تجارت کو ترقی ہوتی گئی۔ فحاشی بھی بڑھتی رہی کیونکہ انقلاب فرانس کے بعد بہت سے قیود رفع ہوگئے تھے اور قرون وسطیٰ کے آئین و قوانین اور حرفتی پنچایتیں بھی روبہ زوال تھیں۔

سولھویں صدی میں اسپین کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی تھی خصوصاً اس وجہ سے کہ اسے نئے نئے ملک مل گئے تھے۔ ایک زمانہ میں یہاں کی نصف آبادی کی بسر اوقات تجارت و حرفت خصوصاً اونی و ریشمی کپڑوں کی صنعت پر تھی لیکن اسے بھی زوال ہوگیا کیونکہ مذہبی تعصبات سے مجبور ہو کر عیسائیوں نے ملک سے تمام مسلمانوں اور یہودیوں کو نابود کردیا تھا اور یہ مشہور صنعت و حرفت انہی لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔

عہد جدید کی ابتدائی صدیوں میں انگلستان اور یورپ کے نشیبی ممالک یعنی بلجیم اور ولندیز نے بہت جلد ترقی کی۔ بعد ازاں جرمنی خصوصاً ریاست پروشیا کو اہمیت حاصل ہوئی۔ جوں جوں قرون وسطیٰ کی بیڑیاں کٹتی گئیں سائنسدان لوگ دل لگا کر کام کرنے لگے۔ ایجادات و اختراعات کا بازار گرم ہوگیا۔ میکانکی ترقیاں ہونے لگیں اور شہروں کی حالت بالکل بدل گئی۔ انگلستان میں جو حرفتی انقلاب واقع ہوا وہ اٹھارویں صدی کے آخری دس سال اور انیسویں صدی کے ابتدائی بیس سال کے اندر رونما ہوا بعد ازاں یہ حرفتی انقلاب تمام یورپ، امریکہ اور ایشیا تک وسعت پذیر ہوگیا۔

اس زمانہ میں مختلف قسم کی ترقی یافتہ مشینیں وجود میں آئیں۔ ذرائع نقل و حمل میں ترقی ہوئی اور بڑے بڑے کارخانے تعمیر ہو گئے۔ مشینوں کی ایجاد سے حرفت کی یہ حالت ہو گئی کہ گاؤں کا ایک کسان یا شہر کا ایک کاریگر بہت سے آدمیوں کا کام جو پرانی وضع کے بھدے اوزاروں سے کام کرتے تھے، تن تنہا کر لیتا تھا۔ اس سے نہ صرف کامیاب سرمایہ داروں کے گھروں میں دولت کے انبار لگ گئے بلکہ عوام بھی مالدار ہو گئے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ قرون وسطیٰ کے بادشاہ کو بھی اتنا سامان راحت و آرام حاصل نہ تھا جس قدر عہد جدید کے ایک گدا کو حاصل ہو گیا۔ لیکن اس انقلاب کا ابتدائی زمانہ کاریگروں کے لیے نہایت سختی کا زمانہ تھا۔ کیونکہ مشینوں کی ایجاد نے ان کو بالکل نادار بنا دیا تھا اور ان کی مانگ بہت کم ہو گئی تھی۔

مثلاً ایک جولاہے کو لیجیئے کہ جب یہ خود کام کرتا تھا تو اسکے کارخانہ میں دو چار کاریگر بھی تھے جنہیں ہر شخص فی ہفتہ قمیص کے قابل دو تھان اتارتا تھا لیکن جب مشینیں چل گئیں جن کے ذریعہ سے ایک ناتجربہ کار بچہ بھی ایک ہفتہ میں ایسے تھان دس سے لیکر بیس تک اتارنے لگا تو قدرتی بات تھی کہ قیمت کم ہو جائے لیکن اس منفعت عامہ سے اس غریب جولاہے کی کمر ٹوٹ گئی جس کا کاروبار بالکل تباہ ہو گیا اور جسے مجبور ہو کر اپنے لڑکوں کو دو چار آنے کی مزدوری پر کسی کارخانہ میں بھیجنا پڑا۔ رہ گئیں لڑکیاں سو جب تک

باپ کا کام اچھا چلتا تھا دنیا بھر کی نعمتیں حاصل تھیں لیکن اب بقدر کفاف بھی انھیں میسر نہ تھا اسلئے وہ نہایت آسانی سے مکار کٹنیوں کے پھندے میں پھنس جاتی تھیں اگر وہ کسی کارخانہ میں جاکر کام کرتیں تو وہاں بھی کوئی عزت نہیں کرتا تھا۔ سرمایہ داروں کو جن کے گھر دولت کے انبار لگ گئے تھے بہت بڑی سیاسی طاقت بھی حاصل ہو گئی تھی اس لئے انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے گداگروں کی اولاد کو کام کرنے پر مجبور کیا گیا اور پانچ پانچ چھ چھ سال کے لڑکوں اور لڑکیوں سے روزانہ سترہ چودہ گھنٹہ تک مشینوں پر کام لیا جانے لگا۔
مشینوں اور کارخانوں کے نگراں کار مزدوروں اور کاریگروں سے وہی برتاؤ کرنے لگے جو گرفتار شدہ غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کارخانے صبح چھ بجے کھلتے تھے اور اگر کسی جلاہے کی لڑکی رات کو دیر تک سوتی رہی یا بجائے چھ بجے کے چھ بجکر پانچ منٹ پر پہونچی تو ان کو چابک سے مارا جاتا تھا۔
بیسویں صدی کے جدید انگلستان میں چونکہ کارخانوں کے مہتموں کو مزدوروں کے علحدہ کر دینے کے اختیارات حاصل تھے اس لئے کام کرنے والوں کے لیے اور زیادہ دشواریاں پیدا ہو گئیں۔ اس کے اور جو نتائج بھی پیدا ہوئے ہوں۔ لیکن ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جو لڑکیاں وہاں کام کرتی تھیں ان کا چال چلن خراب ہو گیا اور قحبہ خانے اُن سے آباد ہونے لگے۔

۱۸۴۸ء میں "لندن ٹائمز" کا ایک نامہ نگار شہر کو ایک محتاج خانہ کا معائنہ کرنے گیا۔ اس نے دیکھا کہ تمام بچے تندرست اور مطمئن نظر آتے ہیں لیکن لڑکیاں وہاں موجود نہ تھیں نامہ نگار نے مہتمم سے دریافت کیا کہ لڑکیاں کیا ہوئیں تو اُس نے جواب دیا کہ چودہ سال کی عمر میں لڑکیوں کو بطور خادمہ کام کرنے کیلئے باہر بھیجا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوّے فیصدی ان میں سے کوچہ گرد کسبیاں بن گئیں۔ کیونکہ اسوقت یورپ کے اکثر ممالک میں قحبہ خانوں کی اہمیت بہت کچھ زائل ہو گئی تھی اور آزادانہ اِدھر اُدھر پھر کر فحاشی کرنے کے مواقع بہت حاصل تھے۔

قرونِ وسطیٰ میں انگلستان کے اندر قحبہ خانوں کا کام حماموں سے بھی لیا گیا اور یہ سلسلہ اٹھارویں صدی تک جاری رہا لیکن ۱۸۰۰ء میں بعض ممالک کے اندر ساحلی تفرج گاہیں بھی جو اِس مشغلہ کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔

اسی طرح تھیٹر بھی بہت دنوں تک یہ خدمت انجام دیتے رہے چنانچہ شیکسپیر کے زمانہ میں بھی انگلستان کے بیشتر تھیٹر قحبہ خانوں کے قریب ہی ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تھیٹر کی زندگی معیوب سمجھی جاتی تھی اور اسٹیج پر کوئی عورت کام نہیں کرتی تھی۔ تماشائی بھی اکثر مصنوعی چہرے لگا کر آیا کرتے تھے اور اس طرح کسبیوں کو بھی مصنوعی چہرے لگا کر تھیٹر میں جانے کا موقع مل جاتا تھا جب انگلستان میں دورِ ملوکیت

دوبارہ قائم ہوگیا تو تھیٹروں اور پیشہ ور عورتوں میں اور زیادہ تعلق پیدا ہوگیا یعنی عورتیں بھی تھیٹروں میں زنانہ پارٹ کرنے لگیں، جن میں اکثر کا چال چلن اچھا نہیں ہوتا تھا۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں فرانس کے اندر مشتبہ چلن کی ایکٹرسیں بہت مشہور تھیں اور تھیٹروں کی غلام گردشوں اور گیلریوں میں کسبیوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔

فرانس سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک

فرانسیس اوّل کے عہد میں (سنہ ۱۵۱۵ء سے سنہ ۱۵۴۷ء تک) فرانس اور خصوصاً دربار شاہی پر اطالوی اثرات بہت زیادہ قائم تھے اور لوئی چہاردہم کا جانشین ہنری دوم تو حد درجہ رنگیلا فرمانروا تھا اور اسکے دربار میں عیش و نشاط کی غیر فطری صورتیں بھی ممنوع نہ تھیں۔

کیتھرائن ڈی میڈیا (Catherine De media) اپنے ساتھ اطالیہ سے سیکڑوں کسبیاں فرانس میں لے آئی تھی اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ان عورتوں سے سیاسی کام لیا کرتی تھی یعنی اُن کو حکم تھا کہ وہ مدبّرین دربار سے مل کر ان کے راز معلوم کرتی رہیں۔

چارلس نہم کے عہد میں ایک قانون پاس کیا گیا کہ پیرس کے تمام قحبہ خانے توڑ دیے جائیں اور خلاف ورزی قانون کے لیے سزا کے چوب نی یا گرم لوہے سے داغ دینا مقرر کیا گیا۔ اُس سے وہ قحبہ خانے تو بند ہوگئے

جن میں کھلم کھلا فحاشی ہوتی تھی لیکن خفیہ طور پر یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔
۱۶۳۵ء میں اُن مردوں کے لیے جو کسبیوں کے ذریعہ سے کسب معاش کرتے تھے۔ تعزیری قانون وضع کیا گیا اور سترھویں صدی میں بعض فرامین ایسے جاری کیے گئے جن کی رو سے اُن مردوں کو سزائے جرمانہ دیجاتی تھی جو قحبہ خانوں میں آتے جاتے تھے لیکن سوائے ایک مرتبہ کے عملاً ان فرامین کا نفاذ کبھی نہیں ہوا۔

پولیس کو بہت وسیع اختیارات دیدیے گئے تھے اور کئی بار پولیس نے اُن اختیارات سے کام لیکر پیرس کی پیشہ ور عورتوں کو گرفتار کرکے فرانس کی امریکانی نوآبادیات میں بھیجدیا جن میں سے بعض نے تو خوش حال لوگوں سے نکاح کرلیا لیکن بعض نے اپنے پیشہ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔

لوئی چہاردہم کے زمانہ میں تقریباً بیس برس تک پیرس کے لوگوں کے اخلاق غنیمت رہے یعنی علانیہ فحاشی تقریباً مفقود ہوگئی اور تھیٹروں میں بھی بیہودہ مذاق قطعی بند ہوگیا لیکن لوئی پانزدہم کی کمسنی کے زمانہ میں جب ریجنسی برسر اقتدار تھی پھر دورِ فحاشی شروع ہوا اور جب لوئی پانزدہم بڑا ہوگیا تو اس نے حد درجہ رنگین زندگی بسر کرنی شروع کی۔ چنانچہ اس بادشاہ نے اپنے لیے ایک خاص عیش خانہ تعمیر کرایا اور پوری دادِ عیش دی۔

اسکے بعد لوئی شانزدہم اور اسکی ملکہ نے درستی اخلاق میں سختی سے

کام لیا۔ لیکن بایں ہمہ بہت سے شہزادوں اور بڑے بڑے امراء نے لوئی کو چہاردہم اور لوئی پانزدہم کی جوانی کی روایات کو بدستور قائم رکھا اور پرائیوٹ عیش خانے جنھیں "نوردمحل" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا منہدم نہ ہو سکے اور بعد کو یہ ایک فیشن ہو کر رہ گیا چنانچہ اٹھارویں صدی کے وسط میں جب ایک جرمن سیاح پیرس کی سیر کرنے گیا تو یہ بات دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کتنی بڑی تعداد آدمیوں کی فحاشی کے ذریعے سے بسر اوقات کرتی ہے۔ بہت سے والدین اپنی لڑکیوں کو فحاشی پر مجبور کرتے تھے کیونکہ لوئی پانزدہم کے گماشتے حسین وجمیل دوشیزہ لڑکیوں کے لیے بڑی بڑی رقمیں پیش کرتے تھے اور اسی کے ساتھ یہ خیال بھی تھا کہ کسی لڑکی کا بادشاہ کی معشوقہ بننا کوئی ذلت کی بات نہیں۔ لطف یہ ہے کہ اسی زمانہ میں تعزیری قوانین بھی فحاشی کے خلاف جاری تھے۔ لیکن ان کا نفاذ صرف غرباء کے خلاف ہوتا تھا اور امراء اور رؤساء عملاً مستثنیٰ تھے۔

اٹھارویں صدی کے قحبہ خانوں میں فرانسیسی، ہسپانوی، ولندیزی اور جرمن تمام اقوام وملل کی لڑکیاں پائی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ حبشی لڑکیاں بھی رکھی جاتی تھیں۔ قحبہ خانوں کی بعض لڑکیاں اوسط درجہ کے اچھے گھرانوں کی ہوتی تھیں اور بعض راہبہ خانوں سے بھگائی ہوئی ہوتی تھیں۔ ان قحبہ خانوں کو خوب شہرت دیجاتی تھی اور انکے ایجنٹ غیر ملکی

یا اجنبی سیّاح کے سامنے ایک کارڈ پیش کرتے تھے جس پر قحبہ خانہ کا پتہ اور وہاں کی خصوصیات درج ہوتی تھیں۔

قحبہ خانوں کے مینیجر چونکہ سامان خورد و نوش اور شرابیں بھی فروخت کرتے تھے، اس لیے اُن کو بڑی معقول آمدنی ہوتی تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہ قحبہ خانے قمار خانے بن جاتے تھے۔

کہتے ہیں کہ جس عیش خانہ کا نام پہلے رائل (Palais Royal) تھا وہاں ہر شب ڈیڑھ ہزار عورتیں جمع ہو جایا کرتی تھیں۔ اس جگہ تھیٹر بھی تھے قہوہ خانے بھی تھے، فیشن ایبل دوکانیں بھی تھیں، آراستہ کمرے بھی تھے جن میں عورتیں رہتی تھیں اور بہت سے خوش وضع لوگوں نے اس مقصد کے لیے باقاعدہ کلب بنا رکھے تھے۔

استیصال ملوکیت کے بعد فرانس کے دورِ آزادی نے جس قدر آزادی اس پیشہ کو دیدی اتنی بادشاہوں نے بھی کبھی نہ دی تھی۔ چونکہ اس زمانہ میں لوگوں کی زندگی ہر وقت خطرہ میں تھی اسلیئے لوگ یہ سمجھ کر کہ چندروزہ زندگی میں جسقدر مزے اُڑا لے جا سکتے ہیں، اُڑا لیئے جائیں بُری طرح شہوت رانی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ کسبیوں پر الزام عائد کیا گیا کہ یہ طرفداران ملوکیت میں سے ہیں کیونکہ جو بڑی بڑی رقمیں انھیں بادشاہ یا امراء کے ہاتھوں ملتی تھیں وہ دورِ جمہوریت میں کہاں نصیب ہو سکتی ہیں۔

لیکن آخرکار فتح کسبیوں ہی کو حاصل ہوئی اور حکومت کی طرف سے
اجازت ہوگئی کہ جہاں چاہیں پھریں اور جو چاہیں کریں لیکن ۱۷۹۸ء میں
یہ طریقہ جاری ہوا کہ ان کے نام درج رجسٹر کیے جانے لگے اور انکا باقاعدہ
معائنہ ہونے لگا پھر بعد کو یہ قاعدہ بہت جلد تمام بلاد یورپ میں جاری ہوگیا۔

بعض مورخین لکھتے ہیں کہ ۱۸۱۰ء بمقام پیرس تقریباً بیس ہزار کسبیاں
موجود تھیں ۱۸۳۲ء میں شہر کے اندر ایسے قحبہ خانے جو سرکاری رجسٹروں
میں درج تھے ۲۲۰ تھے اور ایسی عورتوں کو بازاروں گرجاؤں اسکولوں یا
طلبا کی اقامت گاہوں کے قریب رہنے کا حکم نہیں تھا۔ ہر قحبہ خانہ ایک
عورت کے اہتمام میں ہوتا تھا جس کا نام پولیس میں درج رہتا تھا یہ عورت
وہ ہوتی تھی جو کبھی خود بھی پیشہ ور رہ چکی تھی لیکن کسی جرم میں سزایاب نہیں ہوئی تھی۔
اس کو حکم تھا کہ وہ قحبہ خانہ کی ہر عورت کا رجسٹر رکھے اور منجملہ دیگر امور کے یہ
بھی لکھا کرے کہ سرکاری طبیب نے اسکا معائنہ کن کن تاریخوں میں کیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بھرتی کرنے کا ایک خاص میدان
تھا جہاں امراض متعدیہ میں مبتلا ہونے والی عورتوں کا علاج ہوتا تھا،
انیسویں صدی کے وسط میں کسبیوں کی بہت بڑی بین الاقوامی تجارت بھی پائی
جاتی تھی جس کا تعلق لڑکیوں کی خرید و فروخت سے تھا۔
۱۸۴۰ء اور ۱۸۵۰ء میں پیرس کی کسبیوں کو تنخواہ کچھ نہیں ملتی تھی بلکہ

صرف کھانا کپڑا اور رہنے کو مکان ملتا تھا۔ اگر انھیں کوئی چھوٹا موٹا زیور، یا کوئی اور سامان تعیش درکار ہوتا تھا تو وہ مہتمہ سے قرض لے لیا کرتی تھیں اور چونکہ یہ ان سے کبھی ادا نہ ہو سکتا تھا اس لیے وہ بیچاریاں غلام بنی ہوئی قحبہ خانہ میں پڑی رہتی تھیں۔ چھوٹی عمر کی لڑکیوں کو قحبہ خانہ میں داخل کرنے سے قبل ان کے والدین کی اجازت لینی پڑتی تھی۔

انگلستان سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک

سولھویں صدی کے اندر انگلستان میں کئی بار انسداد فحاشی کی کوشش کی گئی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شکسپیر کے زمانہ میں عورتوں کو بجرم فحاشی تازیانے مارے جاتے تھے۔ لیکن پھر بھی ان کی تعداد کافی تھی۔

عیسائیوں کے فرقہ پیورٹن (Puritans) نے کسبیوں کے خلاف نہایت تشدد آمیز آئین و قوانین اختیار کئے یعنی سنہ ۱۶۰۰ء میں ایک قانون وضع ہوا جس کی رو سے کسبیوں کو سر عام کوڑے مارے جاتے تھے یا انھیں شکنجہ میں کس دیا جاتا تھا یا لوہا گرم کر کے ان کی پیشانی پر حرف B داغ دیا جاتا تھا، یا انھیں تین سال کی قید کر دی جاتی تھی اگر ایسا شخص دوبارہ ماخوذ ہوتا تھا تو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا۔

جب شاہ چارلس دوم آوارہ دشت غربت ہو کر

رنگیلے سربازوں نے یہ تمام طریقے درہم برہم کر دیے اور پھر رنگ رلیاں شروع ہو گئیں لیکن طبقۂ متوسط پر اس کا بہت کم اثر پڑا۔

چارلس کے بعد جیمس دوم تخت نشین ہوا جو یقیناً پارسا تو نہ تھا لیکن چارلس کی طرح عیش کوش بھی نہ تھا۔ اس کے بعد جارج سوم کا زمانہ آیا جو بہت محتاط تھا لیکن جارج چہارم ایسا نہ تھا ملکۂ وکٹوریہ کے زمانہ میں عصمت و عفت کا بڑا لحاظ تھا اور وہ فحاشی کے رواج کو بہت ناپسند کرتی تھی۔

جرمنی سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک

یہ پہلے بیان ہو چکا ہو کہ جب "لیوتھر" کے مذہب کو عروج ہوا تو سولھویں صدی کے از سلطنت روم کے بہت سے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ حصوں میں انسداد فحاشی کے متعلق سخت قوانین جاری کیے گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد خاص طور سے ارباب کلیسا کے اخلاق کو درست کرنا تھا۔ سنہ ۱۵۴۲ء میں چارلس پنجم نے ایک فرمان جاری کیا کہ قحبگی کے رواج دینے والوں کو کوڑے سے مار کر یا کان کاٹ کر ملک سے باہر نکال دیا جائے۔ جرمنی میں بھی اسی قسم کے احکام جاری ہوئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ سترھویں صدی میں ہمبرگ اور دیگر بلاد جرمنی میں ایسے کارخانے قائم کیے گئے جن میں نقض امن کا باعث ہونے والی کسبیاں قید رکھی جاتی تھیں۔ سے پہلے ان عورتوں کو یا تو شہر سے نکال دیتے تھے، یا کوڑے

مارے جاتے تھے، یا اُنھیں شکنجہ میں کس دیا جاتا تھا۔ قیدخانوں میں ان سے سُوت کتوایا جاتا تھا۔ یا کوئی دوسرا سخت کام لیا جاتا تھا لیکن فحاشی موقوف نہ ہوئی۔

سترھویں صدی میں بعض بعض جگہ انکو پنجروں میں بند کر دیا جاتا یا لکڑی کے گھوڑے پر بٹھا کر شہر میں گشت کرایا جاتا تھا۔ شہر وائنا میں بھی اس غرض کیلئے ایک قفس بنایا گیا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو سزائیں ان کو شرم و غیرت دلانے اور رُسوا کرنے کیلئے دیجاتی تھیں ان کا اثر اُلٹا پڑتا تھا کیونکہ پھر اُن کیلئے کوئی اور صورت زندگی کی باقی ہی نہ رہتی تھی۔

انقلاب فرانس کی وجہ سے جرمنی میں فحاشی کا اور بھی زیادہ زور ہو گیا کیونکہ فرانس سے جو امرا فرار ہو کر جرمنی میں پناہ گزیں ہوئے وہ اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو اس طبقہ کے بڑے قدردان تھے۔ کہتے ہیں کہ جب ان لوگوں نے شہر کوبلینز (Coblenz) میں قدم رکھا تو شہر کا ہر گھر فاحشہ خانہ بن گیا۔ اور چند روز میں وادی دریائے رہائن کے تمام شہروں میں آتشک کی بیماری پھیل گئی جس کا نام "تارکان وطن کا تحفہ" رکھا گیا۔

چونکہ لوگ فرانس سے ہجرت کرتے وقت بہت کم روپیہ اپنے ساتھ لائے تھے یا خالی ہاتھ تھے ان سے محنت مزدوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے ان میں بہتیرے دلال بن گئے شہر ہمبرگ میں فرانسیسیوں نے وہ

شائستہ طریقے قحبہ خانوں میں جاری کیے جو اس سے پیشتر خواب خیال میں بھی نہ آئے تھے اسی زمانہ کا ایک مصنف تحریر کرتا ہے کہ:۔

"شراب خانے محل سرا بن گئے اور ہماری لڑکیاں بیگمات بن گئیں
الغرض ان بدچلن بناہ گزینوں نے ہم سب کو "نستعلیق" کر دیا
عیاشوں کے گروہ بلا روک ٹوک ہمارے دل پسند بازاروں میں تیز گامیاں
دکھانے لگے۔ شرم و حیا اور شرافت و نجابت منہ پھیر کر بھاگ گئیں اور
جو چند بھلے آدمی رہ گئے تھے وہ دیکھ دیکھ کر افسوس کرتے تھے۔"

۱۸۰۷ء میں شہر ہیمبرگ کے ارباب حل و عقد نے فحاشی کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا اور کسبیوں پر ٹیکس لگا کر ان کو حکم دیا گیا کہ اپنے نام پولیس کے رجسٹر میں درج کرائیں اور بہ اوقات مقررہ باقاعدہ معائنہ کرائیں۔ ٹیکس کے ذریعہ جو آمدنی ہوتی تھی وہ نفاذ احکام کے مصارف نکال کر میونسپل ہسپتال میں خرچ ہوتی تھی ۱۸۳۴ء میں ہیمبرگ کے ڈائرکٹر سررشتہ پولیس ہڈوالکر نے "نیلی کتاب" کے نام سے ایک مجموعہ ضوابط جاری کیا جس کی رو سے ہر کسبی خواہ وہ علحدہ کمرہ میں رہتی ہو یا قحبہ خانہ میں خود کو پولیس میں درج رجسٹر کراتی تھی اور ایسے گھر میں جہاں فحاشی ہوتی تھی کم از کم ایک عورت ضرور رکھنی پڑتی تھی جو درج رجسٹر ہو اور پولیس کو پورا اختیار بھی حاصل تھا۔ جو عورتیں بطور مدخولہ یا حرم رکھی جاتی تھیں انھیں بھی رجسٹر میں درج کرانا پڑتا تھا لیکن وہ باقاعدہ طبی

معائنہ کے لیے مجبور نہ تھیں۔ بیس۲۰ برس سے کم عمر کی لڑکیوں کو جو پہلے سے پیشہ نہیں کرتی تھیں انھیں درج رجسٹر ہونے سے باز رکھا جاتا تھا بشرطیکہ وہ پہلے سے آبرو باختہ نہ ہوں اور اس پیشہ کے سوا اور کوئی ذریعہ انکی معاش کا نہ ہو۔ پچیس سال سے کم عمر کی کسی عورت کو بشرطیکہ وہ بحیثیت ایک کسبی کے درج رجسٹر نہ ہو کسی قحبہ خانہ میں خادمہ کی حیثیت سے نہیں رکھا جاتا تھا۔ دس برس سے زیادہ عمر کے بچوں کو بھی قحبہ خانہ میں رہنے کی اجازت نہ تھی۔ بازاروں یا سڑکوں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو بلانا ممنوع تھا اور کسی کسبی کو گیارہ بجے کے بعد کسی مرد کو ساتھ لے کر باہر شہر میں پھرنا ممنوع تھا۔ بیس۲۰ برس سے کم عمر کے مردوں کو قحبہ خانہ میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ کسی قحبہ خانہ میں گانے بجانے یا جوا کھیلنے کی اجازت نہ تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں اور شرابوں کی فروخت کے لیے خاص لائسنس لینا پڑتا تھا۔ تمام درج رجسٹر عورتیں ہفتہ میں ایک بار ضرور اپنا طبّی معائنہ کراتی تھیں۔

سنہ ۱۷۰۰ء کے بعد سے ریاست پروشیا میں "معصیت ناگزیر" سمجھ کر فحاشی کی طرف سے چشم پوشی کیجانے لگی۔ پھر سنہ ۱۷۹۲ء میں جدید قانون جاری کیا گیا جسکی رو سے کسبیوں کو چہرہ پر غازہ ملنا جاذب نظر لباس پہننا ممنوع قرار دیا گیا۔ جو عورتیں اوّل اوّل پیشہ اختیار کرنا چاہتی تھیں انھیں اپنا نام پولیس کے رجسٹر میں درج کرانا پڑتا تھا۔ اطبار تمام ایسی عورتوں کو امراض

شنیعہ کی علامت بتا دیتے تھے تاکہ وہ خود اپنے اندر یا آنے جانے والوں میں ان کو پہچان سکیں۔ خلاف ورزی قانون کی صورت میں بڑی سے بڑی سزا تین سال کی قید تھی اور جیلخانہ میں داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کے وقت کوڑے الگ مارے جاتے تھے۔ جو والدین یا اُستانیاں اپنی لڑکیوں یا شاگردوں سے پیشہ کراتی تھیں انھیں کارخانہ میں چھ سال کیلئے بند کردیا جاتا تھا۔ جو مرد امراض خبیثہ میں مبتلا ہو کر پبلک قحبہ خانوں میں آتے تھے اور اُن سے کسی کسبی کو بیماری لگ جاتی تھی تو انھیں علاج کا تمام خرچ دینا پڑتا تھا۔ سزائے جرمانہ یا قید علیٰحدہ دی جاتی تھی۔

۱۸۰۸ء میں برلن کے اندر پچاس قحبہ خانے موجود تھے جن میں ۲۳۰ کسبیاں رہتی تھیں۔ علاوہ ازیں ۲۰۳ ایسی درج رجسٹر تھیں جو الگ مکانوں میں رہتی تھیں اس وقت شہر کی آبادی غالبًا ڈیڑھ لاکھ تھی۔

۱۸۱۴ء میں جب برلن کے قحبہ خانے بند کر دیئے گئے تو شہر میں بڑا جوش پھیلا کیونکہ پرائیوٹ طور پر فحاشی بہت بڑھ گئی تھی اور اسی کے ساتھ آتشک بھی۔ آخر کار فحاشی کو قانوناً پھر جائز تسلیم کر لیا گیا اور وہی پرانا طریقہ پولیس کی نگرانی کا دوبارہ جاری ہو گیا۔

اخلاقِ جنسی

ماضی ــــــ حال ــــــ مستقبل

ماضی شہوانیات یا جنسیات (Sexology) کے طالبعلم پر یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی کہ اخلاق کا مفہوم مختلف قوموں اور زمانوں میں ہمیشہ مختلف رہا ہے یعنی اگر کوئی بات کسی قوم میں کسی وقت معیوب رہی ہے تو دوسری قوم میں اسکو مستحسن سمجھا گیا ہے بلکہ خود ایک ہی قوم نے مختلف زمانوں میں مختلف معیار اخلاقیات کا قائم کیا۔ آج اہل یورپ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے عورت کے احترام و اقتدار قائم کرنے میں غیر معمولی حصہ لیا۔ لیکن انھیں لوگوں پر ایک زمانہ وہ بھی گذر چکا ہے جب عورت ان کے نزدیک بھیڑ بکری سے زیادہ کوئی بلند چیز نہ تھی اور ایک جائداد منقولہ کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ اسوقت بھی حسب بیان مسٹر لوبک (Lubbock) آسٹریلیا میں اسکی تقریباً یہی حالت ہے ذرا ذرا سی بات پر اسکو مارنا حد درجہ وحشیانہ سلوک اسکے ساتھ کرنا معمولی بات ہے، اور اگر بد قسمتی سے وہ کچھ حسین ہوئی تو اور قیامت ہے۔ افریقہ کا حال لوٹرنو (Letourneo) نے لکھا ہے کہ عورت اپنے شوہر کی ملکیت سمجھی جاتی ہے اور مرد کو اختیار ہے کہ

اس سے باربرداری کا کام لے۔ اسی طرح ہمالیہ کے حصّوں میں آریہ ہندؤں نے تبتی قوموں کی طرح اشتراک فی النسواں اختیار کر رکھا ہے اور بازار کی دوسری جنسوں کی طرح عورت کی بھی خرید و فروخت انکے یہاں رائج ہے وہ اپنی لڑکیونکو بھی فروخت کر دیتے ہیں اور مستعد بھائی صرف ایک ہی بیوی پر قناعت کر لیتے ہیں جسے وہ حسب موقع و ضرورت دوسروں کو بھی کرایہ پر دیدیتے ہیں۔

نیوزیلینڈ میں لڑکی کا نکاح کرتے وقت باپ یا بھائی اسکے شوہر سے کہتا ہے کہ "دیکھو اگر تم اس سے مطمئن نہ ہو تو تمہیں اختیار ہے چاہے فروخت کر دو، چاہے مار ڈالو یا رکھا جاؤ۔ الغرض تم اسکے مالک و مختار ہو۔"

پھر یہ حال صرف اُن قوموں کا نہیں جو اب بھی جاہل و وحشی سمجھی جاتی ہیں بلکہ ان پر بھی گزر چکا ہے جو آج تہذیب و شائستگی کی علمبردار بنی ہوئی ہیں۔ چنانچہ روما کے قرونِ اولیٰ میں بھی بیوی محض ایک لونڈی کی حیثیت رکھتی تھی اور مقدس کاتو (Cato) کے اس تاریخی واقعہ سے غالباً ناظرین آگاہ ہوں گے کہ اُس نے اپنی بیوی مارشیا (Marcia) اپنے ایک دوست ہارٹن سیس (Hortensius) کو اُدھار دیدی تھی اور پھر اسکی موت پر واپس لے لی۔ الغرض ان کے یہاں بیوی کی کوئی جداگانہ حیثیت نہ تھی اور بازار کی دوسری معمولی جنسوں کی طرح اس کا لین دین ہو سکتا تھا۔ خود انگریزی قانون میں کسی وقت اس امر کی اجازت پائی جاتی تھی کہ ہر شوہر اپنی بیوی کو

لکڑی سے زدوکوب کرسکتا ہے بشرطیکہ لکڑی انگوٹھے سے زیادہ موٹی نہ ہو۔

اُسوقت ماں، بیٹی، بہن یا اسیطرح کی کسی اور قریبی رشتہ کی عورت سے نکاح کرنا جائز قرار دیا جاتا ہے لیکن عہد عتیق میں اسکو معیوب نہیں جانتے تھے اسٹرابو (Strabo) کا بیان ہے کہ ۲۶ سال قبل مسیح عربوں میں اپنی بہنوں اور ماؤں کیساتھ تعلق جنسی رکھنا کوئی امر قبیح نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ عہد قدیم میں تعلق جنسی محض ضرورتاً آبادی بڑھانے کیلیے پیدا کیا جاتا تھا اور اسمیں کوئی خیال لذت و بدمستی کا شامل نہ تھا چنانچہ تمام ابتدائی مذاہب میں اسکا کچھ نہ کچھ شائبہ پایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے یہاں برہما کا اپنی بیٹی سرسوتی سے شادی کرنا مصریوں میں آموں کا اپنی ماں سے نکاح کرنا اور وڈین کا اپنی لڑکی فرنگا (Frigga) کو قبالہ عقد میں لے آنا۔ جوپیٹر کا اپنی بہن جونو (Juno) سے شادی کرلینا صنمیات کے کھلے ہوئے واقعات ہیں۔

اجتماعی تعلق بھی کسی زمانہ میں بہت عام تھا۔ ہیروڈوٹس نے مساگیٹ (Massagetae) قوم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے یہاں ایک شخص ایک عورت سے شادی کرتا ہے لیکن پوری جماعت اس سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ رواج اور اقوام میں بھی پایا جاتا تھا یہاں تک کہ مصریوں اور یونانیوں میں بھی اس کو برا نہ جانتے تھے۔ چنانچہ اہل بابل میں یہ مذہبی دستور تھا کہ لڑکی مائلیتا دیوی کے معبد میں جاکر اپنی عفت و دوشیزگی قربان کر دیتی تھی اور اسی نوع کی رسمیں آرمینیا، ٹائر اور سارڈن میں بھی پائی جاتی تھیں، لبیان کی

لڑکیاں شادی سے قبل تمام مصارف نکاح اسی طرح کماتی تھیں اور تھریشیا میں بھی یہی رواج پایا جاتا تھا۔

اسوقت بھی جزائر مارکوئساس (Marquesas Islands) نیز جزائر فلپائن کا حصہ ہیں اور بعض افریقی قبائل میں اس طرح کا دستور موجود ہے حال کی بات ہے کہ جزائر بلیرک (Balearic Islands) میں عام طور پر یہ رواج قائم تھا کہ شب زفاف میں پہلے دلہن کے تمام مرد اعزہ ترتیب عمر کے لحاظ سے مستفید ہوتے تھے اور پھر سب سے آخر میں دولہا کو جانے کی اجازت ملتی تھی۔

ملابار میں کلیمر کے لوگ اپنی بیویوں کو بار آور بنانے کیلئے مذہبی پجاریوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور سینی گیمبیا (Senigambia) میں اس خدمت کو سردار قبیلہ انجام دیتا ہے۔ بعض قوموں میں اس غرض کیلئے مخصوص بت بنائے جاتے ہیں اور حق شب اولین (Jus Primae Noctis) کا معاملہ یورپ کے ازمنہ وسطی میں بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔

یونانی تہذیب کی انتہائی ترقی کے زمانہ میں سیفو (Sappho) اور اسکے شاگردوں کا غیر فطری استلذاذ بالنفس میں مشغول رہنا اور سقراط و فلاطون کا بھی مردوں کیلئے اس حرکت کو مناسب و جائز قرار دینا اسکا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ الغرض عہد قدیم میں اخلاق انسانی خواہ وہ جنسیات سے متعلق ہوں یا زندگی کے کسی اور شعبہ سے زیادہ تر مذہبی خیالات کے زیر اثر قائم ہوئے اور دماغ انسانی نہ

ان کے اسباب پر غور کر سکا اور نہ انجام و عواقب پر۔ لیکن بعد کو جب عقول انسانی نے ترقی کی تو اُس نے کچھ نظریے بھی بنائے، دستور العمل بھی مرتب کیا اور علمی و فنی حیثیت سے اس قدر قدم بڑھایا اور اس باب میں زیادہ تر ہم اسی مسئلہ پر روشنی ڈالینگے کہ اہل یورپ جو تہذیب و شائستگی کے بڑے مدعی ہیں اور جو اپنے آپکو عورت کا بڑا محسن سمجھتے ہیں اس باب میں کیا کیا اور آج کیا ہو رہا ہے۔

توریت اور اخلاق جنسی

موجودہ عیسوی اخلاق توریت کی بیان کیے ہوئے اخلاق پر قائم ہیں جن میں انجیل کی بیانات اور دیگر تعبیرات و تفسیرات کے مطابق کچھ حذف و اضافہ کر لیا گیا ہے توریت میں اخلاق جنسی کی ابتدا اس اصول کی بنا پر ہوتی ہے کہ مرد عورت کے درمیان تعلق جنسی افزائش نسل کے خیال سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ توریت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے زائد بیویاں کرنیکا رواج اسوقت قائم تھا اور لامح کا دو بیویاں رکھنا توریت سے ثابت ہے لیکن اسقف اعظم کو صرف ایک بیوی رکھنے کی اجازت تھی۔ بعد کو بادشاہوں کیلئے بھی یہی حکم نافذ کیا گیا بلکہ سونے اور چاندی کی چیزیں بھی ممنوع الاستعمال قرار دی گئیں لیکن بادشاہوں نے نہ اُسکی پروا کی نہ اِسکی۔ چنانچہ داؤدؑ کا متعدد بیویاں رکھنا اور سلیمانؑ کا تین سو کنیزیں رکھنا توریت سے ثابت ہے۔ قریب رشتہ کی عورتوں سے تعلق زناشوئی قائم کرنا بھی توریت سے ظاہر ہوتا ہے اور ابراہیمؑ کا اپنی سوتیلی بہن سارہ سے

نکاح کرنا اس میں مذکور ہے لوائرٹ (Levirate) قوم کا قانون ایک مرد کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی بیوہ سے شادی کرے۔ ابراہیمؑ کے ایک بچہ ان کی بیوی کی خادمہ سے بھی ہوا اور یعقوبؑ نے دو بہنوں سے شادی کی اور ان کی دو کنیزوں سے بھی ان کی اولاد ہوئی۔

عبرانی قانون میں بیوی شوہر کی ملکیت ہوتی تھی اور وہ شوہر کی خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہ کر سکتی تھی۔ طلاق کا رواج تھا لیکن صرف مرد کی طرف سے باپ کے اختیارات اولاد پر غیر محدود ہوتے تھے یہاں تک کہ وہ انکو ہلاک بھی کر سکتا تھا (لیکن عمل ہلاکت زیادہ تر لڑکیوں ہی تک محدود رہتا تھا) وہ لڑکیوں کو فروخت بھی کر سکتا تھا اور ان پر شوہروں کو وہی حق حاصل ہوتا جو کسی جائداد پر حاصل ہوتا ہے۔ عام معاشرت میں عورت کی عصمت و عفت کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی کیونکہ شادی شدہ عورت و مرد کے ناجائز تعلق پر تو قتل تک کی سزا تھی لیکن دوشیزہ ہونے کی حالت میں عورت سے کوئی باز پرس نہ ہوتی تھی —

لوطؑ کا جو قصہ توریت میں درج ہے اس سے پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی عصمت کا خیال اسوقت اسقدر ضعیف تھا کہ مہمانوں کے سامنے انھیں پیش کر دیا جاتا تھا — الغرض یہ تھا عورت کا مرتبہ اور اخلاق جنسی کا عہد عتیق کا جس پر یہودیت نے اپنے اخلاق کی بنیاد قائم کی۔

انجیل اور اخلاق جنسی مسیح نے جو تعلیم اخلاق جنسی کی پیش کی وہ اور

زیادہ عجیب و غریب تھی کیونکہ احتیاط کی وہ حد جو انھوں نے بیان کی کسی طرح
قابل عمل نہ تھی۔ آپ نے فرمایا کہ "اگر کوئی شخص کسی کی عورت کو بری نگاہ سے دیکھتا ہے
تو گویا وہ اسکے ساتھ ارتکاب معصیت کا مجرم ہوتا ہے"۔ اسی طرح طلاق کے
متعلق ان کا یہ ارشاد تھا کہ "جو شخص بغیر الزام عصمت فروشی کے کسی عورت کو
طلاق دیتا ہے وہ گویا اسے فحش پر مجبور کرتا ہے اور جو کوئی دوبارہ مطلقہ عورت سے
شادی کرتا ہے وہ بھی حرامکاری کا مجرم ہوتا ہے"۔ ظاہر ہے کہ عملی دنیا میں
یہ دونوں باتیں ناممکن العمل ہیں۔ نہ اُسقدر احتیاط ممکن ہے اور نہ اسقدر
ضبط کسی عورت کو دیکھ کر برا خیال دل میں لانا اگر واقعی اسی قسم کی فحاشی ہے
جسمیں ایک شخص کی گردن جدا ہو جانا چاہیے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کسی وقت
زمانہ میں مرد کے وجود کو باقی نہ رہنا چاہیے تھا اور اگر طلاق کے لیے صرف
عورت کی عصمت فروشی ہی جائز سبب ہوسکتا ہے تو معاشرت کے اطمینان کی پھر
کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ مرد و زن کی باہمی جدائی کے اور بھی سیکڑوں سبب
ہوسکتے ہیں جن کا لحاظ حسب تعلیم مسیح ہونا نہ چاہیے۔ پھر یہ تعلیم اسی جگہ ختم نہیں
ہو جاتی بلکہ تعلق جنسی کی مخالفت میں اس حد تک غلو سے کام لیا جاتا ہے کہ
"خدائی سلطنت" کا دعویدار صرف مخنثوں ہیجڑوں اور نامردوں ہی کو قرار دیا
جاتا ہے۔ اسکے بعد پال نے جو درس پیش کیا اس سے بھی عورت کی غیر اہمیت
ثابت ہوتی ہے کیونکہ شوہروں کی اطاعت اُن پر فرض قرار دی گئی اور کلیسہ میں

خاموش رہنے کا انکو حکم دیا گیا، کیونکہ شوہر عورتوں کے جسم کا نجات دہندہ ہے جسطرح مسیح روح کے نجات دہندہ تھے۔ پیٹر کی تعلیم بھی اس باب میں کچھ زیادہ بلند نہ تھی۔ کیونکہ اس نے بدرجہ مجبوری شادی کو پسند کیا ورنہ وہ رہبانیت مطلق کا قائل تھا۔

ابتدائی عیسویت میں عورت ناپاک سمجھی جاتی تھی اور دنیا میں تباہی لانے کا باعث اسی کو قرار دیا جاتا تھا۔ ٹرٹولین (Tertullian) عورت کو دوزخ کا دروازہ بتاتا ہے اور ہیرونمس (Heironymus) شادی کو بری عادت قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اوریجنیس (Origenus) نکاح کو معصیت بتاتا ہے اور ٹامس اکوناس (Thomas Aquinas) اخیر تیرھویں صدی میں عورت کو ایک مضرت رساں پیداوار سے تعبیر کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس تعلیم میں انسانیت کا اعلیٰ معیار مردوں کیلئے تجرد بنایا ہو اور جو عورت کو "دوزخ کا دروازہ" "مضرت رساں پیداوار" اور نجس و ناپاک وجود بیان کرکے مردوں کے سر منڈھنا چاہتا ہو اور جو طلاق کا سدباب کرنیوالا ہو وہ کیا معیشت و معاشرت کی ترقی کا باعث ہو سکتی ہے اور اسے دنیا کیونکر قبول کر سکتی تھی۔

موجودہ اخلاق جنسی

اپٹن سنکلیر (Upton Sinclair) نے اپنی مشہور کتاب "صحیفۂ حیات" (The Book of Life) میں اس مسئلہ پہ بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس عیسوی تعلیم کا

عملی نقطۂ نظر سے کیا حشر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"ادارہ نکاح اس میں شک نہیں کہ نہایت بلند تعلیم پر مبنی ہے لیکن صحیح معنی میں نہ کبھی اس پر عمل ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل بھی یہی دیکھا گیا اور اب تو عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اب جو چیز نکاح کی جگہ رائج ہے اسے ہم شادی و فحاشی دونوں کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں۔"

اس وقت کی جنسی و شہوانی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ:۔

"آج کل کی عورت اور تعلیم یافتہ مردوں کی جماعت نکاح سے قبل جس طرح زندگی بسر کرتی ہے وہ مسیحی تعلیم کے لحاظ سے خواہ کچھ ہو لیکن سوسائٹی کے نزدیک وہ "تفریحات اندرون خانہ" سے زیادہ اہم نہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس سے قبل فحاشی و عصمت فروشی کا تعلق زیادہ تر عورت سے تھا لیکن اب اسی حد تک دونوں سے ہے چنانچہ آپ مغرب کے ہوٹلوں میں دیکھیں گے کہ شام ہوئی اور عورتوں کے دھاوے مردوں پر شروع ہوئے۔ گویا کہ یہ ایک جدید دور ہے جس میں اخلاق جنسی کے لحاظ سے "مردانہ عصمت فروشی" کتنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

اس وقت دولت کا ایک بڑا مصرف صرف اخلاق کی بے جا آزادی اور عورت کی عصمت کی ارزانی کو صفر کی حد تک کھینچ لاتا ہے۔ مغرب کی مسیحی جماعت کا کافی حصہ اپنے اوقات کا اس خیال میں صرف کرتی ہے کہ مسیح کی تعلیم رہبانیت کا انتقام کن کن جدید صورتوں سے لیا جائے۔ چنانچہ نیویارک کے ایک ڈاکٹر کا

بیان ہے کہ اُس نے پندرہ سال میں ۹۰۰ - ایسی لڑکیوں کو دیکھا جن کی انتہائی کمسنی کی حالت میں عصمت دری کی گئی، یہاں تک کہ ان میں سی بعض ۹ ماہ کی تھیں! غرباء کی جو حالت ہو وہ اس سی زیادہ خراب ہی اور نا قابل بیان۔

اسمیں شک نہیں کہ بعض لوگ ایسے بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اس پر غور کر کے اصلاح کرنی چاہی لیکن کامیاب نہ ہوئے اور کامیابی کسی طرح ممکن نہیں کیونکہ ان تمام خرابیوں کی ذمہ داری اولاً تو اس ابتدائی تعلیم پر عائد ہوتی ہی جس نے عورت کے درجہ کو پست کر کے غلامی کی حیثیت سے مرد کے سامنے پیش کیا اور دوسری اس اصول پر کہ ایک وقت میں ایک ہی شادی کرنا چاہیے۔

مسیحی تعلیم کہتی ہی کہ اگر مرد و عورت میں سی کسی کو شریک زندگی نہ مل سکے تو اسے چاہیئے کہ خدا پر بھروسہ کر کے خاموش بیٹھ جائے کیونکہ وہی انسانی ضرورتوں کا پورا کرنے والا ہے۔ یقیناً تعلیم اچھی ہے لیکن ایک حاجتمند کو صرف خدا کے بھروسہ کی تعلیم دینا اور عملاً اسکی مشکلات کو دور نہ کرنا کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک حبشی نے کہا تھا کہ یہ کیا بات ہے جب میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ بار الہا ایک دوڑتی مرغی میرے پاس بھیجدے تو یہ دعا کبھی قبول نہیں ہوتی اور جب یہ دعا کرتا ہوں کہ مجھی کو اس کے پیچھے دوڑا دے تو فوراً قبول ہو جاتی ہے۔

مذہب اُصول مذہب انحراف کا سب سے بڑا سبب اس قسم کی قنوطی

تعلیم بھی ہوا کرتی ہی، کیونکہ ایک خاص حد تک تو انسان صبر و ضبط سے کام لیکر قانع رہ سکتا ہے لیکن اسکے بعد وہ اپنی خواہشات سے مجبور ہو کر کھل کھیلتا ہے اور تعلیم ہی کو لغو سمجھنے لگتا ہے۔

مستقبل کا اخلاق جنسی

ارباب نظر سے مخفی نہیں کہ دنیا کی آزادی کے ساتھ ساتھ اخلاق جنسی میں بھی بڑی آزادی پیدا ہو گئی ہی اور عورت کی ذہنی و علمی ترقی نے اُسکے اخلاق کا مفہوم بھی بڑی حد تک، بدل دیا ہے۔

تقریباً ایک صدی قبل عورت کی مجبوری کی داستان یہ تھی کہ نہ اُسکو تعلیم دیجاتی تھی نہ سیاسی حقوق اس کو حاصل تھے، نہ وہ تجارت کر سکتی تھی نہ کوئی فن سیکھ سکتی تھی اور نہ قانون کی نگاہ میں وہ مردوں کے برابر خیال کی جاتی تھی ــــ لیکن اب حالات بالکل بدل گئے ہیں وہ مردوں کے دوش بدوش علوم و فنون حاصل کرتی ہے۔ ہر قسم کے پیشہ و تجارت میں برابر کا حصہ لیتی ہے ملازمتیں کرتی ہے۔ رائے دینے کا مساوی حق رکھتی ہے، الغرض وہ سب کچھ کرتی ہے جو ایک مرد کر سکتا ہی۔ اسلیے اگر اُسکا اخلاقی معیار بدل جائے تو حیرت نہ کرنا چاہئیے۔ وہ دور جب مرد اُس پر حکومت کرتا تھا اور اُسکی حیثیت ایک کنیز سے زیادہ نہ تھی گزر گیا ہی، وہ اب خود مرد پر حکمراں نظر آتی ہی اور آزادی کے ساتھ جو جی میں آئے کر بیٹھتی ہی۔ اسکے یہاں نہ کوئی اخلاقی قانون ہے نہ معاشری

پابندی۔ اس کی حالت اس طائر کی سی ہے جو عرصہ تک قفس میں مقید رہنے کے بعد دفعتاً آزاد کر دیا جائے اور شوقِ پرواز اسے کسی ایک جگہ چین سے نہ بیٹھنے دے وہ اگر کسی مرد سے شادی کرتی ہے تو اس خیال سے نہیں کہ تمدن و معاشرت کا نظام اس کا مقتضی ہے بلکہ صرف اس ارادے سے کہ اس طرح وہ اپنی آزادی کیلئے زیادہ وسیع بہانے پیدا کر سکے گی نہ اُسے اولاد کی ضرورت ہے نہ شوہر کی نہ اُسے کسی سرپرست کی حاجت ہے نہ ہیرہ دینا لازم کی۔ وہ ایک سیلاب ہے جو بند کو توڑ کر چاروں طرف پھیل گیا ہے اور جسکا روکنا اب کسی طرح ممکن نہیں اسلئے سوال یہ ہے کہ جب ابتدائے آزادی میں یہ حالت ہے تو آئندہ کیا ہوگا اور عورت کی خودسری مستقبل میں کس معاشرت کو اختیار کریگی۔ اسکا بہترین جواب یورپ کے مشہور انشاپرداز ایچ جی ویلز (H. G. Wells) نے اپنے ناول "انسان خدا کا مماثل" (Men Like Gods) میں دیا ہے کہ کرۂ ارض کا ایک شخص کسی دوسرے کرہ میں پہنچ گیا جو بقدر تین ہزار سال زیادہ ترقی یافتہ تھا اور یہاں اس کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہاں نہ کسی کے جسم پر کپڑے کا تار ہے اور نہ غیرت و حیا کا کوئی مفہوم نہ وہاں شادی کا جھگڑا ہے نہ کسی اور پابندی کا یعنی انسان بظاہر دیکھنے میں تو انسان، لیکن ہے حقیقتاً حیوان سے بدتر۔

عورت کی اس آزادی کا جو اقتصادی اثر دنیا پر پڑتا ہے وہ بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں کیونکہ بفرضِ محال اگر عورت نے کسی نہ کسی طرح بچہ جن دیا تو

اسکی پرورش کون کریگا نہ اس لحاظ سے کہ ابویت کی تعیین دشوار ہوگی بلکہ اس
بنا پر کہ عورت کو اتنی فرصت کہاں اور ہنگامۂ عالم میں اسکی شرکت تربیت اولاد
کی اجازت کیونکر دے سکتی ہے۔ اسلئے دنیا میں "اشتراکیت" کا پھیلنا یقینی ہے
کیونکہ آئندہ نسلوں کی بقا و حفاظت صرف اسی طرح ممکن ہے کہ بالشویک
روس کے موجودہ نظام کی مانند بچوں کی پرورش وغیرہ کلیتہً حکومت اپنے
ہاتھ میں لیلے۔ لیکن اگر یہ نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا۔ سنکلیر (Sinclair) نے
عرصہ ہوا یہ تحریک ملک کے سامنے پیش کی تھی کہ جنسی جرائم کرنے والوں کو آختہ
کردیا جائے اور اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر رسل (Russel) مزاحیہ
انداز میں لکھتا ہے کہ :-

"مستقبل میں حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ والدین
میں سے جس کو چاہے آختہ کردے"

رسل کا یہ خیال ہے کہ آئندہ زمانہ میں اخلاقی معیار بالکل بدل جائیگا
اور ایک ہی شخص مختلف عورتوں سے خاندان کے خاندان بناتا چلا جائے گا۔
لیکن اس کا اختیار ہر شخص کو حاصل نہ ہوگا بلکہ خاص خاص لوگوں کو ہوگا اور
اسلئے آئندہ دنیا کی نصف آبادی کے باپ صرف وزراء اور پادری ہوں گے۔
ہالڈین (Haldane) مشہور ماہر علم الحیات لکھتا ہے کہ :-

"سنہ ۱۹۵۰ء تک ایسا طریقہ دریافت ہو جائے گا کہ عورت کے رحم سے جنین

نکال کر اس کو کیمیاوی محلول میں ڈال کر نشوونما پانے کا موقعہ دیا جائے اس کے بعد وہ زمانہ آئے گا جب عورت کا رحم اس کے جسم سے علیحدہ کر کے بیس سال تک زندہ رکھا جا سکے گا جس سے ہر ماہ بیضۃ الجنین (Ou [illegible]) پیدا ہوتا رہے گا اور ۹۰ فی صدی کی نسبت سے یہ مادہ تشکیل جنین کا کام دے سکے گا اور ۹ ماہ کے بعد اس سے صحیح و سالم بچہ پیدا ہوا کرے گا ۔ پھر جب اس طرح محبت جنسی اور تولید دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہو جائیں گی تو انسانی معاشرت ونفسیات میں تغیر عظیم واقع ہوگا اور دنیا بالکل نئے اصول پر کاربند ہوگی ۔"

ممکن ہے کہ ہالڈین نے جو کچھ لکھا ہے اس میں مزاح کا پہلو شامل ہو، لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مغرب کی عورت کس حد تک آزاد ہو چکی ہے اور دنیا کس خطرہ میں مبتلا ہے۔